

طالبان اور افغانستان کے تناظر میں لکھے گئے کالم

نفسِ خیال

www.KitaboSunnat.com

عرفان صدیقی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ
معدت البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com



www.KitaboSunnat.com

نقش خیال

طالبان اور افغان نشان کے تناظر میں لکھے گئے کالم

ملنے کے تپے

- مکتبہ رحمانیہ اقراسنٹر اردو بازار لاہور
 کوٹلی ڈیپارٹمنٹ سٹور کالج روڈ پورے والا
 مکتبہ رحمانیہ اردو بازار سیالکوٹ
 مکتبہ رحمانیہ نیو جرنل چکوال
 ویکم بک پورٹ اردو بازار کراچی
 یونیورسٹی بک ایجنسی خیر بازار پشاور
 بک سنٹر علامہ اقبال چوک سیالکوٹ
 منیر برادر زمین بازار جہلم
 احمد بک کارپوریشن اقبال روڈ راولپنڈی
 اسلامی کتب خانہ فضل الہی مارکیٹ اردو بازار لاہور
 چوہدری بک ڈپو مین بازار دینہ
 اسلامک بک سنٹر اردو بازار کراچی
 ضیاء القرآن پبلشرز صحیح بخش روڈ لاہور
 فرید پبلشرز نوز و مقدس مسجد اردو بازار کراچی
 کتاب گھر علامہ اقبال روڈ راولپنڈی
 نیو الیاس کتب محل کچھری بازار جزانوالہ
 اوریس کتب محل مین بازار منڈی سمویال
 عمر بک سنٹر جی ٹی روڈ سرانے عالمگیر 653057
 نیو نیٹس بک ڈپو مین بازار میانوالی
- سعد علی کیشنر فرسٹ فلور میاں مارکیٹ اردو بازار لاہور
 کشمیر بک ڈپو نلہ سنگ روڈ چکوال
 مسلم بک لینڈ چکوال روڈ مظفر آباد
 ضیاء القرآن پبلشرز اردو بازار کراچی
 نیو ہاڑی کتب گھر میں بازار دہاڑی
 رحمن بک ہاؤس اردو بازار کراچی
 الکریم نیو ایجنسی گول چوک اوکاڑہ
 شاکہ لائبریری محلہ چوہدری پارک ٹوبہ ٹیک سنگھ
 بلال کاپی ہاؤس لیاقت روڈ میاں چنوں 662650
 مکتبہ العلم ۱- اردو بازار لاہور
 میاں ندیم مین بازار جہلم
 دارالادب ستمبر روڈ میاں چنوں
 اشرف بک ایجنسی کینٹی چوک راولپنڈی
 شمع بک ایجنسی فیصل آباد
 ہاشمی برادرز کتب و رسائل گورنمنٹ روڈ کوئٹہ
 رضا لائبریری شاہ کوٹ
 الاخوان القادری مسندی کلاندرہ اون بوہڑ گیٹ ملتان

www.KitaboSunnat.com

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ خریدنے علم و ادب مصنف سے باقاعدہ تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کسی قسم کی کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے۔

نفسِ خیال

طالبان اور افغان نشان کے تناظر میں لکھے گئے کالم

عرفان صدیقی

www.KitaboSunnat.com

خزینہ علم و ادب
الکریم مارکیٹ اردو بازار - لاہور ۷۷۴۵۷۶

8502
ع ۱۴ - ن

حیدرآباد اور
مطبوعات کتب کا
والد مرکز

تذکرہ و اہتمام
نذیر محمد طاہر نذیر



www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

۲۰۰۳ء
عبید اللہ
محمد نذیر طاہر نذیر
الاشراق کمپوزنگ سنٹر لاہور
حافظ جمیل پرنٹنگ پریس لاہور
250/- روپے

اشاعت سوم
سرورق
اہتمام
کمپوزنگ
مطبوع
قیمت

والدہ ماجدہ کے نام
جن کی دعائیں

میری راہنما اور پناہ گاہ ہیں

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

فہرست

www.KitaboSunnat.com

77	یہ بے خبر لوگ	11	پیش لفظ
80	پہلا مرحلہ	15	محبتیں اور نفرتیں
83	اپنی اپنی "القاعدہ"	18	وہشت گردی؟
86	ڈالروں کا مرہم؟	21	آگے کا سفر
89	ابا بلیس کہاں ہیں؟	24	نیورلڈ آرڈر
93	اقتاد کی داد طلبی	27	ایک غریب و سادہ سی قبر
96	رومانویت اور طالبان (1)	30	اور اب شمالی اتحاد
99	رومانویت اور طالبان (2)	33	قصہ جیسی جیکسن کا
102	امریکہ کا نظریہ ضرورت	36	زندہ یا مردہ
105	روح محمد ﷺ	39	بس ایک سوال
108	دوستی کا تازہ سفر	43	گناہ کبیرہ
111	کہوٹہ کا کھرا	46	بجگہ دلش کا فیصلہ
114	جو ابد ہی!	49	وسوسے اور ڈا ہے
117	جناب معین حیدر سے التماس	52	مجھے معاف کر دینا
120	ہم بھی کیا لوگ ہیں؟	56	دوستوں کی آمد آمد
123	حاجی بلور اور "مولوی"	59	جاتی آنکھوں کے خواب
126	اندوہ وفا	62	"انصاف" افغانستان کی دہلیز پر
129	اسلامی بھائی	65	طالبان کی تنصیبات
132	سلامی	68	راکھ کا ڈھیر
135	خوف کا آسیب	71	نازک مزاج امریکہ
138	تمنا میں اور التجا نہیں	74	لٹے لوگوں کا ماتم

214	سردیوں کی طویل رات	141	اسرائیل کی وکالت
217	فسطائیت کے سفیر	144	تماشا ختم ہوگا
220	عید مبارک	147	میں کون ہوں؟
222	وجود کی بقا (1)	150	انقلاب نو--1
225	وجود کی بقا (2)	153	انقلاب نو--2
228	یہ کس کے ہنر کا شکار ہے؟	156	مولا عمر کا 'آسیب'
231	خواب مرتے نہیں	159	مفسس کی قبا
234	ایک قرارداد کی آمد	162	عروج
237	مال غنیمت	165	"عالمی لوئی جرگہ"
240	پہلا قدم	168	طالبان--مسئلہ کیا ہے؟ (1)
243	دباؤ اور قوت مدافعت	171	طالبان--مسئلہ کیا ہے؟ (2)
246	جرم ضعیفی	174	طالبان--مسئلہ کیا ہے؟ (3)
249	پاکستانیت	177	طالبان--مسئلہ کیا ہے؟ (4)
252	دوستی کا ہاتھ	180	پٹاری کھل رہی ہے
255	تماشا بینوں کی بھیڑ	183	تھینک یو پرو فیسر چومسکی
258	پام ہار بر اور مٹا چینا	186	خون بہا
261	امتحان کی گھڑی	190	کمزوری اور شہ زوری
263	خود اذیتی	193	کشمیر کا ز
266	ایک سوال	196	نیا سورج
269	جہاد اکبر (1)	199	آئین نو
272	جہاد اکبر (2)	202	مصلحت کیشی کا درس
275	اک ذرا صبر	205	شمالی اتحاد برائے یون
278	اصلاحات	208	نئے تماشا گر
281	قدھار کا نوآباد قبرستان	211	وہ مرد جری!

347	شاہی کوٹ کے پہاڑ	284	جبر و اختیار (1)
	انسانی حقوق، جمہوریت، قانون	287	جبر و اختیار (2)
350	کی حکمرانی	290	ہم کہاں کھڑے ہیں؟
353	برگ آوارہ	293	”نیویارک زندہ باد“
356	ضیاء شاہد کا سوال	296	دینی مدارس کی ضابطہ بندی
359	دقیانوسی سوچ کی ایک لہر	299	بھارت کا کرخت لہجہ
362	تعاون کی پیشکش	302	بحالی اعتماد کی تلقین
365	نوسے اور مین	305	آخر کب تک
368	کر بلا تا کر بلا	308	تصویر کاروشن رخ (1)
371	کابل کا میٹر	311	تصویر کاروشن رخ (2)
	سنہری بالوں، گلابی گالوں اور شہابی	314	تصویر کاروشن رخ (3)
374	آنکھوں کے نام	317	ایک پرچون بل
377	شہادت کا انتظار	320	پیسلس نمبر 8 کا نیا کمین
380	جنگلیوں اور سسکیوں کا دلیر	323	امریکہ اور بھارت
383	لاوارٹ لاشیں	326	ناموس رسالت ﷺ
386	اصل کام	329	محفوظ دنیا
389	امریکہ کی یاد دہانی	332	دل بہلاوے
392	حافظ میوہ جان وزیر شہید	335	ایرانیوں کا انداز تقاضا
395	قدہار کے قیدی کے نام	338	خود فریبی ہی سہی
399	ادھر بھی کوئی رحمت کا چھینٹا	341	ڈی این اے
		344	تہہ خانہ کی حکومت

www.KitaboSunnat.com

پیش لفظ

www.KitaboSunnat.com

میں عجیب الجھن میں ہوں کہ کیا لکھوں؟ اپنے بارے میں، کتاب کے بارے میں، کالم نگاری کے بارے میں یا ان کرداروں کے بارے میں جو میرے کالموں میں رچ بس گئے ہیں؟ مجھے ابتدا ہی میں یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں کالم نگاری کے فنی تقاضوں سے نابلد ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ صحافت کی اس توانا اور مقبول صنف کی نزاکتیں کیا ہیں؟ کالم کن اجزائے ترکیبی سے تربیت پاتا، زبان و بیان کے کن مرحلوں سے گزرتا، تاثر کی کس شدت سے بہرہ مند ہوتا اور پھر کیوں کردل کے درپچوں پر دستک دیتا ہے؟

میں ایک ایسے وقت اس وادی شوق میں آیا جب الاؤ بھڑک چکا تھا۔

دنیا کی واحد سپر پاور کی طرف سے بھرپور عسکری قوت کے ساتھ ایک بے سرو ساماں قبیلے پر حملہ جس کے پاس دولت ایمان و یقین کے سوا کچھ نہ تھا، اس صدی کا ایسا سانحہ ہے جو ناگاساکی اور ہیروشیما کی طرح بہت دیر تک یاد رکھا جائے گا۔ یہ بھری ہوئی رعونت اور اندھی مادیت کی یلغار تھی جس کا نشانہ افغانستان کے سادہ و معصوم لوگوں کو بنایا گیا۔ یہ کلیتاً ظالم اور مظلوم کی صدیوں پرانی جنگ تھی جس میں پاکستان کو ایک نامطلوب کردار ادا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ فیصلے کی نازک نگہری میں ملک سیاسی و جمہوری قیادت سے محروم تھا اور حکومت کسی توانا رد عمل کے لئے عوامی قوت بروئے کار نہ لاسکی۔ ایک طبقے نے امریکہ کی منہ زوری کی آڑ میں اُن نظریات، اصولوں اور

اقدار کو بھی تخیلِ مشق بنا لیا جو ازل سے انسانیت کا حسن رہے ہیں اور جن کی نفی انسان کو حیوانیت اور درندگی کی اڑل سٹح پر لے آئی ہے۔ ”دانش“ کی اس یلغار نے زمینی حقائق کی بنیاد پر ایک ایسے منفعل انداز حیات کی تبلیغ شروع کر دی جو اسلام کے نظام فکر کے لئے بالکل اجنبی تھا۔

یہ ہماری قومی تاریخ کا نازک دور تھا۔ بنگالی طور پر کسی ایسے فورم، پلیٹ فارم یا ادارے کی ضرورت تھی جو طوفان کے سامنے کھڑا ہو کر بھرپور نظریاتی قوت کے ساتھ سپر پاور کے اخلاقی بانجھ پن اور اہل جنون کے جذبہ بے اختیار شوق کے درمیان پہاڑی معرکے میں ارفع اصولوں اور لافانی جذبوں کی ترجمانی کرے۔ سرکاری میڈیا حکومتی فیصلے کی آرائش و زیبائش میں مصروف تھا۔ سیاسی جماعتیں منقسم اور کنفیوژن کا شکار تھیں۔ دینی جماعتیں کوچہ و بازار میں ہلچل مچانے تک محدود رہیں۔ ایسے میں فکری محاذ پر ایک منظم اور ہمہ گیر نظریاتی جہاد اور پاکستانیت کی ترجمانی کا اعزاز ’نوائے وقت‘ کے حصے میں آیا۔ جناب مجید نظامی نے اپنے عظیم بھائی اور اپنے نظریاتی اخبار کی درخشاں روایات کی پاسداری کرتے ہوئے پورے ہائیکین کے ساتھ وقت کی عدالت میں شہادت حق کا فریضہ سرانجام دیا۔

یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھے اس نظریاتی معرکے میں ”نوائے وقت“ کا مورچہ اور جناب مجید نظامی جیسے سپہ سالار کی قیادت میں، ایک سپاہی کے طور پر اپنا ہنر آزمانے کا موقع ملا۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ اگر میں اس قافلہ سخت جاں کا حصہ نہ ہوتا تو شاید یہ کالم کبھی نہ لکھ پاتا۔ ایک غیر متزلزل یقین اور اپنے نظریے پر لازوال ایمان کے ساتھ میں نے قلم اٹھایا اور افغانستان کے کوساروں، گھائیوں اور وادیوں کی طرف نکل گیا۔ میں خون میں لت پت مہموں اور زخموں سے چور شاموں کے دلہوز منظر دیکھتا اور دکھاتا رہا۔ میں نے کبھی ان اہل جنوں کے ہائیکین کے قصیدے لکھے جو امن عہد زیاں کار میں قرون اولیٰ کی داستانیں رقم کر رہے تھے۔ کبھی شہابی آنکھوں اور گلڈابی گالوں کے نوحے لکھے۔ کبھی روح و احساس سے عاری ٹیکنالوجی کے کمالات کا معکھ اڑایا۔ کبھی وقت کی فرعون مزاج سپر پاور کا پوسٹ مارٹم کیا۔ کبھی بھتے ہوئے حوصلوں اور غروب ہوتے ولولوں کو زندہ رکھنے کے جتن کئے۔۔۔ اور جب افغانستان کے دھبے بے اماں میں بھٹکتے بھٹکتے تھک گیا تو، تو راہور کی کسی سیاہ رنگ چٹان پر بیٹھ کر اتار دیا، اتار دیا کہ مہری پتھکیاں بندھ گئی۔ ابتدائے سفر میں، میں اپنے آپ کو تنہا خیال کرتا تھا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں

ایک بہت بڑے جھوم میں گھرا بیٹھا ہوں۔ وہ میرے ساتھ نعرے لگاتا، میرے ساتھ فرعونوں کی رعوت پر خاک ڈالتا، میری آواز میں آواز ملا کر رجز لگاتا، میرے ساتھ مل کر شام فریباں کا اہتمام کرتا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر آہ و زاری کرتا ہے۔ یہ قبیلہ آج بھی میرے ساتھ ساتھ، میرے ہر کالم کے ایک ایک حرف میں شریک ہے۔

○

اس مجموعے میں صرف وہ کالم شامل کئے جا رہے ہیں جو طالبان، افغانستان اور امریکی یلغار کے تناظر میں لکھے گئے۔ داخلی موضوعات پر لکھے گئے کالموں کا مجموعہ انشاء اللہ تمبر تک طبع ہو جائے گا۔

اظہار تشکر کے لئے سب سے نمایاں نام برادر محترم مجید نظامی کا ہے جن کی راہنمائی اور شفقت کے بغیر یہ سفر ممکن ہی نہ تھا۔ کالموں کا ریکارڈ رکھنے کے حوالے سے میں اپنی بیگم، اپنے چھوٹے بھائی انعام صدیقی اور عزیز بی یا سر آفاق کا شکر گزار ہوں جن کی اجتماعی کاوش کے بغیر بہت مشکل پیش آتی۔

اور ان کا شکر یہ تو میں ادا کر ہی نہیں سکتا جنہوں نے مجھے اپنی دعاؤں سے نوازا، میری حوصلہ افزائی کی اور اس سفر شوق میں ہر آن میرے ساتھ رہے۔ مجھے آئندہ بھی ان کی دعاؤں اور اللہ کی عطاؤں کی حاجت رہے گی۔

www.KitaboSunnat.com

سیدنا محمد ﷺ

www.KitaboSunnat.com

محببتیں اور نفرتیں

www.KitaboSunnat.com

ان دلائل میں بہر حال وزن ہے کہ امریکہ کا ساتھ نہ دے کر ہم منہ زور عتاب کا نشانہ بن جائیں گے، ہماری ہچکیاں لیتی معیشت دم توڑ بیٹھے گی، ہماری ایٹمی قوت خطرے سے دو چار ہو جائے گی، ہم دہشت گردی کے خلاف عالمی تحریک سے کٹ جائیں گے اور کشمیر قصہ پارینہ بن جائے گا۔ بلاشبہ یہ حقائق وقت کی لوح پر علی حروف میں لکھے دکھائی دے رہے ہیں۔ سوال صرف پاکستان کے تحفظ و سلامتی یا عوام کی ترقی و خوشحالی کا ہوتا تو فیصلہ کرنے میں دشواری نہ تھی۔ کون سا پاکستانی ہے جو قومی مفادات کو معرض خطر میں ڈالنے کا آرزو مند یا اجتماعی غربت و پسماندگی کا تمنا کی ہے۔ اس سلسلے میں حکمرانوں اور عوام میں اختلاف نہیں لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پوری قوم اور حکومت کی آرزو یہی ہے تو پھر فکر و احساس کے دھارے مختلف کیوں ہیں اور تفریق کی لکیریں گہری کیوں ہوتی جا رہی ہیں؟

معاہدہ یہ ہے کہ تقسیمے کا بنیادی فریق امریکہ ہے جو ہمارے ہی دست و پاؤں کے طفیل آج دنیا کی واحد سپر پاور بن چکا ہے اور اس سپر پاور کے بارے میں ہمارے کچھ تحفظات ہیں۔ قوموں کی سوچ کسی وقتی ابال سے بدلی جاسکتی ہے نہ کوئی فوری واقعہ جذبیوں کا رخ موڑ سکتا ہے۔ عوام کی سوچ برسوں کے تدریجی عمل کے بعد تشکیل پاتی اور جذبے سال ہا سال کی آٹھ کے بعد پختہ ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شعوری کوشش کے باوجود پاکستان کے عوام اپنے قلب و ذہن میں امریکہ کے لئے کوئی نرم گوشہ پیدا نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ہماری زمین امریکی دوستی کے لئے بھڑکے یا ہماری آب و ہوا اس کی نشوونما کے لئے ناسازگار تھی۔ اس کی ذمہ دار خود امریکہ کی ادائیں ہیں جو بارہا پاکستان کے اعتماد کو مجروح کرنے اور عوام کے دلوں میں کدورتوں کے بیج بونے کا سبب بنی ہیں۔ ہم نے فوجی اور سیاسی حکومتوں کی تفریق کے بغیر ہمیشہ امریکہ کی قد و پائند اطاعت گزار رہی کی لیکن امریکہ کی طرف سے کبھی ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا نہیں آیا۔ جب بھی ہماری قومی سلامتی کو خطرہ

لاحق ہوا اور ہم نے تعاون کی امید کے ساتھ پلٹ کر امریکہ کی طرف دیکھا ہمیں شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں اس نے غیر جانبداری کی چادر تان لی اور 1971ء میں اس وقت تک اس کا ساتواں بحری بیڑا، بحر ہند کی لہروں سے اٹھکلیاں کرتا رہا جب تک ڈھاکہ سرنگوں نہیں ہو گیا۔ ہم نے ایک عشرے تک افغان جہاد کو اپنے لہو سے سینچا اور دوسری پہرہ پہنایا۔ سوویت یونین کو تاریخ کی شرمناک ہزیمت سے دوچار کر کے نہ صرف امریکہ کی پیشانی پر لگے دیت نام کی ٹکست کے داغ کو دھو ڈالا بلکہ اسے دنیا کی واحد سپر پاور کا تاج بھی پہنا دیا۔ لیکن ابھی آخری روسی سپاہی ”دریائے آمو“ کے اس پار نہیں اترا تھا کہ امریکی ترجیحات بدل گئیں۔ ہماری کارکردگی پر ”انعام و ہمتائش“ کا سلسلہ جنیوا معاہدے سے شروع ہو کر اوجزی کیمپ کے آتش کدے اور بہاولپور میں صدر ضیاء الحق کے طیارے کی راکھ سے ہوتا ہوا 1990ء میں تختہ اقتصادی پابندیوں پر ختم ہوا۔ ختم کہاں ہوا؟ امریکہ نے بھارت کو اپنی نئی ترجیحات میں نیا مرتبہ مقام دینے کے بعد ہمیں اس کی چودھراہٹ کا حلقہ بگوش بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

صدر کلنٹن کے پانچ روزہ ڈورہ بھارت کے بعد، پانچ گھنٹے کے دورہ اسلام آباد کی سوغات، ان ترجیحات کا ایک عکس ہے جو امریکہ کے نئے ورلڈ آرڈر کا حصہ ہیں۔ امریکی پالیسی سازوں نے ہمیشہ حکمرانوں سے راہ دور سم بڑھائی اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا لیکن کبھی قوموں کے ساتھ بے لاگ دوستی کی کوشش نہیں کی۔ ایک سپر پاور ہونے کے ناتے اسے پانچ نظر، حکیمانہ، مدبرانہ اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں پر استوار پالیسی تشکیل دینی چاہئے تھی لیکن اس نے فلسفہ و حکمت کے سارے اصولوں اور اخلاق و کردار کے تمام تضابطوں کو اپنے اہداف کی بھینٹ چڑھا دیا۔ فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا اور متعدد دوسرے علاقوں میں بیٹے والا خون مسلم اس کے لئے پانی سے بھی زیادہ ارزاقاں رہا۔ انسانی حقوق کے لئے اس نے من پسند پیمانے ایجاد کر لئے۔ قوموں کی مساوات اور انصاف کی فرامزدائی کے لئے قائم ہونے والی اقوام متحدہ اس کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی بن گئی۔ اس سارے کھیل کے دوران پاکستان کے مسائل میں مدد دینا یا کشمیر کے دیرینہ مسئلے کو حل کرانے کے لئے منصفانہ کردار ادا کرنا کبھی امریکہ کی ترجیح نہیں رہی۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے ملنے والے قرضے بھی امریکی شرانگہ کی آمیزش سے خالی نہ تھے جو

عملہ ہماری معیشت کو گھن کی طرح چاٹتے اور ہماری صلاحیتوں کے پرکانتے رہے۔

امریکہ کو جب بھی کوئی فرد مطلوب ہوا ہم نے ملکی قانون کو نظر انداز کرتے ہوئے، اس کی گردن دبوچ کر امریکی کمانڈوز کے حوالے کر دیا۔ ایمل کانسی، ایوب آفریدی، انور خٹک، مشتاق حسین اور نہ جانے کون کون؟ یہ سب پاکستانی باشندے ہیں جن کی جیبوں میں سبز رنگ کے پاکستانی پاسپورٹ تھے۔ یوسف رمزی اور صادق ہویدا عرب باشندے تھے لیکن وہ ہماری سرزمین پر تھے، ہم نے امریکہ کی خواہش پر انہیں بھی امریکی چنگل میں دے دیا۔ ہم نے تو حیرال میں اترنے والے روسی ہیلی کاپٹر تک امریکہ کو دے دیئے کہ اس کے ماتھے پر خشکی کی کوئی شکن نہ ابھرے۔ شاید ہماری اسی "خود پسردگی" کے سبب آج اسامہ ڈیور کرنے کا کارخیز بھی ہمیں سونپنا جا رہا ہے۔ ادھر جب ہم نے اربوں روپے کی کرپشن میں ملوث "قارتیوں" کو امریکہ سے طلب کیا تو جواب ملا "شوہد لاؤ۔ ہم اپنے قانون کے تحت یہاں مقدمہ چلائیں گے۔"

یہ ہیں امریکی چہرے کے عمومی خدو خال جن کے باعث نہ صرف پاکستانیوں بلکہ عالم اسلام اور تیسری دنیا کے عوام کی بھاری اکثریت کے دلوں میں امریکہ کے لئے محبت اور ہمدردی کا کوئی جذبہ انگڑائی نہیں لیتا۔ اس پر قیامت ٹوٹی ہے تو بے گناہ انسانوں کی ہلاکت پر دکھ کے ساتھ ساتھ دلوں کے کسی نہ کسی گوشے سے اس پر آسودگی کی ایک لہر بھی ضرور پھوٹی ہے۔ یہی وہ پہلو ہے جو روز روشن کی طرح دکھائی دینے والے حقائق کے باوجود اور پاکستان کی سالمیت و بقا کو اولین ترجیح تسلیم کرنے کے باوصف پاکستانی قوم کو یکسو نہیں ہونے دیتا اور اس کی بے گلی بڑھتی جا رہی ہے۔ اعلیٰ ترین قومی مقاصد کے حصول کے لئے جب وہ اپنے آپ کو امریکہ کے پہلو میں کھڑا دیکھتی ہے تو اس کے قدم ڈگرگانے لگتے ہیں۔

مجھتیں اور نفرتیں برسوں میں تشکیل پاتی ہیں اور بے پناہ خوف کا آسیب بھی آسانی سے ان کے نقش نہیں مٹا سکتا۔

www.KitaboSunnat.com

[22-9-2001]

دہشت گردی؟

”دہشت گردی کے خلاف ہماری جنگ کا آغاز ”القاعدہ“ سے ہوتا ہے لیکن یہ وہاں پر ختم نہیں ہو جائے گی۔ یہ اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک دنیا کا ہر دہشت گرد روپ تلاش نہیں کر لیا جاتا، اسے غیر موثر نہیں کر دیا جاتا اور اسے شکست سے دوچار نہیں کر دیا جاتا۔ یہ لوگ بیسویں صدی کے خونخوار نظریوں کے وارث ہیں۔ ہمارے رد عمل میں فوری انتقام اور منفرد حملوں سے کہیں زیادہ دوسری کارروائیاں شامل ہیں۔ یہ ایک طویل مہم ہے جو پہلے کسی نے نہیں دیکھی۔ اس میں ٹی وی پر دکھائی دینے والے ڈرامائی حملے بھی شامل ہیں اور ایسے خفیہ آپریشن بھی جن کی کامیابی کو صیغہ راز میں رکھا جائے گا۔ دنیا کے ہر گوشے میں موجود ہر ملک کو ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔ یا وہ ہمارا ساتھی ہے یا پھر دہشت گردوں کا..... طالبان دہشت گردوں کو ہمارے حوالے کر دیں یا پھر انہی کے مقدر سے ہمکنار ہونے کے لئے تیار ہو جائیں۔“

صدر بش کی اشتعال سے بھری اور استدلال سے عاری تقریر اکیسویں صدی کی اس تاریخ کا دیباچہ ہے جو امریکہ اپنی لاصحد و عسکری اور اقتصادی قوت کے بل بوتے پر رقم کرنا چاہتا ہے۔ رعوت کے زہر میں بجھا ایک ایک جملہ اور غصے کی آگ سے دکھتا ایک ایک لفظ ایسی اندھی اور بے مہار سپر پاور کے ارادوں کی ترجمانی کر رہا ہے جو اپنے حکم کا سکہ پوری دنیا میں رائج کرنے کے لئے بے تاب ہے اور دنیا ایک بے بس پرندے کی طرح اپنی چونچ اپنے پروں میں لئے انہونی کا انتظار کر رہی ہے۔ روئے زمین کے سب سے بڑے اسلحہ خانے کی مالک قوت دنیا کی سب سے غریب اور پسماندہ قوم کو کچلنے جا رہی ہے۔ کوئی طیارہ، کوئی بحری بیڑا، کوئی عسکری دستہ اسے روکنے والا نہیں۔ افغانستان کی اڑھائی کروڑ آبادی کا بڑا حصہ پناہ کی تلاش میں سرحدوں کی طرف بھاگ رہا ہے جہاں کے پہریدار چوکس اور بھانگ بند ہیں۔ چار سال سے جاری خشک سالی ہزاروں انسانوں کو لنگ چکی ہے اور امریکہ کی گود میں بیٹھی اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ ”ورلڈ فوڈ پروگرام“ کے

خاتے کے بعد کم و بیش چالیس لاکھ افغانی غربت اور بھوک کا لقمہ بن جائیں گے۔ موسم سرما کا ہراول دستہ بے گھر اور بے لباس افغانوں کی بستیوں کی طرف بڑھ رہا ہے اور امریکہ ان پر میزائلوں اور بموں کی بارش برسانے کے لئے پر تول رہا ہے۔ بے یقینی کی صلیب پر لٹکے افغان عوام آسمان کی طرف دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

رعونت انتہا کو پہنچ جائے تو خون آشام طاقتیں الفاظ کے معنی و مفہوم بھی بدل ڈالتی ہیں۔ امریکہ نے جس چیز کو ”دہشت گردی“ کا بھیا تک نام دے رکھا ہے اس کی اصل کچھ اور ہے۔ وہ خود جس آزادی، جمہوریت اور انسانیت کا علمبردار ہے، اس کے نقوش ساری دنیا کے درود پوار پر ثبت ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ تاریخ کے ان مکروہ حوالوں سے گریز کیا جائے لیکن جارج بش کے ”کروسیڈ“ کا اصل چہرہ دیکھنے اور دکھانے کے لئے ماضی میں جھانکنا ضروری ہے۔ اس تجزیے سے شاید اس سوال کا جواب بھی مل جائے جو صدر بش نے اپنی تقریر میں اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ ”امریکی عوام پوچھتے ہیں کہ انہیں (دہشت گردوں کو؟) ہم سے نفرت کیوں ہے؟“

جمہوریت، آزادی اور انسانی اقدار کے خلاف اکیسویں صدی کی پہلی عالمی جنگ شروع کرنے والے امریکہ کو شاید ماضی کے یہ حوالے اچھے نہ لگیں لیکن دنیا ان حوالوں کے آئینے میں ایک عظیم سپر پاور کا چہرہ ضرور دیکھ سکے گی۔ حافظے کی کمزوری کے باوجود دنیا نہیں بھولی کہ انڈونیشیا کے صدر سوئیکارنو سے نجات حاصل کرنے کے لئے کس نے کم و بیش پانچ لاکھ انڈونیشی قتل کروا ڈالے؟ عراق میں دودھ اور خوراک سے بلکتے بچوں کے پیچھے کس کی قابری کام کر رہی ہے؟ کون ہے جو محض تفریح طبع یا ہوا بازوں کی تربیت کے لئے ہریختے عراق کی بستیوں پر چاند ماری کرتا ہے؟ کس نے لبنان کی گلیوں کو خون میں نہلا دیا؟ کس نے صدر قذافی کی اقامت گاہ کو بمباری کا نشانہ بنا کر اس کی معصوم بچی کی جان لے لی؟ کون ہے جس نے اپنے پروردہ شاہ ایران کے تحفظ کے لئے ایران میں لاکھوں انسانوں کی گردنیں کٹوا ڈالیں؟ ایران کے مسافر بردار طیارے کو کس نے چھلنی کر کے مار گرایا؟ کبوزیا اور لاؤس کی دیواروں پر کس کے کارنامے رقم ہیں؟ صومالیہ اور سنگاٹک میں کیا ہوتا رہا؟ کس نے الجزائر میں عوام کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ کر اپنے چہیتوں کو تخت پر بٹھایا اور تین لاکھ انسانوں کی جانیں لیں؟ کس کی آشر باد سے اسرائیل نے صابرہ اور شتیلا کے کیسپوں میں رقص ابلیسی کا مظاہرہ کیا؟ کون ہے جس کی تھپکیاں اسرائیل کو کسن فلسطینی

بچوں کے سینے چھلنی کرنے کا حوصلہ دے رہی ہیں؟ کس نے سوڈان میں ادویات بنانے والی فیکٹریاں تک نہ بنیں ہو سکیں؟ سڑکوں، نہریں، اقلیتوں اور لوہے کا خون کی گزند پر ہے؟ کس نے ہیروشیما اور ناگاساکی کی انسانیت سوز تاریخ رقم کی؟ کون ہے جس کی چشم پوشی نے کشمیر کو آتش کدہ بنا رکھا ہے؟

ان میں سے کوئی واردات بھی ”دہشت گردی“ کے زمرے میں نہیں آتی کیونکہ ان کے پیچھے خود امریکہ کا فرما ہے اور امریکہ کی لغت میں ”دہشت گردی“ کا مفہوم کچھ اور ہے۔ یہ وہ جرائم ہیں جو دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ان کے علاوہ امریکی ایجنسیاں کہاں کہاں، کس کس نوع کے کھیل کھیلتی رہیں یا اب کھیل رہی ہیں، ان کا کسی کو علم نہیں۔ گزشتہ روز جارج بش نے خود کہا کہ ”گزشتہ 136 سالوں میں ایک کے سوا امریکہ نے تمام جنگیں دوسروں کی سر زمین پر لڑی ہیں۔“ اور اب وہ ایک اور جنگ لڑنے جا رہا ہے۔ ”دہشت گردی“ کے خلاف جنگ جو برسوں جاری رہے گی۔ اس کے عوام کو یہ معلوم نہیں ہو پارہا کہ دنیا امریکہ سے نفرت کیوں کرتی ہے۔ جارج بش کا اصرار ہے کہ ہم کسی ٹھوس شہادت کے بغیر اس کی ہر بات کو سچ مان لیں۔ وہ خود ہی مدعی، خود ہی وکیل، خود ہی منصف اور خود ہی جلا داکا کردار ادا کرنا چاہتا ہے اور پھر یہ بھی چاہتا ہے کہ ہم اپنے کندھے اس کی بندوقوں کے لئے پیش کرتے وقت آنکھیں کھول کر یہ بھی نہ دیکھیں کہ نشانہ کون ہے؟

یہ بھی نہ پوچھیں کہ ”دہشت گرد“ کسے کہتے ہیں؟

اور یہ سوال بھی نہ کریں کہ بیسویں صدی کے خونخوار نظریات کا وارث کون ہے؟“

[23-9-2001]

آگے کا سفر

امریکہ کے ماضی پر نظر رکھنا، اس کے حال کی چال ڈھال کا باریک بینی سے جائزہ لینا اور اس کے مستقبل کے عزائم کا ادراک رکھنا، اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہم زخم خوردہ ہیں اور ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے۔

معاہدے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ حکومت ایک فیصلہ کر چکی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ یہ فیصلہ قوم اور ملک کے وسیع تر مفاد کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ اس فیصلے کے حق میں ایسے دلائل دیئے گئے ہیں جنہیں آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان کو ہم جس حال تک پہنچا چکے ہیں وہاں ہم میں یہ سکت ہی نہیں رہی کہ کوئی توانا فیصلہ کر سکیں۔ قومی وقار، عزت نفس، آزادی و خود مختاری اور حیثیت، سازگار اور شاداب زمانوں کی اصطلاحات ہیں۔ جب ماضی اور حال کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہم اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لئے بھی غیروں کے محتاج ہوں، ہماری سانس کی ذوری آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی خوشنودی سے بندھی ہو۔ عالمی ساہوکاروں کے ایجنٹ مسلسل ہمارے یہی کھاتوں کا جائزہ لے رہے ہوں۔ ہمارے زرمبادلہ کے ذخائر دو چار ہفتوں کے لئے بھی ناکافی ہوں اور ہم ایک تن آسان گروہ کی طرح "قرض کی بے" کے نشے میں سرشار رہنے کے عادی ہوں چکے ہوں تو انتخاب کے لئے بہت سے راستے باقی نہیں رہتے۔ ہمارے پاس تو "دل یا شکم" میں سے بھی صرف "شکم" ہی کے انتخاب کی گنجائش باقی تھی۔ سو ہم نے یہ راستہ چن لیا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس راستے نے ہمیں چن لیا ہے۔

یہ بات ایک مرتبہ پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ امریکہ نے واحد سپر پاور کا منصب جلیلہ سنبھالنے کے بعد سے جوئی ڈکٹری لکھنے کا کام شروع کیا ہے، اس میں الفاظ کے مروجہ اور روایتی معنی کھل طور پر بدل دیئے گئے ہیں۔ یورپ، اسلامی دنیا اور ترقی پذیر ممالک کی ہماری تعداد امریکہ سے پرچاش رکھنے کے باوجود پر انداز ہو چکی ہے۔ چین کبھی پرانی آگ میں نہیں کودتا۔ وہ اپنی صلاحیتوں اور

تو اتانوں کو بچا بچا کر رکھ رہا ہے۔ وہ دھیمے مزاج کی ایسی خارجہ پالیسی پر کاربند ہے جس میں جارحانہ پین کی بجائے وقار، حکمت اور دوراندیشی کی صفات نمایاں ہیں۔

اسی پس منظر میں 11 ستمبر کے بعد سے پاکستان ایک ایسی صورت حال سے دوچار ہو گیا ہے جس میں الجھنیں ہی الجھنیں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کی سالمیت اور قومی مفادات کو ہر شے سے زیادہ عزیز رکھا جانا چاہئے۔ اس میں کوئی اختلاف ہو ہی نہیں سکتا، نہ ہے۔ یہ بھی بجا ہے کہ جب بھری دنیا میں کوئی بھی امریکہ کی کلائی مروڑنے بلکہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جسارت نہیں کر رہا تو ہم کس طرح اس پھرے ہوئے طوفان کے سامنے بند باندھ سکتے ہیں؟ افغانستان کے حوالے سے ہم بہر حال ”فرنٹ لائن سٹیٹ“ ہیں اور اپنے آپ کو جغرافیہ کی اس قید سے آزاد کرنے پر قادر نہیں۔ پندرہ سو گلو میٹر سے طویل ڈیورنڈ لائن بہر طور کچھ مسائل اور تقاضے رکھتی ہے جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ بھی ملک کے طول و عرض میں مسائل کا ایک گھنا جنگل اگا ہوا ہے اور قوم کوئی بڑا معرکہ لڑنے کے لئے تیار نہیں۔ مہنگائی، بے روزگاری، بے یقینی، روز افزوں غربت، عدم استحکام اور سیاسی انتشار نے ایمان و یقین کے قلعوں میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ ان حالات میں کوئی بھی ہم جوئی واقعی قوم کو پتھر کے زمانے میں دھکیل سکتی ہے۔

سو فیصلہ ہو چکا اور اب اس بحث سے آگے نکل جانا چاہئے کہ ایسا کیوں ہوا؟ اب حکومت اور قوم کی توجہ اس فیصلے کے متوقع اثرات اور منفی تقاضوں پر رہنی چاہئے۔ اگر ہم اب بھی حکمت و دانش، تدبیر و بصیرت اور کسی قدر ہمت و جرات سے کام لیں تو معاملات کو سمجھایا جاسکتا ہے اور نہ صرف پاکستان خود اس آگ سے اپنا دامن بچا سکتا ہے بلکہ تباہی کے دہانے پر کھڑے افغانستان کو بھی ایک بڑے المیے سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

امریکہ کی طرف سے دہشت گردی کے خاتمے کی جنگ میں اس کا اتحادی ہونے کے باوجود ہمیں اس کا وکیل بننے یا اس کے تیار کردہ خاکے میں اس کے پسند کا رنگ بھرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اس کی سفاکی پر انسان دوستی کا خلاف چڑھانے اور اس کے چہرے کی ”پلاسٹک سرجری“ کرنے کی بھی کوئی مجبوری نہیں۔ ہمیں اس کے احکامات کی بے چون و چرا تعمیل کے بجائے اسے زیادہ مہذب، مہنی برانصیاف اور خاص طور پر اہل اسلام کے لئے قابل قبول رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کوئی کچھ بھی کہتا رہے، حالیہ واقعات تہذیبوں

کی کھٹکھٹ بننے جا رہے ہیں۔ ایک ہفتے کے اندر مسلمانوں اور ان کی عبادت گاہوں پر تین سو سے زائد حملے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ”مسلمان اور اسلام“ ہدف بن چکے ہیں۔

مغربی ذرائع ابلاغ جب بھی دہشت گردی اور ”بنیاد پرستی“ کی تصویر کشی کرتے ہیں، پس منظر میں قرآن کریم کی تلاوت چل رہی ہوتی ہے اور سجدہ ریز مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیں امریکہ کو سمجھانا چاہئے کہ وہ اپنے جذبہ انتقام کو یہ رخ نہ دے۔ ہمیں جنگ کو مسلسل ٹالتے ہوئے یہ کوشش بھی کرنی چاہئے کہ طالبان اور امریکہ کے درمیان مذاکرات کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ دونوں کے درمیان جاری آتشیں بیانات کی گرمی کم کی جائے۔ پاکستان میں آج بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو طالبان پر بے پناہ اثر و رسوخ رکھتے ہیں، انہیں متحرک کیا جائے۔ گزشتہ روز ہی اسلام آباد میں ایک قومی سیمینار کے دوران ”نیشنل کرائسوس کونسل“ کے قیام کی عمدہ تجویز سامنے آئی ہے۔ حکومت کو جلاتا خیر یہ کونسل قائم کر کے تمام مکاتب فکر کے علماء، سیاسی عمائدین اور اہل دانش کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دینا چاہئے اور آنے والے ہر اقدام کے بارے میں ان کی رائے کو وزن دینا چاہئے۔ آگے کے سفر کو ہموار رکھنا اب ہماری پہلی ترجیح ہونی چاہئے۔ قومی تاریخ کا نہایت ہی اہم فیصلہ کرنے سے قبل غالباً اس کے حجم، وسعت اور گہرائی کا پورا اندازہ نہیں کیا جاسکا لیکن اس پر عملدرآمد اور متوقع خطرات سے بچنے کے لئے قومی مفاہمت ضروری ہے۔ پاکستان کے تمام موثر طبقوں کی شرکت سے حکومت اب بھی طوفان کو ٹالنے یا اس کے تباہ کن اثرات کم سے کم کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

میں یہ سطور لکھ رہا تھا کہ معروف سیاستدان اور سابق وفاقی وزیر جناب نسیم آہیر کا فون آ گیا۔ آہیر صاحب سے میری براہ راست ملاقات نہیں۔ کہنے لگے ”نوائے وقت میں تمہارا آج کا کالم پڑھ کر آنسو کتنے میں نہیں آ رہے۔ ہم کدھر جا رہے ہیں اور کیا ہونے والا ہے؟“

نسیم آہیر کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ دہلی دہلی سسکیاں لے رہے تھے۔ میں ان کے آنسو نہیں دیکھ پایا۔ میرے پاس تو کوئی حرف تسلی بھی نہ تھا۔ یہ بھی نہ بتا سکا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں اور کیا ہونے والا ہے؟ میں تو خود اپنے بے شمار اہل وطن کی طرح کسی ”دیوار گریہ“ کی تلاش میں ہوں۔

[29-09-2001]

نیورلڈ آرڈر

دس سال قبل سوویت یونین کی شکست وریخت اور خلیج کی جنگ میں مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے کے بعد صدر جارج بش (سینئر) نے نئے ورلڈ آرڈر کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو ”انصاف، امن اور عافیت“ کی نوید سنائی تھی۔ تب امریکہ کا سب سے بڑا عسکری اور نظریاتی حریف شکست سے دوچار ہو چکا تھا۔ کمونزم کی سرخ آندھی، افغانستان کے سنگناخ پہاڑوں سے نکلا کر دم توڑ چکی تھی۔ طویل عرصے سے سرد جنگ کی بھٹی میں سلگتی دنیا ایک نئی صبح کا خواب آنکھوں میں لئے نئی منزلوں اور نئے راستوں کا خاکہ بن رہی تھی۔ امریکہ کا نیورلڈ آرڈر اس وقت پوری طرح ایک آف نڈر سکا اور آج جارج ڈبلیو بش (جونیئر) اپنے والد کے منصب پر جلوہ گر ہیں اور ان خوبیوں کی تعبیر کے لئے بے چین ہیں جو ابھی تک ان کے بوڑھے والد کی سمجھتی ہوئی آنکھوں میں لودے رہے ہیں۔

دو دن قبل آدھی رات گزرنے کے صرف ایک منٹ بعد صدر امریکہ نے ایک فرمان جاری کیا جس کے تحت دنیا کی 27 مختلف تنظیموں، شخصیات اور اداروں کے اٹانے منجمد کر دیئے گئے ہیں۔ صدر نے رعوت سے لرزتی ہوئی آواز میں حکم دیا کہ ”ساری دنیا ان کے اس فرمان پر عمل کرے اور یورپی یونین سمیت جن ملکوں کے قوانین اس بات کی اجازت نہیں دیتے، وہ اپنے قانون و دستور کو امریکی منشاء کے مطابق ڈھال لیں۔ اگر کسی ملک یا چینک یا ادارے نے خلاف ورزی کی تو اسے بھی دہشت گردوں کا ساٹھی سمجھا جائے گا۔“

امریکی حکومت کی طرف سے جاری کی گئی فہرست کے مطابق جن گیارہ تنظیموں کے اٹانے منجمد کئے گئے ہیں ان میں افغانستان کی القاعدہ، فلپائن کا ابوسیف گروپ، الجزائر کا آرڈر اسلامک گروپ، کشمیر کی حرکت الجہادین، مصر کا الجہاد گروپ، ازبکستان کی اسلامک موومنٹ، لبنان کی اثبات الانصار، تائیپیریا کا ایک گروپ، لیبیا کا اسلامک فائٹنگ گروپ، صومالیہ کی اتحاد

الاسلامیہ اور یمن کی اسلامک آرمی آف عدن شامل ہیں۔ جن 12 افراد کے اتانے محمد کئے گئے ہیں وہ سب کے کسب مسلمان ہیں اور جن چار اداروں پر پابندی عائد کی گئی ہے ان میں پاکستان میں قائم الرشید ٹرسٹ کے علاوہ سب کے سب اسلامی شخص رکھتے ہیں اور اس کے باوجود امریکہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس کا نشانہ صرف ”وہشت گردی“ ہے جس کا حدود اربعہ اسلامی ممالک، اسلامی شخصیات اور اسلامی اداروں تک محدود ہے۔

”نیورلڈ آرڈر“ کا اولین تقاضا یہ ہے کہ امریکہ ہر اس قوت کا دم ختم نکال دے جو کسی بھی وقت اس کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ ہر منکبر اور خدا فراموش قوم کی طرح امریکہ تو اتنا نظریات اور ان نظریات سے عشق کرنے والے اہل جنوں سے خوفزدہ ہے جو اپنے عقائد و تصورات پر قائم رہنے، سر بلند ہو کر چلنے، خدائی کی وعید اور ہر قوت سے نکرانے اور ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اڑھائی لاکھ مربع میل پر پھیلے افغانستان میں یہ سخت جاں حلقو ابھی تک زندہ ہے۔ امریکہ سب سے پہلے کر ”ارض کو اس“ ”اچھی مخلوق“ سے پاک کر کے یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ اس کی قوت و شہمت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے والے کسی شخص کو زندہ رہنے کا حق نہیں۔ بیس سال سے جنگ، بد امنی اور خانہ جنگی کے طمانچے کھانے والے اس ملک میں تو کوئی ایسا نارگٹ بھی نہیں بچا جس پر امریکی جانناز نشانہ بازی کر سکیں۔ نشانہ تو اسامہ بھی نہیں، محض ایک بہانہ ہے۔ نشانہ وہ ”خود سری“ ہے جو افغانوں کو امریکہ کی دلہیز پر سجدہ ریختے ہوئے سے روکتی اور عزت کی موت مرجانے کا حوصلہ دیتی ہے۔

امریکی اخبار ”واشنگٹن پوسٹ“ نے اطلاع دی ہے کہ امریکہ میں ”القاعدہ“ کے چار پانچ گروپ کام کر رہے ہیں۔ حالیہ وہشت گردی کے بعد ہونے والی تحقیقات میں کوئی گروپ ملوث نہیں پایا گیا۔ سبید 19 ہائی جیکروں میں سے کسی ایک کا تعلق بھی ان گروپوں کے ساتھ ثابت نہیں ہو سکا۔ کوئی ایک کڑی بھی اسامہ یا طالبان کے ساتھ سلسلہ نہیں جوڑ سکی۔ کولن پاؤل ثبوت پیش کرنے کا اعلان کرنے کے بعد نیلے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں۔ لیکن امریکہ بھند ہے کہ وہ اسامہ اور طالبان کو صفر ہستی سے نابود کر دے گا۔ افغانوں کے لئے یہ کون سی نئی بات ہے۔ دو عشروں سے دوران چند رو لاکھ روسیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ لاکھوں خانہ جنگی کی آگ کا ایندھن بن گئے۔ پچاس لاکھ بھوک سے نڈھال موت کی وادی میں داخل ہوا چاہتے ہیں۔ لاکھوں پاکستان

اور ایران کی سرحد پر پڑے پڑے ہر آزار سے آزاد ہو جائیں گے اور بچے کھچے، امر کی قہر و غضب کا نشانہ بن جائیں گے لیکن کیا اس سے ”نیو ورلڈ آرڈر“ کا بیٹ بھرا جائے گا؟

امریکہ کو جتنی بھی رعایت دی جائے یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑے گی کہ اسامہ بن لادن، افغانستان اور مسلم شخصیات یا تنظیموں کی گردنیں دوپٹے سے شروع ہونے والا عمل بہت آگے، بہت دور تک جائے گا۔ صدر ریش کے منہ سے نکلنے والا ”کروسید“ کا لفظ محض زبان کی لغزش نہیں۔ سعودی عرب میں پانچ خلیجی ممالک کے اجلاس، اسلامی کانفرنس اور عرب لیگ نے دبے دبے لفظوں میں جو کچھ کہا اسے واضح طور پر کہنے اور بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔ ”نیو ورلڈ آرڈر“ کا عنقریب بہت کچھ نکلنے کے لئے بے تاب ہے۔ آج اقتصادی پابندیاں بھی اٹھ سکتی ہیں، انعام و اکرام کی بارش بھی ہو سکتی ہے لیکن کل جب اس کی قیمت سود مرکب کے ساتھ ادا کرنا پڑے گی تو شاید ”پتھر کا زمانہ“ زیادہ دور نہ دکھائی دے۔ کولن پاؤل دہشت گردی کے شکار خطوں میں کشمیر کو شامل کر چکے ہیں اور آدھی رات سے ایک منٹ بعد جاری ہونے والی فہرست میں پاکستان اور کشمیر کے نام دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ نیو ورلڈ آرڈر کے اگلے پڑاؤ ہیں۔ امریکہ نے اب واقعی ”انصاف، امن اور عافیت“ کی فرمانروائی کا عہد کر لیا ہے۔ وہ طے کر چکا ہے کہ آنے والے تمام موسم اس کی پیشانی سے پھوٹیں گے اور مستقبل کا ہر منظر اس کی آنکھوں سے طلوع ہوگا۔ ہمیں اسامہ اور طالبان کی نعشوں سے تھوڑا آگے بھی دیکھ لینا چاہئے۔

[26-09-2001]

ایک غریب و سادہ سی قبر

کئی دنوں سے نہ جانے کیوں، ہرات کے قریب کوہ مزدراخان کے دامن میں بنی ایک غریب سادہ سی قبر مجھے مسلسل یاد آ رہی ہے۔

1991ء میں برادر ام اعجاز الحق کے ہمراہ مجھے پہلی مرتبہ کابل جانے کا موقع ملا۔ تب سوویت یونین کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور شورئی کے فیصلے کے مطابق مجددی صدارت کے منصب پر فائز تھے۔ چار سال بعد قندھار سے طالبان کا سورج طلوع ہوا تو ساری دنیا میں ان پر اسرار بندوں کے بارے میں تجسس نے انگڑائی لی۔ اسی تجسس نے مجھے مولانا سمیع الحق کی قیادت میں قندھار جانے والے قافلہ شوق کی ہمرکابی پر ابھارا۔ چمن سے پاک افغان سرحد عبور کرتے ہوئے ہمیں بیوہ کی لاش کی طرح اجڑی سڑک قندھار تک لے گئی۔ چمن سے قندھار تک تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہمیں شکستہ کونٹریوں اور نوٹے پھونے گھروں کے کھنڈر دکھائی دیئے۔ معلوم ہوا کہ یہ مختلف آوارہ مزاج گروہوں کی بنائی ہوئی چپک پوٹھیں تھیں جہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کو خراج دینا پڑتا تھا۔ طالبان نے پہلی یلغار انہی پر کی اور عصمت ملیشیا جیسے سفاک دھڑوں کو عبرت کا نشان بنا دیا۔ گاڑیاں قندھار میں داخل ہوئیں تو دن ڈھل چکا تھا اور دیواروں کے سائے لمبے ہو رہے تھے لیکن دیواریں تھیں کہاں؟ ادھر ادھر سینہ چاک ڈھانچے کھڑے تھے جن کی چھتیں اڑ چکی تھیں، بھاری ستون گولہ باری کی مسلسل ضربوں سے چور تھے۔ کھڑکیوں، دروازوں اور درپچوں کے پٹ گھروں کا ایندھن بن چکے تھے اور بڑے بڑے بے ذہب سوراخ، بے خواب آنکھوں کی طرح خلاؤں کو گھور رہے تھے۔ افغانوں کی سخت جاں زندگی کو چہرہ بازار میں زندہ و بیدار تھی۔ اس میں آسودہ اور مطمئن بستیاں والی رعنائی کا نام و نشان تک نہ تھا لیکن ہر حال میں جینے کا فن سکھانے والی توانائی ضرور تھی۔

گزشتہ ہفتے طالبان کی قیادت سے رابلے کے لئے قندھار جانے والے پاکستانی وفد کی پہلی متصل ملاقات قندھار کے گورنر حاجی ملاحسن رحمانی سے ہوئی۔ اخبارات میں ملارحمانی کا نام پڑھ

کہ اس مردِ دلہن کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ ایک ناگک جہاد کی نذر کرنے اور مصنوعی ناگک کے سہارے چلنے والے ملاحسن رحمانی سے میری ملاقات قندھار کے ایک جنگ زدہ ریٹ ہاؤس میں ہوئی تھی۔ اگلے دن ہمارے میزبان ہمیں احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ دکھانے لے گئے۔ واپس آتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے فٹ پاتھ کی بھینٹ میں ملا رحمانی جیسا کوئی شخص لاٹھی نیکتا لنگڑا تا چلا جا رہا ہو۔ میں نے افغان ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور پوچھا "یہ گورنر رحمانی تو نہیں؟" وہ بے نیازی سے بولا "جی ہاں وہی ہیں" اور گاڑی چلا دی۔ میں نے مزید کرید تو کہنے لگا "گورنر کے پاس ایک ہی گاڑی ہے جس میں آپ لوگ سوار ہیں، اس لئے وہ پیدل جا رہے ہیں۔" میں طالبان کے امیر المومنین ملا عمر سے ملا۔ ان سے گفتگو کی۔ ان کے دست راست مولانا محمد حسن سے ملا۔ ملا رحمانی سے گفتگوں ہاتھیں کیں۔ ملا عمر کے شعلہ بیان ساتھی احسان اللہ احسان سے ملا۔ اس وقت کے افغان وزیر خارجہ ملا نوح سے پہروں باتیں کیں۔ دو دن بعد ہرات پہنچے تو گورنر ملا یار محمد خان سے طویل گفتگو ہوئی۔ وہاں ہمیں شہر کے سب سے خوبصورت مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا جو "باغ آزادی" کے پتھوں بچ بنا ہے اور جس کے چاروں طرف انار کے خوبصورت درخت ہیں۔

لیکن کوہ مزدخان کی گود میں بنی قبر بھولنے میں نہیں آ رہی۔

ہرات، قندھار کی نسبت کہیں بھر پرا تھا۔ زیادہ باروتی، زیادہ آباد، زیادہ ہجوم۔ اگلے دن میں نے ہرات ترکمانستان شاہراہ کے پہلو میں آسودہ خاک خواجہ عبداللہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی۔ حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ عنہ سے قرہی نسبت رکھنے والے خواجہ انصاری کے اجداد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں کسی جنگی مہم کے ساتھ یہاں آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مزار سے تھوڑا ہٹ کر سلطان حسین کے جواں مرگ بننے کی قبر ہے جس کا سنگ تعویذ فن سنگ تراشی کا نادر شاہ پارہ ہے۔

روایت ہے کہ اس کی تراش خراش اور کندہ کاری میں استاد شمس الدین جیسے ماہر فن کو سات سال لگ گئے۔ قریب ہی میں نے افغانستان کی تاریخ کے ایک جری کردار امیر دوست محمد خان کے مزار پر حاضری دی۔ 1842ء میں اسی دوست محمد خان کے بیٹے اکبر خان کے ہاتھوں ساڑھے سولہ ہزار برطانوی سپاہ، افغانستان کی پہاڑیوں اور گھائیوں میں جا کر مومنی کی طرح کٹ گئی تھی۔ کئی

دن بعد برائینڈن نامی ایک انگریز سپاہی زخموں سے چور جلال آباد پہنچا اور ساڑھے سولہ ہزار سپاہ کے انجام بد کی خبر دی۔ یہ برطانوی فوج کا زندہ بچ جانے والا واحد سپاہی تھا جو کچھ ہی دیر بعد دم توڑ گیا۔ میں معروف عالم، سربراہ آدرہ مفسر اور عظیم فلسفی امام فخر الدین رازی کے مزار پر گیا۔ میں اس میدان میں گیا جہاں 1979ء میں روسی بمباری کا نشانہ بننے والے چھپیس ہزار شہداء کی قبریں ہیں..... لیکن کوہ مزداخان کے دامن میں بنی ایک قبر کی دنوں سے میرے حواس پر چھائی ہوئی ہے۔

یہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار سے کوئی پندرہ منٹ کی مسافت پر مولانا نور الدین عہد الرحمن جامی کی قبر ہے جو میرے ذہن کی لوح پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ خراسان سے آنے والے برگزیدہ صوفی اور نامور شاعر، علوم اسلام اور تاریخ و ادب کے میدان کے شاہسوار تھے لیکن ان کی اصل شہرت عشق رسول ﷺ کے سرمدی جذبوں سے مہکتی شاعری کی وجہ سے ہے۔ جب میں جامی کی قبر کے سربانے کھڑا ہوا تو پڑھ رہا تھا تو اگست کی چمکلی دھوپ بکھری ہوئی تھی اور دور دور تک دیرانی کا عالم تھا لیکن خاموشیوں کے بطن سے قوس قزح کے رنگوں جیسی ایک مشکبوگونج نضا کو معطر کئے دے رہے تھی:

از جامی بے چارا رسانید سلامے
بر درگہ دربار رسول مدنی را

سی این این اور بی بی سی کا کہنا ہے کہ طالبان دہشت گرد ہیں۔ صدر بٹل بتا رہے ہیں کہ افغانستان دنیا کے مہلک ترین ہتھیاروں کی چراگاہ بننے والا ہے۔ یہ سرزمین نہ جانے کتنے مقدس اور بیش بہا آثار و مقامات کی امین ہے لیکن نہ جانے کیوں مجھے کوہ مزداخان کے دامن میں سوئے، جامی کی آخری آرام گاہ کا دکھ کھائے جا رہا ہے اور ”ڈالروں کی بارش“ کے باوجود ایک غریب و سادہ سی قبر میرے ذہن کی لوح سے اترنے میں نہیں آ رہی۔

کیا کوئی امریکی بم اس قبر کو بھی پوندز میں کر دے گا؟
کیا اس قبر سے اٹھتی مشکبوگونج بھی کہیں کھو جائے گی؟

[27-09-2001]

اوراب شمالی اتحاد

انصاف، امن اور عافیت کا پرچم لہرانے والی دنیا کے دستور بھی نرالے ہیں۔

طالبان گزشتہ چھ سالوں سے افغانستان کے نوے فی صد علاقے پر قابض ہیں۔ ان کی حکومت، ایک مستحکم حکومت ہے جس کی عمل داری میں کبھی ہنگامہ و فساد کی آگ نہیں بھڑکی۔ ملا محمد عمر کی قیادت کو کبھی کوئی چیلنج درپیش نہیں ہوا۔ بھوک اور افلاس کے باوجود طالبان کے زیر سایہ علاقے میں امن و امان کی صورتحال مثالی ہے اور جرائم کی شرح ”مہذب دنیا“ کے مقابلے میں نہایت ہی کم ہے۔ انہوں نے معاشرے کو اسلحہ سے پاک کرنے کے لئے انتہائی موثر اور کامیاب کوششیں کی ہیں۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آیا، انہوں نے ایک ذمہ دار اور بین الاقوامی قرینوں سے آگاہ قوم ہونے کا ثبوت پیش کیا۔ بھارتی طیارے کے انخواء اور قندھار میں اترنے کے بعد انہوں نے جس حکمت عملی اور دانش کے ساتھ معاملے کو سنبھالا، اسے عمومی طور پر سراہا گیا۔ کینیا اور تنزانیہ کے واقعات کے بعد بھی طالبان نے حصول انصاف کے لئے معقول تجاویز پیش کی تھیں۔ آج بھی ان کے اس موقف میں وزن ہے کہ اگر امریکہ کسی غیر جانبدار عدالتی فورم کے سامنے ٹھوس ثبوت پیش کرنے پر آمادہ ہو تو اسامہ اس عدالتی فورم کے حوالے کر دیا جائے گا لیکن منہ زور آندھیاں ہیں کہ تھمنے میں نہیں آ رہیں اور بے مہارت قوت کا ذمہ ہے کہ معقولیت کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہیں۔

طالبان میں لاکھ کمزوریاں ہوں گی لیکن عالمی برادری کو بھی اپنے رویے پر ایک نظر ضرور ڈال لینی چاہئے۔ افغانستان کے نوے فی صد سے زائد علاقے پر موثر حکومت قائم کرنے کے باوجود انہیں دنیا بھر کے صرف تین مسلم ممالک نے تسلیم کیا جن میں سے دو اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر چکے ہیں۔ اقوام متحدہ کے دوسو کے لگ بھگ ارکان میں سے پاکستان واحد ملک رہ گیا ہے جس نے رسمی طور پر افغانستان سے سفارتی تعلقات منقطع نہیں کئے لیکن عملاً کابل میں پاکستانی سفارت خانہ صرف ”رابطے کی ایک کھلی کھڑکی“ کے طور پر کام کر رہا ہے۔ دوسری طرف شمالی اتحاد،

افغانستان کے دس فیصد سے بھی کم علاقے پر قابض ہے جو سانی اور نسلی طور پر اقلیت کی ترجمانی کرتا ہے لیکن اس کے سفارت خانے دنیا بھر کے ممالک میں کام کر رہے ہیں۔

بدخشاں اور وادی پنج شیر کے زنداں میں بند پروفیسر برہان الدین ربانی "اسلامک سٹیٹ آف افغانستان" کے صدر تسلیم کئے جاتے ہیں اور وہ اسی حیثیت میں دنیا سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ جس افغانستان کو اقوام متحدہ کی سند جو اب بھی عطا کر دی گئی ہے وہ شمالی اتحاد کے زیر قبضہ قطعہ اراضی کا نام ہے۔ آج مہلک ہتھیاروں سے لدے ہوئی اور سمندری جہازوں کی سوغات بھیجنے والوں نے کبھی نہیں سوچا کہ کس اخلاقی اصول، عالمی بنیادوں اور قانون و منطق کی بناء پر طالبان کو افغانستان کا جائز حکمران نہیں مانا جا رہا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ملا عمر، صدر، وزیراعظم، چانسلر، چیف ایگزیکٹو، سلطان یا امیر نہیں "امیر المؤمنین" کہلاتا ہے اور موئین کی اصطلاح سے اسلام کی بو آتی اور "کروسیڈ" کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

طالبان میں بلاشبہ بیسیوں کمزوریاں اور خامیاں ہوں گی لیکن ساری دنیا نے انہیں "نامطلوب اور مردود" قرار دیتے وقت کبھی نہیں سوچا کہ ایسا غیر منصفانہ اور غیر منطقی عمل، شدید رد عمل کو جنم دیتا ہے اور جب عمل اور رد عمل کا یہ سلسلہ طویل ہو جائے تو نفرتوں کا ایسا گھنا جھگڑا اُگ آتا ہے جس میں کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا۔

نیویارک اور واشنگٹن کے واقعات کے بعد اسامہ کی تلاش میں نکلنے والے ہراول دستوں کے لئے چالیس ارب ڈالر مخصوص کئے گئے ہیں۔ اگر اس رقم کا چوتھائی حصہ بھی افغانستان کی تعمیر و ترقی کے لئے وقف کر دیا جاتا، طالبان کے قریب جا کر ان کے دکھ بانٹنے اور ان کے مسائل کی آج محسوس کرتے ہوئے ان سے ہمدردی کی جاتی، انہیں دنیا بھر کے دارالحکومتوں سے دعوت دے آتے، ان سے مکالمہ کیا جاتا تو معاملات کبھی یہ رخ اختیار نہ کرتے۔ لیکن ہوا یہ کہ اولین مقاصد کے حصول کے فوراً بعد طالبان کو منفی پراپیگنڈے کی بمبلی میں جھونک دیا گیا۔ ان کی پیٹھ پر طرح طرح کی پابندیوں کے کوڑے برسائے جانے لگے۔ بس چلتا تو مغرب، افغانستان کے در پیچ تازہ ہوا کے لئے بھی بند کر دیتا۔ سنا ہے اب امریکہ ایسا کرنے جا رہا ہے۔

ادھر شمالی اتحاد کو پورے افغانستان پر مسلط کرنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ اپنے بہترین کمانڈر احمد شاہ مسعود سے محروم ہونے کے بعد سات آٹھ ہزار سپاہیوں پر مشتمل جو سپاہ بے ولی اور

شکست کی کے عالم میں سبھی بیٹھی تھی، اچانک انگزائی لے کر اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے ”جاننا“ مزار شریف کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ بھارتی فوجی دستے، عسکری مشین اور ”را“ کے الیکٹرانک بھارت اور شمالی افغانستان میں بیٹھے اس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ ”دوشینے“ میں ہونے والے حالیہ اجلاس میں روس، بھارت، تاجکستان اور ازبکستان کے نمائندوں نے افغانستان کی مرکزی قوت ختم کرنے اور اسے کئی خود مختار حصوں میں تقسیم کرنے کا جو پلان بنایا ہے اسے امریکی تائید و حمایت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ امریکہ اپنے پیادہ دستے افغانستان کی ”آدم خور“ مرزین کے حوالے کرنے سے کترار رہا ہے۔ وہ شمالی اتحاد کو مشاورت، جدید اسلحہ اور وافر ڈالر کی مدد سے آگے بڑھانا چاہتا ہے تاکہ کابل طالبان کے ہاتھ سے نکل جائے اور روم میں بیٹھے ایک چھ ماہی سالہ بوڑھے کو افغانستان کا تاجدار بنا کر صاف اگلے اہداف کا رخ کرے۔ ایران میں بیٹھا اسماعیل خان ایک بار پھر ہرات کا رخ کرنے کے لئے پر تول رہا ہے اور خود طالبان کے قلعے میں شگاف ڈالنے کی سر توڑ کوششیں شروع ہو چکی ہیں۔

یہ سب کچھ، انصاف، امن اور عافیت کے ارفع اصولوں کی کار فرمائی کے لئے ہو رہا ہے اور پاکستان کے لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ جس جہاد کو ہم نے اپنے لبو سے سینچا تھا اور جس کی کامیابی کے لئے ہم آج تک مختلف مسائل کے انبار تلے دبے ہوئے ہیں، کیا اس کا مقصود یہی تھا کہ جنرل فییم کی سپاہ طورخم کی وہلیز پر آکھڑی ہو اور اس کی رگ جاں رڈ کے پتے میں ہو؟

طالبان کو نابود کر دینے کے بعد امریکہ، روس اور بھارت کے زیر اثر تشکیل پانے والی افغان حکومت، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ہماری حکمت عملی کا پہلا ”شر“ تو نہیں ہوگی؟

[28-09-2001]

قصہ جیسی جیکسن کا

..

امریکی اور مغربی میڈیا کس طرح حقائق کا چہرہ مسخ کرتا اور خبر کو موم کی ناک بنا کر اپنے اپنے مطلب کے نقوش ابھارتا ہے، اس کا اندازہ ”جیسی جیکسن“ کے مبینہ دورہ افغانستان اور اس کے بارے میں عالمی میڈیا سے جاری ہونے والی خبروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ میں اس معاملے کے پس پر وہ پہلوؤں سے پوری طرح آگاہ ہوں اس لئے چاہتا ہوں کہ مغرب کی تراشیدہ غلط اور گمراہ کن اطلاعات تاریخ کا حصہ نہ بننے پائیں۔

جس طرح پاکستان میں بسنے والے چودہ کروڑ انسان اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام اور پاکستان ہماری اولین ترجیح ہے اور ہم نے جو کچھ بھی کرنا ہے اسی دائرے کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کرنا ہے، اسی طرح اس معاملے میں بھی کامل یکسوئی پائی جاتی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں کے دل اسلام کے بغض اور پاکستان کی کدورت سے بھرے ہیں۔ امریکہ ہم سے محبت و دارتگی کے کیسے ہی دالبانہ پن کا اظہار کیوں نہ کرے۔ اس کے عزائم اس کی آنکھوں میں کندہ اور اس کے ماتھے کی ایک ایک شکن میں نمایاں ہیں۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش

من انداز قدت رای شناسم

(تو چاہے کسی بھی رنگ اور انداز کا لباس پہن لے، میں تیرے قدم و قامت سے تجھ کو پہچان

جاتا ہوں۔)

جذبوں کا یہ آہنگ اور سوچ کا یہ انداز صرف اندرون وطن تک محدود نہیں، بیرون ملک بسنے والے آنکھوں پاکستانیوں کے دل بھی اس دھڑکن سے ہم آہنگ ہیں۔ موجودہ نامہربان موسم نے ان کی محسوس بھی بے کیف، شامیں ویران اور راتیں بے خواب کر رکھی ہیں۔
یہ منسل 25 ستمبر کا ذکر ہے۔

امریکہ میں مقیم ایک درومند پاکستانی، ڈاکٹر غلام مرتضیٰ آرائیں نے جو پاکستان کے نام اور مقام کے لئے ہمیشہ سرگرم رہے، پاکستان کی مختلف شخصیات سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ ”ہم لوگ طالبان کی قیادت سے مل کر انہیں نرم رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے ایک امن وفد اانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں انسانی حقوق کے علمبردار اور امریکہ کا صدارتی انکیشن لڑنے والے، جیسی جیکسن سے بات ہوئی ہے جو کئی مصالحتی مشنوں کی قیادت کر چکے ہیں۔ سابق امریکی صدر جی کارٹر اور محمد علی کھلی کھلی اس وفد کا حصہ بن سکتے ہیں لیکن مزید پیش رفت سے پہلے طالبان کی رضامندی ضروری ہے۔“

ڈاکٹر صاحب نے جن شخصیات سے رابطہ کیا ان میں چوہدری شجاعت حسین اور اعجاز الحق بھی شامل تھے۔ چوہدری صاحب نے معاملہ ایک اعلیٰ اور نہایت ذمہ دار عہدے پر فائز شخصیت تک پہنچا دیا۔ اعجاز الحق نے بھی متعلقہ حکام کو صورت حال سے آگاہ کیا جن کی طرف سے گرین سگنل مل گیا۔ طے پایا کہ اعجاز الحق خود اسلام آباد میں قائم افغان سفارت خانے سے رابطہ قائم کریں۔ مشکل کی رات اعجاز الحق نے افغان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف سے تفصیلی ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران سفارت خانے کے ترجمان جناب محمد اسماعیل شاہین بھی موجود تھے۔ اعجاز الحق کی بات سننے کے بعد ملا ضعیف نے کہا کہ ”ہم تو انسانیت نشی کی آگ بھڑکانے کے خلاف ہیں لیکن میں قندھار میں دیمبر المومنین ملا عمر سے رابطہ کئے بغیر اس طرح کے کسی وفد کی آمد کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ہم کل صبح تک آپ کو سرکاری ردعمل سے آگاہ کر دیں گے۔“

اعجاز الحق نے ڈاکٹر مرتضیٰ کو صورت حال سے باخبر کر دیا جو ان کی نظر میں حوصلہ افزا تھی۔ بدھ کی صبح ساڑھے دس بجے افغان سفارت خانے نے اعجاز الحق کو اطلاع دی کہ اگر امریکہ میں مقیم پاکستانی بھائی، جیسی جیکسن یا دوسرے افراد کو کوئی وفد اانا چاہتے ہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ اس وقت امریکہ میں آدھی رات کا عمل تھا لیکن اعجاز الحق نے اسی وقت ڈاکٹر مرتضیٰ کو جگا کر یہ خبر دے دی۔ امریکہ میں صبح ہونے پر ڈاکٹر مرتضیٰ ہی کی پیش رفت پر جدید نیلی فونک سسٹم کی مدد سے سہ فری مذاکرات کا اہتمام کیا گیا جس میں جیسی جیکسن، محمد اسماعیل شاہین اور ڈاکٹر صاحب کے وکیل بیٹے نے حصہ لیا۔ جیسی جیکسن نے امن مشن لانے کی خواہش ظاہر کی اور طالبان نے اپنا موقف دہرایا کہ اگر آپ آنا چاہتے ہیں تو ہم آپ کے مشن کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔

جیسی جیکسن نے طالبان کے حوصلہ افزا رد عمل کے بعد امریکی وزیر خارجہ کولن پادل اور قومی سلامتی کی مشیر کڈولیز اور انس سے ملاقات کر کے انہیں اپنے مشن سے آگاہ کیا۔ صدر ریش پہلے ہی یہ سبے چک رو یہ اختیار کر چکے ہیں کہ ان کے ہونٹوں سے پھوٹنے والا ہر لفظ حکم کا درجہ رکھتا ہے اور اس سلسلے میں مذاکرات کی کوئی گنجائش نہیں۔ لہذا حکومتی عہدیداروں نے جیسی جیکسن کی حوصلہ شکنی کی۔ اس خبر کی بھٹک پڑتے ہی امریکی ذرائع ابلاغ نے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ طالبان کے لہو کی پیاسی امریکی قوم اور بھڑکتی آگ کو ہوا دینے والے میڈیا نے جیکسن کو قومی مفادات کا دشمن قرار دے ڈالا۔ دانت ہاؤس نے باضابطہ طور پر اپنے آپ کو ایسے مشن سے لا تعلق کر لیا۔ صورت حال سے گھبرا کر جیسی جیکسن نے یہ موقف اختیار کر لیا کہ ”میں از خود نہیں جانا چاہتا بلکہ طالبان نے مجھے امن کے لئے کردار ادا کرنے کی دعوت دی ہے۔“ بصرات کو رات دس بجے کے لگ بھگ اعجاز الحق کو ڈاکٹر مرتضیٰ کا فون آیا کہ جیکسن طالبان کی طرف سے ایک باضابطہ دعوت کے خواہش مند ہیں۔ بھیڑ میں کھو جانے والے بچے کی طرح جیکسن کو کسی سہارے کی ضرورت تھی۔ اعجاز الحق نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ یہ سب کچھ تو آپ کی پیش رفت پر ہو رہا ہے۔ تاہم انہوں نے ایک بار پھر افغان سفارت خانے سے رابطہ کیا اور صورت حال بتائی۔ ملا عبد السلام ضعیف کے ترجمان نے بے نیازی سے کہا ”ہم نہ اپنی جنگیں لڑنے کے لئے دوسروں کو آواز دیتے ہیں نہ جنگوں سے دامن بچانے کے لئے جڑے بلاتے ہیں۔“

بات ختم ہو گئی لیکن جمعہ کے سارے قومی اخبارات کے صفحہ اول پر اس نوع کی سرخیاں دکھ رہی تھیں کہ ”طالبان نے امریکی رہنما سے مصالحت کی درخواست کی جو جیسی جیکسن نے مسترد کر دی۔“

جیسی جیکسن اب بھی کسی نہ کسی نوع کا دعوت نامہ وصول کرنے کی جگہ دو دو کر رہے ہیں اور ممکن ہے طالبان ان کی یہ خواہش پوری بھی کر دیں لیکن جن کے اسلحہ خانے اور تجوریوں بھری ہوں، ان کے میڈیا کا جا دو بھی سر چڑھ کر بولتا ہے۔

ڈاکٹر مرتضیٰ مناسب سمجھیں تو ایک وفد چارج ڈیپوٹیشن کے لئے بھی ترتیب دے ڈالیں جس کی گردن ابوالہول کے گلین مجسے کی طرح آڑی ہوئی ہے۔

[29-09-2001]

زندہ یا مردہ!

امریکہ کی اقتصادی اور عسکری قوت کے مراکز سے اٹھنے والے شعلے ابھی سرد نہیں ہوئے تھے کہ صدر چارج ڈبلیو بش نے تکبر کی فرعونی حدوں کو چھوٹے ہوئے اعلان کیا "مجھے اسامہ چاہئے۔
زندہ یا مردہ"

اور اب اسامہ کی تلاش کا سفر فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ وائٹ ہاؤس نے تصدیق کر دی ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کے پینشل کمانڈو دستے، اسامہ کا سراغ لگانے اور اس کی کمین گاہ کا پتہ چلانے کے لئے افغانستان میں داخل ہو چکے ہیں۔ صدر بش نے اعلان کیا ہے کہ "سرگرم تعاقب شروع ہو گیا ہے اور بہت جلد اسامہ انصاف کے کبھرے میں ہوگا۔" ایک امریکی اخبار "نیو ایس اے نوڈے" کی اطلاع ہے کہ یہ کمانڈوز 13 ستمبر کو سی ایپے ٹھکانوں پر پہنچ گئے تھے جو اب افغانستان داخل ہو چکے ہیں۔ اخبار نے مزید بتایا کہ آپریشن میں بلیک ہاک ایم ایچ K-60 گن شب بلی کا پتھر بھی استعمال ہوں گے جو افغانستان سے ملنے والی سرحدوں کے باہر تیار کھڑے ہیں۔ دانشمنان نے خبر دی ہے کہ چالیس مزید کمانڈوز کسی بھی وقت افغانستان میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اخبار کے مطابق زمینی، فضائی اور بحری افواج سے تعلق رکھنے والے دستے شکار کو گھیرنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں۔

"زندہ یا مردہ" اسامہ کی تلاش کا یہ سفر بہت دنوں سے جاری ہے۔

انسانی حقوق کی سر بلندی اور دہشت گردی کی سرکوبی کے لئے "مصروف جہاد" امریکہ کے سابق صدر کانٹن نے چند ہی دن پہلے فریہ لہجے میں انکشاف کیا تھا کہ "میں نے اپنے آخری دنوں میں اسامہ کو ہلاک کرنے کے لئے ایک خفیہ آپریشن کا حکم دیا تھا لیکن متعلقہ تنظیم اٹلی جنس کی کمزوری کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔"

22 ستمبر کو معروف برطانوی اخبار "گارڈین" میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق

اسی سال جولائی کے وسط میں پاکستان، امریکہ، روس اور ایران نے اسامہ کو گرفت میں لانے کی کوششوں کا جائزہ لیا تھا۔ اس سلسلے میں برلن میں چار روز تک ایک خفیہ اجلاس جاری رہا جس میں چاروں ممالک کے انتہائی اعلیٰ اور ذمہ دار عہدیداروں نے شرکت کی۔ یہ اس سلسلے کا چوتھا اجلاس تھا۔ اسامہ کے قتل کا حکم دینے والے صدر کلنٹن اس سے قبل 1998ء میں اسامہ کو میزائلوں کا نشانہ بنا چکے تھے۔ اس حملے میں بیس بے گناہ انسانوں کی جانیں لینے کے باوجود امریکہ اسامہ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکا اور اب ”زندہ یا مردہ“ اسامہ کی تلاش میں امریکہ افغانستان کی شکار گاہ میں اتر چکا ہے اور ساری دنیا ہانکا لگانے میں اس کے ساتھ شریک ہے۔

اسلام آباد میں خمیر زین امریکی سفیر نے ”شکار“ کے سارے راستے بند کرنے کے لئے پاکستان کو 175 ملین ڈالر دینے کا عندیہ ظاہر کیا ہے تاکہ 1500 میل لمبی ڈیورنڈ لائن پر دوسو کے لگ بھگ ٹاکوں پر نظر رکھی جاسکے۔ سرحد کی موثر اور ہمہ وقت نگرانی کے لئے گن شپ ہیلی کاپٹروں کی کھپ کا امکان بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

ادھر قوموں کی آزادی و خود مختاری اور انصاف کی ضامن اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں اس امر کی پلان پر مہر توثیق ثبت کر دی ہے جس کا مسودہ امریکہ نے پیش کیا تھا اور جس میں کہا گیا ہے کہ دہشت گردوں کے خلاف مہم میں ساری دنیا بش کے منصوبے کو من و عن قبول کرنے کی پابند ہے اور اگر 189 ممالک میں سے کسی نے بھی سرتابی کی تو اس کے خلاف شدید نوعیت کی پابندیوں کے علاوہ فوجی کارروائی بھی کی جاسکتی ہے۔ سلامتی کونسل نے نہ جانے کیوں ”امریکی فرمان“ کو معتبر بنانا ضروری خیال کیا ورنہ دنیا کے بیشتر ممالک تو پہلے ہی امریکہ کی طرف سے جاری کردہ فہرست کے مطابق ستائیس تنظیموں اور افراد کے خلاف اس سرمت کے ساتھ کارروائی کر چکے ہیں جیسے ان کا شمار بھی امریکی ریاستوں میں ہوتا ہو۔

اسامہ کی تلاش میں نکلنے والے امریکی اور برطانوی کمانڈوز کو معلوم نہیں کہ وہ کس کچھار میں ہاتھ ڈال رہے ہیں اور یہ کہ افغانستان کی سرزمین ایسے شکاریوں کے خون سے بڑی رغبت رکھتی ہے۔ 1991ء میں جب ہم لوگ کابل کے نواح میں گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود کے مذاکرات کے نتائج کا انتظار کر رہے تھے اور دن ڈھلنے کو آگیا تھا تو افغان میزبان ہمارے لئے لٹچ لے کر آئے تھے ایک نان اور ایک ان چھلا کھیرا ایک کے حصے میں آیا تھا اور جہاد کے دنوں میں

ان سخت جانوں کو یہ بھی کہاں میسر تھا۔ سوکھی روٹی، پانی میں بھگو کر کھانے والے ان لوگوں کے نزدیک زندگی سے زیادہ ارزاں جنس کوئی نہیں۔ وہ موت سے اس طرح کھیلتے ہیں جس طرح امریکی بچے کپیوٹرز سے۔

1980ء کی دہائی میں جہاد افغانسان عروج پر تھا۔ افغان سالاروں اور پاکستانی حکام کے درمیان ایک اہم اجلاس میں مجاہدین کی ضروریات پر بحث ہو رہی تھی۔ مجاہدین کی طرف سے پیش کی گئی فہرست میں گولہ بارود کے علاوہ ایک ”چھوٹی آرمی“ کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ جنرل اختر عہد الرحمن کے پوچھنے پر ایک مجاہد نے کمال سادگی سے بتایا کہ ”ہمارے بازو زخمی ہو کر نٹکتے لگتے ہیں اور ہڈی سے جڑے رہنے کے باعث بہت تکلیف ہوتی ہے، مجاہدین نے چھوٹی آرمیوں کا مطالبہ کیا ہے کہ وہ فوراً اچھے بازو کاٹ کر بھیج دیں۔“

یہ ہیں وہ لوگ جو چٹخیز خان سے لے کر رومی عفریت تک ایک ہی داستان بار بار لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ پتھروں، گھانٹوں، پہاڑوں، دادیوں اور ندی نالوں پر مشتمل اس شکار گاہ میں جو بھی داخل ہوا، لوٹ کر نہیں گیا۔ اس جادو گمری میں جس اجنبی نے بھی قدم رکھا پتھر کا ہو گیا اور پتھر کوئی ”اسم اعظم“ اس میں جان نہیں ڈال سکا۔

”زندہ یا مردہ“ اسامہ کی تلاش میں نکلنے والے کم نظر سوراخوں کو کون بتائے کہ ایسے طلسماتی کردار، زندگی یا موت کی ڈوری سے نہیں بندھے ہوتے۔ ان کے زمان و مکان کچھ اور ہوتے ہیں۔ امریکہ کے مال خانے، اسلحہ خانے اور خیر خانے، ایک مشتبہ ملزم کو ایسا لاقافی کردار بنا چکے ہیں جس کی زندگی ماہ و سال کی قید سے آزاد اور موت سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ ایسے کردار ”مردہ“ ہو کر ”زندہ“ ہو جاتے ہیں۔

[30-09-2001]

بس ایک سوال

غانہا پاکستان کے ہر فرد کو وہی مسئلہ درپیش ہے جس نے موٹروے کے بھیرہ انٹر چینج پر پٹرول پمپ کے ساتھ چھوٹے سے سنور میں بیٹھے 23 سالہ سرفراز کو پریشان کر رکھا ہے۔

اسلام آباد سے لاہور جاتے ہوئے ایک سنور سے گرم گرم چائے کا کپ تھا، میں نے

کاؤنٹر سنبھالنے تو جوان سے پوچھا:

”تمہارا نام“

”سرفراز“

”سرفراز کیسے حالات چل رہے ہیں؟“

”جی بس ٹھیک ہی ہیں۔ کوئی مزا نہیں آ رہا۔ اللہ ملک کی خیر کرے۔“

”انشاء اللہ ملک کی خیر ہوگی۔ لگتا ہے تم حکومت کے فیصلے سے خوش نہیں ہو۔“

23 سالہ نو جوان کے چہرے پر بوزھوں جیسی دانائی کا ہلکا سا رنگ آیا اور گزر گیا۔

”جی پاکستانی بن کر سوچتا ہوں تو فیصلے ٹھیک لگتا ہے لیکن مسلمان ہو کر سوچتا ہوں تو دل بہت

اداس ہو جاتا ہے۔“

گازی میں بیٹھنے کے بعد سے لاہور پہنچنے تک، اور شاید اب بھی، میں اسی ادھیڑ بن میں ہوں کہ سرفراز کا شمار دس فی صد میں کروں یا نوے فی صد میں۔ حکومت کا کہنا ہے کہ پاکستان کے عوام کی بھاری اکثریت حکومتی موقف کی حامی ہے، صرف دس فی صد تک حقیر اقلیت جذبات کی رو میں بہہ رہی ہے۔ بغیر مہر قہل میں نے ٹیلپ پل والے برادر ام اعجاز شفیع گیلانی سے بات کی تو انہوں نے بتایا کہ آخری سروے کے مطابق ہاسٹھ (62) فی صد لوگ حکومتی موقف کے خلاف اور چونتیس (34) فی صد حق میں ہیں۔ چار فی صد نے رائے ظاہر نہیں کی۔

میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر پارہا کہ سرفراز کو 62 فیصد میں گنوں یا 34 فیصد میں؟ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ پاکستانی عوام قومی مفادات کا پورا شعور رکھتے اور ملک کو درپیش مجبور یوں سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ دیوار سے سر پھوڑنے یا گریباں کھول کر سیلاب بلا کے سامنے کھڑے ہو جانے کے لئے جس عشق و جنوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ناپید ہے۔ تخلیق پاکستان کے بعد ہی سے ہمارا مقدر بن جانے والے حالات ہماری رگوں میں جاری لہو کی حدت چاٹ چکے ہیں۔ بحرانوں میں گھری سیاست و معیشت نے ہمیں زندگی کی عمومی ضرورتوں کا قیدی بنا رکھا ہے اس لئے یہ تقاضا کرنا مناسب نہیں کہ ہم اپنے کان اور آنکھیں بند کر کے طوفانوں سے ٹکرا جائیں۔ ہمیں معلوم ہے ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایمان سے محروم ہیں اور آتش نمرود ہمارے لئے انداز گلستان پیدا نہیں کرے گی۔

بات یہیں تک رہتی تو سرفراز مطمئن ہو جاتا لیکن وہ بہر طور ایک مسلمان بھی ہے۔ جنوبی ایشیا کا مسلمان جسے رنگ، نسل، خون اور جغرافیے سے بے نیاز ہو کر ایک امت کا جزو ہونے اور ربط ملت کا سبق دیا گیا ہے۔ جو تورانی، ایرانی اور افغانی میں تمیز کو حرام سمجھتا ہے۔ اس نے اسی نظریے کی بنیاد پر بیسویں صدی کی ایک عظیم تحریک چاکی اور اسے کامیابی سے ہسٹنا کیا۔ وہ اپنے آپ کو علامہ اقبال کی فکری میراث کا وارث خیال کرتا ہے جن کی تمام شاعری وحدت ملی کے مرکزی نکتے کے گرد گھومتی ہے:

نہ افغانیم و نہ ترک و نہ تاریم
چمن زادیم و ازیک شاشاریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردہ یک نو بہاریم

(نہ ہم افغان ہیں، نہ ترک، نہ تاریم۔ ہم تو ایک ہی چمن اور ایک ہی گھنے درخت کی شاخیں ہیں۔ ہمارے لئے رنگ اور بو کی تفریق حرام ہے کہ ہمیں ایک ہی بہار نے پروان چڑھایا ہے۔) دنیا میں جہاں کہیں اسلام یا مسلمانوں پر کڑا وقت آیا، یہاں کے مسلمانوں کے دل ولے بے قابو ہو گئے۔ دنیا نے پاکستان کے اٹمی پروگرام کو "اسلامی بم" کا نام دیا اور عوام نے اسے فخر کے

ساتھ اپنی پیشانی کا جھومر بتالیا۔ اسلامی دنیا کی واحد ”سپر پاور“ ہونے کے حوالے سے اہل پاکستان نے ہمیشہ اپنے آپ کو اسلامی مفادات کا پاسان سمجھا۔ یونینیا، چینیا، فلسطین، کشمیر، جہاں جہاں بھی سامراج کے خلاف آزادی کی تحریکیں اٹھیں، اہل پاکستان نے انہیں اپنے دلوں میں جگہ دی۔ کچھ نہ کر سکے تو بھی آسمان کی طرف اٹھے ان کے ہاتھ اور آنکھوں میں تیرتے آنسو، اُمت کے ساتھ ان کی گہری وابستگی کی کہانی سناتے رہے۔ صدام حسین کے خلاف حکومتی موقف کو جہنی برحق سمجھنے کے باوجود اس عہد میں جنم لینے والے بچوں کی بڑی تعداد ”صدام“ کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے گزشتہ ایک عشرے سے پاکستانیوں میں سب سے مقبول نام ”اسامہ“ چلا آ رہا ہے۔ تحریک خلافت کے دلوں میں، زمینی حقائق سے بے نیاز، مصطفیٰ کمال پاشا کی بلائیں لینے والی ماؤں کی گود میں پلنے والی اس قوم کے لئے یہ تصور بھی محال ہے کہ اس کے کندھے پر رکھی بندوق کا نشانہ، اللہ کے حضور بجدہ ریز ایک مسلمان ہو اور اس بندوق کے ٹریگر پر رکھی انگلی کسی ایسے شخص کی ہو جس کی پوری تاریخ اسلام دشمنی سے عبارت ہے۔

یہی الجھاؤ اہل پاکستان کے دلوں پر نشتر چلا رہا ہے۔ بہت سے مسلم ممالک کے برعکس پاکستانی قوم ایسے نیشترم کو اپنا نہیں پاتی جو نظریے کی پوٹلی کو بانجھ کر الگ رکھ دیتا اور سارے معاملات کو مادی مفادات کے محدود حوالے سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر کے بارے میں یا سرعرات کی سرد مہری کے باوجود کسی پاکستانی کے دل میں فلسطینیوں کی محبت ماند نہیں پڑی اور ہیشیان (چینیا) کی انجمنی سرزمین پر امام شامل رحمۃ اللہ علیہ کے ہیرو کاروں کی جگہ و تاہز آج بھی اہل پاکستان کی رھڑکنوں کا حصہ ہے۔

امت سے وابستگی اور ملت کے ساتھ رابطہ استوار، پاکستان کے مسلمانوں کے لہو کی ایک ایک بوند میں شامل ہے۔ دوسروں کے رویوں سے بے نیاز، ہمیشہ اور ہر حال میں اہل اسلام کے دکھ درد میں شرکت ان کے ضمیر میں رچ بس چکی ہے۔ وہ فطری، فکری اور طبعی ساخت کے اعتبار سے ”پاکستانیت“ اور ”اسلامیت“ میں کوئی لکیر کھینچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ دونوں کا ازاں رشتہ ایک سہانے خواب کی طرح ان کے دل و دماغ پر نقش ہے۔

خواب اور حقیقت کے درمیان الجھے ہوئے سرفراز کی طرح قوم کا بڑا حصہ اسی سوال کی صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔ اسے پچاس سال سے زائد عرصے پر محیط قومی تاریخ میں کبھی اس سوال کا

سامنا نہیں کرتا پڑا کردہ "پاکستانی ہے یا مسلمان؟"

بھیرہ انٹرنیٹ کے چھوٹے سے شور میں بیٹھے 23 سالہ مرفراز کے جواں سال چہرے پر کندہ

اس سوال کا جواب ملنے تک، میں اسے کس گروہ میں شمار کروں؟

نوے فیصد یا دس فیصد میں؟

[01-10-2001]

گناہ کبیرہ

امریکہ پر اچانک انکشاف ہوا کہ طالبان کی حکومت نہ تو باضابطہ انتخابات کے ذریعے قائم ہوئی ہے اور نہ ہی اسے عوام نے چنا ہے۔ وائٹ ہاؤس سے جاری ہونے والے ایک تازہ "فتوے" کی رو سے طالبان حکومت کا وجود ناجائز اور اس کا قیام "حرام" قرار دیا گیا ہے۔ اٹلی کے شہر روم میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح جاں بلب ظاہر شاہ کے گھر امریکی کانگریس کے ارکان، شمالی اتحاد کے کمانڈروں، جاو وطن افغان عمائدین اور شاہ کے وفاداروں کے درمیان طے پایا ہے کہ ایک سو بیس (120) رکنی سپریم کونسل نامزد کی جائے گی جو لوئی جرگے کی مدد سے افغانستان کے نئے حکمرانوں کو تخت پر بٹھائے گی۔ ظاہر شاہ کے پوتے مصطفیٰ ظاہر شاہ نے اعلان کیا ہے کہ پاکستان مداخلت سے باز نہیں آ رہا۔ اسے افغانستان سے دور رکھنے کے لئے طالبان کا تختہ الٹنا ضروری ہے۔ احمد شاہ مسعود کے بھائی ولی مسعود نے کہا ہے کہ امریکہ ہم پر ہاتھ رکھے، ہم چھ ماہ کے اندر اندر طالبان کو نابود کر دیں گے۔ بدخشاں میں بیٹھے صدر افغانستان پر وفیسر بریان الدین ربانی نے فرمایا ہے کہ امریکہ کو طالبان پر حملہ کرنے میں اس قدر تاخیر نہیں کرنی چاہئے تھی۔ نونی بلینز کا بیان آیا ہے کہ دہشت گردی کی راہ میں حائل طالبان عبرت کا نشان بننے والے ہیں۔ جارج بش نے "بھد مسرت" طالبان کے خلاف آپریشن کی منظوری دے دی ہے۔ ایرانی وزیر دفاع نے کہا ہے کہ ہم شمالی اتحاد کو اسلحہ پہلے سے دے رہے ہیں اور آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔ بے نظیر بھٹو نے اعلان جاری کیا ہے کہ طالبان کی موجودگی میں افغانستان کا کوئی سیاسی حل نہیں نکل سکتا اور صدر پرویز مشرف نے بتایا ہے کہ "طالبان کے دن گئے جا چکے ہیں۔"

واقعی یوں لگتا ہے جیسے طالبان کے دن گئے جا چکے ہیں۔ علامہ اقبال نے آج سے پون صدی قبل بتا دیا تھا کہ افغانیوں کی دینی غیرت کا موثر سدباب کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ "طا

کو اس کے کوہِ دامن سے نکال دو۔ سو ہشت گردی کے خلاف اکیسویں صدی کا عظیم معرکہ چلا کرنے والی اقوامِ عالم، ملا کو افغانستان کے کوہِ دامن سے نکال باہر کرنے پر متفق ہو گئی ہیں۔ کپیونر، ٹیلی ویژن، ہائی ٹیک، خیرہ کن انفارمیشن سائنس اور نوجوانوں کے نوجوان ایجادات کی اس دنیا میں گھنی ڈاڑھیوں، بھاری بگڑیوں اور جہازیں چادروں والے یہ لوگ عجیب نامانوس سے لگتے ہیں۔ سائنس اور اسباب کے اس دور میں بھی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ ”زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی ہے جو ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔“

میں نے ان ”غریب و سادہ ورتکین“ لوگوں کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب طالبان کابل سے صدیوں کی مسافت پر کھڑے تھے۔ اس وقت تو ہرات بھی ناقابلِ تسخیر لگتا تھا۔ افغانستان کے صدر برہان الدین ربانی نے اسماعیل خان کو ہرات کا گورنر نامزد کیا تو اسے جبری کمانڈر کی جو امرودی کا صلہ قرار دیا گیا۔ قندھار میں قدم جمانے کے فوراً بعد طالبان نے گورنر اسماعیل خان کو پیغام بھیجا کہ ہمارے ساتھ مل کر امن و امان کی بحالی اور اسلامی نظام کے لئے کام کرو، ہمیں اقتدار کا لالچ نہیں، ہم تمہیں ہرات کا گورنر برقرار رکھیں گے۔ اسماعیل خان کو اپنی بے پناہ طاقت کا زعم تھا۔ اس نے پیغام بروں کو واپس بھیج دیا اور ایک زبردست حملہ کر کے طالبان کے زیرِ کنٹرول صوبے ”نمروز“ کی تحصیل ”دلآرام“ پر قبضہ کر لیا۔ علاقے کے سارے چوروں، بد معاشوں اور ڈاکوؤں نے ہرات کے اندر پناہ گاہیں بنالیں۔ پانچ ہی دن بعد صرف پانچ سو طالبان ہلکے ہتھیاروں کے ساتھ ہرات ائرپورٹ کی نواحی پہاڑیوں سے نیچے اترے۔ اسماعیل خان مقابلے کے لئے نکلا لیکن اس وہم میں پڑ گیا کہ صرف تھوڑے سے طالبان ہرات چھاؤنی پر کیسے حملہ کر سکتے ہیں۔ یقیناً کوئی بڑی سپاہ پہاڑیوں کے عقب سے اتر چاہتی ہے۔ فوراً پلٹ کر گھر آیا، بیوی بچوں کو لے کر ہیلی کاپٹر پر پہنچا لیکن کوئی پائلٹ اس کا ہیلی کاپٹر اڑانے پر آمادہ نہ ہوا۔ بے بسی کے عالم میں اس نے دو گاڑیاں لیں، گھروالوں کو بٹھایا اور ایران کی سرحد پار کر گیا۔

آج وہی اسماعیل خان اپنے شکستہ پادستوں کی شیرازہ بندی کر رہا ہے اور اطلاعات ہیں کہ قندھار سے ہرات تک اس کی حکمرانی کا ناقوس بجنے والا ہے۔ برطانوی اخبار ”گارڈین“ کا کہنا ہے کہ حکومت پاکستان، کابل میں موجود سینئر ترین عہدیدار اور ملائیم کے قریبی ساتھی ملا محمد

حسن اخوند کو بغاوت پر آمادہ کر رہی ہے۔ شمالی افغانستان کی مردہ رگوں میں نئی توانائی آچکی ہے اور کسی بھی لمحے ایک ”بریکنگ نیوز“ دنیا کو یہ مژدہ سنا سکتی ہے کہ افغانستان کو طالبان سے آزاد کرالیا گیا ہے۔

ذہیر ساری کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود مجھے طالبان اچھے لگتے ہیں۔ جانے پہچانے سے، اپنے اپنے سے، میری تاریخ کے گمشدہ کرداروں جیسے۔ انہوں نے گزشتہ چھ سالوں میں نوے فیصد سے زائد افغانستان کو بد امنی اور تہذیب و فساد سے پاک کر دیا۔ بغاوت پر آمادہ ملا محمد حسن اخوند نے ہی مجھے بتایا تھا کہ ”ہم نے اپنے زیر قبضہ علاقے کو امن کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ پندرہ دہائیوں میں ایک سال کے اندر پندرہ قتل بھی نہیں ہوئے۔ ذکیقتی، اغواء، چوری اور لوٹ مار کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ یہ اللہ کے قانون کی برکت ہے کہ ہمارے پہاڑ، وادیاں، جنگل، ویرانے، شہر، گاؤں اور شاہراہیں مکمل طور پر محفوظ ہیں۔“

میں نے چھ سال پہلے ”طالبان کا افغانستان“ کے نام سے ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا جسے آج تک کتابی شکل میں مرتب کر رہا ہوں لیکن ”طالبان کے دن تو گننے جا چکے ہیں۔“ میری اس کتاب کا کیا بنے گا؟

”میرے دوستو! میں کیا کروں؟ تمہاری فرد جرم تو طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ میں تمہاری سادہ لوحی، سخت گیری، انجنا پسندی، بنیاد پرستی حتیٰ کہ کسی حد تک ”دہشت گردی“ کا دفاع بھی کر سکتا ہوں لیکن اس گناہ کبیرہ کا کیا کروں جس کا ذکر تازہ ترین امریکی میوزنڈم میں کیا گیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ عظیم امریکہ جمہوریت اور عوام کی بالادستی کے بارے میں کس قدر حساس ہے؟ مجھے تو اب یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ میری کتاب کا کیا بنے گا؟“

کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ ”تمہاری حکومت نہ منتخب ہے نہ تمہیں عوام نے چنا ہے۔“

[03-10-2001]

بنگلہ دیش کا فیصلہ

پنے بھروسے میں امریکی ۱۰۰ امر پر نکل کر تقیید کرنے اور باج میں ایک چھوٹے سے نشتے
شعبان کے یوں منظر سے بھلا دیکھی ہوا کو خطاب کرنے والی خاندان وغیرہ ہیبت کافی ہے اور
بڑھتی تھیں انہوں نے بھارتی احساسات کا پختہ روکنے پر اس کے لیے بالکل اہمیت کا پورا کرنے والی نشتے
دیں اور اپنے انہوں پر اس قدر کی کوشش کر رہی ہے۔
یہ دیکھنے کے انوں کا ذکر ہے۔

بھلا دیش کی بہتر انصاف پرستان اور بھارت کے درمیان ہوتی تھی فخر کرنے اور
مشن پر پورا تھانے شریف انہیں۔ ایوان صدر میں ان کی ملاقات اس وقت کے صدر لالہ یار
رفیق کے ساتھ ہوئی۔ میں بھی اپنی کھلی ذمہ داری کے اعوان کے اس ملاقات میں موجود تھا۔
انہوں نے اجلاس کے دوران میں غور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ انہیں اور میں بات کرنے میں
بہت اختلاف آتا ہے۔ لگتا ہے کہ انہوں نے بھارت کے آنے والے کسی ایجنڈے کی طرف سے
انہوں نے غور و خوض کے بعد اس وقت پر بھارتی سفارت کاروں سے ملاقات کے بعد
چھ ماہ کی کوئی یہ تمام شہرے کے ہمایوں میں منگے ہوئے پشت والے پورا پورا پورا پورا پورا
انہوں نے بھارتی سفارت اور ان کے ملاقات میں رہی تھی انہوں نے چھوٹے چھوٹے مسائل میں
شہرے میں انہوں نے یہ بات کہ اپنی بات میں تمہیں کا رنگ نہ دے ہوئے انہوں نے کوئی بڑا
صدر سے کہا کہ انہوں نے صدر صاحب کو آپ نہیں جانتے ہیں اور انہوں نے اتنا ہیڈ میں
کرتے تھے اور انہوں نے چھ ماہ میں سب سے پہلے آسمان سوال حل کرنے پر انہوں نے شامل سوال و
وقت کے چھ ماہ میں چھ ماہ۔ یہ خیال ہے آپ کا۔

اپنی دانست میں ایک اچھا ہی کا رہا ہے جو ان کے بعد انہوں نے ایک فوجی مشورہ

کبھیرتے ہوئے انہوں نے طرحہ از نظروں سے صدر تارڑ اور اپنے وفد کے ارکان کی طرف دیکھا۔ جبانہ یہ صدر کے اندر چھپے وکیل نے انگڑائی لی۔ انہوں نے بڑی متانت کے ساتھ ایک جوابی سوال داغ دیا۔

”تختہ مرہ! اگر تمام آسمان سوالوں کے پورے نمبر ملا کر بھی ”پاس مارکس“ نہ بنیں اور قیل ہونا یعنی ہوتو آپ کیا کریں گی؟“

مجیب الرحمن کی بیٹی کے پاس کھسیانی ہنسی بٹسنے کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ ملاقات کا باقی سارا وقت وہ اپنی پسپائی کی خفت مٹاتی اور کھسبنا تو جتنی رہیں۔

اور اب خبر آئی ہے کہ بھارت کے ساتھ دوستی کے باعث حسینہ واجد کا مقدر بن جانے والی خفت کا سفر اور بھی طویل ہو گیا ہے اور بنگلہ دیش کے عوام نے شیخ مجیب الرحمن کی صاحبزادی کو بالآخر اس مرگھٹ تک پہنچا دیا ہے جو قومی مفادات کو غیروں کی خوشنودی کی سمیٹ چڑھا دینے والوں کی آخری آرام گاہ ہوتی ہے۔

خالدہ ضیاء اور حسینہ واجد کے درمیان لڑا جانے والا معرکہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے فکرو احساس کو جانچنے کی ایک کسوٹی بھی ہے۔ 11 ستمبر سے پہلے بنگلہ دیش کی انتخابی جنگ بہر حال یکطرفہ نہ تھی اور یوں لگتا تھا کہ گھسان کارن پڑے گا لیکن 16 ستمبر کے واقعات اور امریکہ کے مسلم کش رویے نے بنگلہ دیش کی انتخابی مہم کو ایک اضافی موضوع دے دیا۔ حسینہ واجد نے بھارتی پالیسی کے عین مطابق سیکولر ازم اور لیبرل ازم کے نام پر امریکی آرکسٹرا سے ہم آواز ہوتے ہوئے ”دہشت گردی“ کے خلاف عالمی مہم کو اپنی بھرپور تائید و حمایت سے نوازا۔ خالدہ ضیاء نے دہشت گردی کی مذمت کرتے ہوئے امریکہ سے کھلے بندوں مطالبہ کیا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو بدف نہ بنائے اور اسلام کو بہانہ بنا کر افغانستان کو تاراج کرنے سے باز آ جائے۔ خالدہ کے چار جماعتی اتحاد کے جلسوں اور جلوسوں میں صدر دیش کے خلاف جذبات کے اظہار نے بنگلہ دیشی عوام کے فیصلے پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ سابقہ ”مشرقی پاکستان“ کا فیصلہ اس الزوال نظریے کی فتح ہے جسے کوئی کتتی باہنی، کوئی مجیب الرحمن، کوئی اندرا گاندھی اور کوئی حسینہ واجد تک نہیں پہنچا سکتے۔

تھکست خوردہ حسینہ نے ایک بار پھر کھسیانی جلی کی طرح کھسبنا چننا شروع کر دیا ہے۔ آئین کے تحت ایک سابق چیف جسٹس کی سربراہی میں قائم غیر جانبدار نگران حکومت کے زیر سایہ ہونے

والے انتخابات مشکوک ٹھہرائے جا رہے ہیں۔ حینہ کے سرپرست متحرک ہو چکے ہیں۔ ان کی کوشش ہے کہ سیاسی افراتفری کا ایک طوفان اٹھا کر خالدہ کی دو تہائی اکثریت کو اسی انجام سے دوچار کر دیا جائے جو اس طرح کی ”دو تہائی اکثریتوں“ کا مقدر ہوتا ہے۔

اس وقت امریکہ اور مغرب کو یہ ہادر کرانا ممکن نہیں کہ وہ ایک ایسے خاکستر کو کرید رہے ہیں جس میں کئی پننگاریاں ابھی تک سلگ رہی ہیں۔ صدیوں کے زوال اور شکست و ریخت کے باوجود مسلمانوں کے دل ویران ہوئے ہیں نہ ان کے ذہن غلامی کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ جارج بش ایک نئی صلیبیں جنگ کا مژدہ بنا رہے ہیں۔ اٹلی کے وزیر اعظم نے کہا ہے کہ ”اسلامی تہذیب، مغربی تہذیب سے کہیں حقیر و کمتر ہے اور ہم اسے کیونرم والے انجام سے دوچار کر دیں گے۔“ امریکی اقتدار کی غلام گردشوں میں کھڑا ایک چوہدار، ٹونی بلیر مسلسل زہرا گل رہا ہے۔ مغرب کا بیڈیا ”تہذیبوں کے تصادم“ کی تھیوری کو ہوا دے رہا ہے۔ طاقت کے نشے میں چور ایک بدست عفریت، آدم بو، آدم بو پکارنا، ہمارے گھر کی دہلیز پر آکھڑا ہوا ہے۔ بھارت کا کہنا ہے کہ افغانستان میں ناشتہ کرنے کے بعد یہ عفریت دو پہر کا کھانا کشمیر میں تناول کرے گا۔ دائٹ باؤس کے لان میں گلے ہانچنے میں سے ایک بھول بھی نوٹ جائے تو جارج بش اس ”واردات“ کے ڈانڈے اسامہ، القاعدہ اور مسلمانوں سے ملا دیتے ہیں۔ ہمارے ایمل کانسی اور رمزی یوسف کو منڈی میں کھڑے میسنوں کی طرح اٹھالے جانے والا مغرب، رسول مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے گستاخوں، سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کو اپنے عشرت کدوں میں پناہ دینے رکھے گا تو اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو بنگلہ دیش کے عوام نے کیا ہے۔

[04-10-2001]

وسو سے اور واہے

دانشوروں کی نکتہ آفرینی اور تجزیہ نگاریوں کی حاشیہ آرائی نے ”دہشت گردی“ کے خلاف امریکی مہم اور پاکستان کی طرف سے اس مہم کا دست و بازو بننے کے حوالے سے جو دلکش ورقلین منظر تخلیق کئے تھے، تین ہفتوں کے اندر اندر ان کے نقوش ماند اور رنگ پھکے پڑنے لگے ہیں۔

پاکستان نے پھرے ہوئے امریکہ کی بلائیوں کے سامنے فوری بند باندھنے کا جو فیصلہ کیا، آج بھی اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن کل بھی یہ کہا گیا اور شاید دیر تک کہا جاتا رہے گا کہ ہم نے امریکی عزائم کی دستوں اور مہمراہوں کا اندازہ لگانے اور خود سپردگی کے عمل میں احتیاط، تحمل اور تدبیر کے بجائے دالہانہ پن کا مظاہرہ کیا۔ شاید اس کے پس منظر میں یہ تشویش بھی کارفرما تھی کہ ”محبوبیت“ کی دوڑ میں بھارت ہم سے آگے نہ نکل جائے۔ زینہ زینہ نیچے اترتے وقت ہر قدم نپا تھلا ہوتا ہے، اعصاب اپنی گرفت میں ہوتے ہیں اور اعضاء کا توازن برقرار رہتا ہے۔ لیکن اونچی ڈھلوان سے لڑھکتے وقت سب کچھ بے قابو ہو جاتا ہے اور کسی مخصوص مقام پر قدم جمانا ممکن نہیں رہتا۔

اب امریکہ کی قیادت میں دہشت گردی کے خلاف لڑی جانے والی عالمی جنگ کے نقوش نمایاں ہونے لگے ہیں۔ جو لوگ خوش فہمیوں کے رقلین غباروں سے دل بہلا رہے تھے انہیں بھی ”نوشتہ دیوار“ کے دھندلے نقوش دکھائی دینے لگے ہیں۔ بلاشبہ ہم قومی تاریخ کے سب سے سنگین دور سے گزر رہے ہیں اور اگر اب بھی ہماری منصوبہ سازی کا دائرہ محض طورخم اور چین تک محدود رہا اور ہماری حکمت عملی کچھ قرضوں کی معافی اور ری شیڈولنگ کے گرد گھومتی رہی تو اس منظر کو کوئی نہیں روک سکتے گا جس کے تصور ہی سے مجھ جیسے حساس اور کم حوصلہ لوگ اندھا ہونے کی دعائیں مانگتے ہیں۔

امریکہ نے کبھی، کسی مرحلے پر بھی کشمیر کے بارے میں پاکستان کے موقف کی حمایت نہیں

کی۔ دوستی کے رومانوی دور میں بھی وہ اس سلسلے میں گرجوش نہیں رہا۔ سوویت یونین کی کھلی جھکانے کے بعد اس کی ترجیحات میں زبردست تبدیلی آ چکی ہے اور وہ مسلسل بھارت کی تازہ برداری کر رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اس امام کو ایک ارب لاکھوں کی منڈی سارے اخلاقی ضابطوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت قرار دیتے ہوئے اس کے ساتھ دیرپا رفاقت کے عہد و پیمانے کئے بیٹھا ہے۔ اگر ہم ان سارے حقائق سے منہ موڑ کر صرف ”تصور جاناں“ کئے اس سوچ میں گم رہے کہ ہماری بے ساختہ جاں سپاری اور دالہانہ اطاعت گزاری کے بعد امریکہ، کشمیر میں بھارت کو کوئی رعایت نہیں دے گا تو یہ ایک مہلک قسم کی خود فریبی ہوگی۔

خوفزدہ لوگوں کے دل دوسوں اور واہموں کے جھنگل بن جاتے ہیں۔ اللہ کرے یہ محض دوسے اور واہمے ہی ہوں لیکن ماضی میں ہمارا ہر دوسہ اور ہر واہمہ بھیانک تعبیر پاتا رہا ہے۔ اس لئے حالیہ کی اونچی دیواروں پر رقم ”نوشتہ“ پڑھنے میں غلطی اور تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ دیرسویہ سے قطع نظریہ طے ہے کہ پاکستان کے پرکاش کر اسے اس قابل نہ رہنے دیا جائے کہ وہ امت مسلمہ کی امامت کا دعویٰ کر سکے۔ ہمارا اٹنی پروگرام ہمارے شاہین اور خوری، ہماری عسکری صلاحیتیں، ہماری آزادی و خود مختاری اور سب سے بڑھ کر ہمارا نظریاتی تشخص اس کے راستے کے پتھر ہیں۔

اپنے دیرینہ عزائم کی تکمیل کے لئے سرگرم امریکہ کی دیکھا دیکھی بھارت نے بھی اپنے ناپاک ارادوں کی گھڑی کھول لی ہے۔ تین دن قبل بھارتی وزیر داخلہ نے ساری دنیا کو بتایا ہے کہ امریکہ نے افغانستان کا قرضہ چکانے کے بعد کشمیر میں جاری دہشت گردی کو نشانہ بنانے کا وعدہ کیا ہے۔ جسوت سنگھ داٹ ہاؤس میں امریکی مشیر سلامتی کنڈولیز رائس سے ملاقات کر رہے تھے کہ صدر بٹس وہاں آ نکلے۔ اگرچہ ان کا ایک ایک لمحہ طے شدہ پروگرام سے بندھا ہوتا ہے لیکن ”اچانک“ جسوت سنگھ کو سامنے دیکھ کر وہ بیٹھ گئے اور پھر چالیس منٹ تک بیٹھے رہے۔ اس دوران جسوت سنگھ کو وہ خط بھی صدر بٹس کے حوالے کرنے کا موقع مل گیا جو کچھ دیر پہلے وزیر اعظم واجپائی نے فیکس کیا تھا اور جس میں سری نگر اسمبلی کے واقعے کو بنیاد بنا کر کہا گیا تھا کہ ”بھارت کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا اور پاکستانی دہشت گردی کا خاتمہ ضروری ہو گیا ہے۔“ جسوت سنگھ نے اخبار نویسوں کو

بتایا کہ ہم نے کشمیر پر بات کی ہے اور امریکہ نے یقین دلایا ہے کہ ”القاعدہ کے بعد دہشت گردی کے دیگر مراکز پر حملے ہوں گے“ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے تصدیق کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ”پہلے مرحلے میں القاعدہ کے خلاف کارروائی ہوگی لیکن بھارت میں ہونے والی دہشت گردی سمیت برہمن کی دہشت گردی بہارا نشانہ ہے۔“

ناسازگار حالات کے دباؤ میں ہمیں بھی سری نگر کے واقعہ کی شدید مذمت کرنا پڑی ہے۔ اب ہمیں دہشت گردی اور تحریک حریت کی فلسفیانہ تشریح اور دونوں کے درمیان فرق کی باریک لکیر واضح کرنے کا مشکل مرحلہ درپیش ہوگا۔ ہمیں ثابت کرنا ہوگا کہ جمیش محمد، لشکر طیبہ، حزب المجاہدین اور دیگر جہادی تنظیمیں، القاعدہ سے مختلف ہیں لیکن لڑھکتے ہوئے لوگ لفظوں کی تشریح و تعبیر کا حق نہیں رکھتے۔ جس طرح امریکہ کے ثبوت مستند ٹھہرے ہیں اسی طرح بھارت کے شواہد بھی معتبر قرار پائیں گے جس طرح ہمیں الرشید ٹرسٹ اور حرکت المجاہدین کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا حوصلہ نہیں ہو اسی طرح ہم دوسری جہادی تنظیموں اور کل جماعتی حریت کانفرنس کی طرف بڑھنے والا ہاتھ بھی نہیں روک سکیں گے، بلکہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پیش قدمی کریں گے۔ معاملے کا ایک تشویشناک پہلو یہ بھی ہے کہ حوصلہ مند پاکستانی قوم پھول بھلیوں میں کھو گئی ہے اور بے یقینی کی دھند گہری ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ، صدر مشرف کی مشکلات میں اضافہ کر رہا ہے۔ اپنے ہر ناروا مطالبے کے ساتھ کسی پابندی کے خاتمے یا کسی قرعہ چھنے کی ری شیڈ ونگ کی خبر دے کر اس نے پاکستانی قوم کی خودی کو بھی جنس ہا زار بنا دیا ہے۔

کیا اب بھی وہ لمحہ نہیں آیا کہ ہم سارے جھگڑوں ساری عداوتوں اور ساری سیاسی چپقلشوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے قومی وحدت کا اہتمام کریں۔ رزم حق و باطل میں ریشم کی طرح نرم اور حلقہ یاراں میں فولاد بننے کی روش پر نظر ثانی نہیں ہونی چاہئے؟

[5-10-2001]

مجھے معاف کر دینا.....!

ذہن میں چار سو دوسووں اور واہموں کے جانے تن جائیں اور دل خوف سے جو جھل ہونے لگے تو میں اپنی یادداشتوں کی پونٹی کھول کر بیٹھ اور تھوڑی دیر کے لئے طالبان کے افغانستان کی طرف نکل جاتا ہوں۔

آج مجھے قندھار کا ایک بلند قامت اور وجیبہ و کلکلیل نوجوان یاد آ رہا ہے جس کے شاعرانہ جمال اور مومنانہ جلال نے ہم سب کو بہوت کر دیا تھا۔ اس کی شخصیت کا باکچمن، اسے دیکھنے والوں کو شاداب اور سننے والوں کو سیراب کر دیتا تھا۔ طالبان کے مخصوص ڈھیلے ڈھالے لباس، سیاہ گچڑی، گہرے براؤن رنگ کی واسکت، کندھے پر سیاہ چادر اور پاؤں میں ایک کھر درمی سی چپل پہنے، اس 28 سالہ جوان رحمان کا نام احسان اللہ احسان تھا۔ اس کی باتوں میں آبشاروں کا ترنم اور گلوں کی خوشبو تھی۔ میں آج بھی افغانستان کے جن کرداروں کے طلسم سے نہیں نکل پایا، ان میں احسان اللہ کا نام بہت نمایاں ہے۔

موسم بدلتا تو کہانی نکھی جائے گی۔ ایسے کرداروں کی کہانی جو اس مادہ پرست دنیا میں کسی اور سیارے کی مخلوق نظر آتے ہیں۔ جب مجھے مولانا سمیع الحق نے قندھار چلنے کی دعوت دی تھی تو میں نے پہروں ان سے بحث کی تھی۔ طالبان کی کوئی بھی ادا میرے لئے اتنی پرکشش نہ تھی کہ میں ایک بے آب و رنگ سفر کے لئے نکل کھڑا ہوتا لیکن آج میں پیچھے پلٹ کر گزر جانے والے دنوں پر ایک نظر ڈالتا اور یہ شعر گنگناتا ہوں کہ۔

کچھ عمر گریزاں سے میرے ہاتھ نہ آیا

ہر لمحہ ترے گوشہ داماں کی طرح تھا

تو قندھار اور ہرات میں طالبان کے ساتھ گزرے ہوئے شب و روز اس عمر گریزاں کا قیمتی

اعلاش تلتے ہیں۔ ان شب و روز میں طبیعت پر بوجھ بن جانے والی ساعتیں بھی تھیں اور طالبان کے مخصوص انداز فکر و عمل سے خفا ہو جانے والی گھڑیاں بھی، لیکن منفرد تجربوں اور ناقابل یقین داستاںوں نے اس مختصر سفر کو یادگار بنا دیا ہے۔

چمن کی سرحد پار کرتے ہی ہم طالبان کی لائی ہوئی گاڑیوں میں منتقل ہو گئے۔ ہم چار اخبار نویسوں کے حصے میں ایک گاڑی آئی۔ ہم سب کو طالبان، ان کے نظام حکومت، ان کے انداز کار اور خاص طور پر ان کی ”شان نزول“ کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی آرزو تھی۔ ہم اپنے ڈرائیور پر مسلسل سوالوں کی چاند ماری کر رہے تھے اور وہ حسب توفیق معلومات فراہم کر رہا تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ ”طالبان کے زیر قبضہ علاقے میں مراتب اور مناصب کی تیز اور عہدوں کا کروفر ناپید ہے۔ صوبے کا والی ہے یا کسی دفتر کا معمولی اہلکار، کسی میں کوئی فرق نہیں، نہ کوئی آن بان، نہ پروٹوکول، نہ ہو بیجو کی صدائیں، نہ سائرن، نہ وی آئی پی کلچر۔“ ہم ایک دوسرے کو دیکھتے اور مسکراتے رہے۔ ہمیں یقین تھا کہ قندھار پہنچتے ہی اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی اور کپ باز ڈرائیور کا پول کھل جائے گا۔

میں نے اس کا نام پوچھا۔

”ہدایت اللہ“ وہ بولا۔

میں نے دوسرا سوال کیا: ”ہدایت اللہ تم ڈرائیوری کے علاوہ بھی کوئی کام کرتے ہو؟“
 ”جی میں قندھار کا ڈپٹی کمشنر اور میئر بھی ہوں“ اس نے نظریں خستہ حال سڑک کے گڑھوں پر مرکوز رکھتے ہوئے جواب دیا۔

یہ طالبان کی جادوگری سے ہمارا پہلا تعارف تھا لیکن آج ہدایت اللہ جیسے کتنے ہی کرداروں کے جھرمٹ میں احسان اللہ احسان کا چہرہ سب سے جدا، سب سے نمایاں دکھائی دے رہا ہے۔ قندھار کے جنگ زدہ ریٹ ہاؤس کے ایک کمرے کے فرش پر بیٹھے میں نے جادو بیاں احسان اللہ احسان سے پوچھا تھا۔

”کہا جاتا ہے امریکہ آپ کی پشت پر ہے۔“

روشن چہرے اور چمکتی آنکھوں والے جوان رعنائی جو کچھ کہا تھا وہ برسوں قبل ایک جریدے میں شائع ہو چکا ہے لیکن آج اسے دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ اس نے کہا تھا:

”جن مفاد پرستوں کے مفاد پر زور پڑی ہے اور جن غمخواروں کی غمخوار گردی کا خاتمہ ہوا ہے وہ اس طرح کی انواہیں اڑا رہے ہیں۔ ہمارے خلاف ایک منظم پراپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ امریکہ تو اسلام کا نام سننے کا روادار نہیں۔ وہ تو مسلمانوں کا رویوں سے بھی بڑا دشمن ہے۔ وہ قرآن و سنت کے کسی ایک حکم کو بھی قانون ماننے پر آمادہ نہیں۔ پورے کے پورے دینی نظام کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ ہم امریکیوں سے مدد لینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آج امریکہ اللہ کی اس زمین پر خدائی کا دعویٰ اور بن بیٹھا ہے۔ وہ اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف ہے اور دین کا نام لینے والی قوتوں کو ہزپ کرنا چاہتا ہے۔ کیا کوئی بھیڑ یا کسی بھیڑ کی پرورش کر سکتا ہے؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک امریکہ ہے، کسی اسلامی ملک میں مکمل اسلامی نظام نہیں آنے دے گا۔ اس لئے ہم روس کے خاتمے کے بعد امریکہ کو اپنا دشمن نمبر ایک خیال کرتے ہیں۔ انشاء اللہ وہ وقت آئے گا کہ ہم امریکہ کو اس کی سازشوں کا دندان شکن جواب دیں گے اور اسے روس والے انجام سے دوچار کریں گے۔ امریکہ اور اس کا سامراجی نظام تباہ ہو کر رہے گا۔“

”آپ اس بات پر پختہ یقین رکھتے ہیں؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

”جی ہاں! ہم اللہ اور اس کی قدرت پر پورا ایمان رکھتے ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ یہ اسی قادر مطلق کی قدرت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک پتھر پر لائی ماری تو بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ امریکہ اور دنیا کی ساری قومیں مل کر پتھر سے پانی کی ایک بوند بھی نہیں نکال سکتیں۔ یہ اللہ ہی کی قدرت تھی کہ پتھر سے حضرت صالح علیہ السلام کے لئے حاملہ اونٹنی پیدا کی گئی۔ ہمیں اللہ کی قدرت اور مظلوم انجانوں کی جرأت و ہمت پر پورا یقین ہے۔ ہمارے امیر المؤمنین ملا عمر کو اللہ تعالیٰ نے چنا ہے اس کے پنے ہوئے بندے کا کام نہیں ہو سکتے۔“

آج پہاڑوں جیسے عزم اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسے ایمان و یقین کا مالک احسان اللہ احسان اس دنیا میں موجود نہیں۔ ملا عمر کا رفق و ہدم 30 سال کی عمر میں کسی معرکے میں جاں بحق ہو چکا ہے۔ معلوم نہیں اس جادو ہیاں خطیب اور سرفرد جوان کی قبر کہاں ہے؟ ہے بھی یا نہیں؟ ممکن ہوتا تو میں اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو کر اسے کہتا..... ”یا عزیز! اٹھو! افغانستان کو تمہارے صحرا انگیز خطیبوں، تمہارے قوی باز دوؤں اور تمہارے عزم بیکراں کی ضرورت ہے۔ وہ وقت آ گیا ہے جس کا ذکر تم نے چھ سال قبل قندھار کے جنگ زدہ ریٹ ہاؤس کے ایک کمرے میں کیا تھا۔“

فرعونی قوتوں کے بحری بیڑے، ایٹمی آبدوزیں اور بمبارطیارے امیر المؤمنین کے تعاقب میں، تمہارے افغانستان کی دہلیز تک آن پہنچے ہیں۔ کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔ لیکن مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ میں ڈھیروں مجبور یوں اور معذور یوں میں جکڑا ہوا ہوں۔ امریکہ نے ایسے ”ٹھوس“ ثبوت بھی فراہم کر دیئے ہیں جو تمہارے خلاف دہشت گردی کی ایف آئی آر کٹوانے کے لئے کافی ہیں۔ مجھے معاف کر دینا۔ میں اپنے گھر کے کسی گوشے میں بیٹھ کر تمہارے لئے دعائیں مانگوں گا۔ اگر کوئی آس پاس دیکھنے والا نہ ہو اتور وہ بھی لوں گا۔“

[6-10-2001]

دوستوں کی آمد آمد

اس بات کو اب کئی سال ہو چکے ہیں۔

افغان جہاد کا اہم ترین مرحلہ کامیابی سے ہمکنار ہو چکا تھا اور زخموں سے نڈھال روس اپنے بچے کھچے لاد لشکر کو سمیٹ کر دریاے آمو کے اس پار جا چکا تھا۔ افغانستان کی سلگتی بستیوں سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا تھا کہ ”ملل غنیمت“ کی تقسیم ایک نئی افتاد بن گئی۔

دنیا کی ایک سپر پاور کو تخت لخت کر دینے والی سات جماعتی اتحادی منزلوں کی طرف قدم بڑھانے کے بجائے خرافات میں کھو گیا۔ ہر تنظیم نے سارے ثمرات اپنی جھولی میں سمیٹنے اور دوسروں کو محروم رکھنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اسلحہ کی فراوانی تھی اور لبو ابھی تک گرم تھا۔ جہاد افغانستان کی منصوبہ سازی کرنے والی پاکستانی قیادت رکھ بن کر بہاولپور کی خاک کا حصہ بن چکی تھی۔ مجاہدین کو ایک معین لقمہ کے اندر رکھنے اور متعین راستے پر چلانے والا کوئی نہ تھا۔ ایسا اتفاقاً ہوا یا اس کے پیچھے بھی کوئی طے شدہ حکمت عملی کارفرما تھی؟ بہر حال یہ ایک المیہ تھا کہ جب افغانستان سیاسی استحکام، تعمیر نو اور ترقی جمن کے مرحلے میں داخل ہوا تو دس برسوں سے افغان جہاد پر تنی چھتری میں اچانک اتنے چھید پڑ گئے کہ وہ کسی نامہربان موسم کا راستہ نہ روک سکی۔ روسیوں کے خلاف لڑنے والے مجاہد کمانڈروں میں سے کوئی بھی اپنے عسکری بائکپن سے دستکش ہونے اور اپنی کلواری نام میں ڈالنے پر آمادہ نہ ہوا۔

1980ء کے اوائل میں پاکستان کی کوششوں سے ہاون لڑا کا گروہوں میں بٹے جو افغان، سات جماعتی اتحاد کے پرچم تلے اکٹھے ہو گئے تھے، روس کے پسپا ہوتے ہی تاش کے ہاون چوں کی طرح بکھر گئے۔ دیت نام میں پچاس ہزار سپاہیوں کی ہلاکت کا صدمہ بھلانے اور پندرہ لاکھ افغانوں کے لبو سے اپنی پیشانی کا داغ ندامت دھونے کے بعد امریکہ نے اپنے گھر کی راہ لی اور

پھر کبھی پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ افغانستان کی مجلسی ہوئی کھیتیاں کونسی فصل آگاری ہیں اور ایک طویل جنگ کی بھٹی کا بندھن بننے والے افغان کس حال میں ہیں۔ 11 ستمبر سے اب تک ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں ساری دنیا کی نظریں اس نشانے پر لگی ہیں جس کی طرف امریکہ اشارہ کر رہا ہے۔ ساری دنیا اسے جدید ساز و سامان جنگ کی تجربہ گاہ بنانے کے منصوبے بنا رہی ہے لیکن پچھلے گیارہ سالوں کے دوران لاکھوں بیواؤں، یتیموں، معذوروں اور افلاس زدہ لوگوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی فرصت کسی کو نہ تھی۔ محض روس کی ہزیمت سے دلچسپی رکھنے والی قومیں ا تعلق ہو گئیں اور جہاد کے بعد افغانستان کی نئی صورت گری کا آرزو مند قبیلہ سی 130 کے تصور میں جموں تک دیا گیا۔ طالبان آسمانوں سے نہیں اترے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنا لڑکپن اور جوانی آتش و آہن کے کھیل کی نذر کر دی۔ ان کی زندگیوں میں سنہری خوابوں اور رومانوی آرزوؤں کی خوشبو بکھیرنے والے شب و روز آئے ہی نہیں۔ یہ حکمت یار، یونس خالص، مجددی، نبی محمدی، ربانی، سیاف اور گیلانی کی قیادت میں لڑتے اور پہاڑوں کے ٹھیب و فراز میں روسی فوج سے دست و گریباں رہے اور جوانی کا دلکش موسم دہے پاؤں قریب کی کسی گھاتی سے ہوتا دور نکل گیا۔

صحت اللہ مجددی نے افغانستان کی صدارت سنبھالی۔ شاہین صفت جوانوں کو نئی صبح کے قدموں کی چاپ سنائی دی لیکن وہ صبح طلوع نہ ہو سکی۔ سیاسی مصلحتوں نے مجددی کو دو ستم کے قریب لاکھڑا کیا۔ پروفیسر برہان الدین ربانی تخت نشین ہوئے تو مضطرب نوجوانوں نے دیکھا کہ روسیوں کے دست و بازو بننے والے جرنیل، ربانی کے ایوان اقتدار کے ستون بن گئے۔ تب ان جوانوں کو چہار اسیاب میں مورچہ زن جرنی کمانڈر حکمت یار میں کشش محسوس ہوئی لیکن کچھ ہی دنوں بعد حکمت یار ایک ایسی ”شورائے ہم آہنگی“ کا حصہ بن گئے جس میں مزارگی اور دو ستم بھی شامل تھے۔ یہ تھا وہ پس منظر جس نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر مدرسوں سے میدان جنگ میں آنے والے طالبان کو مایوس کر دیا۔ اس مایوسی نے انہیں اکٹھا ہونے اور ملا عمر نامی جہاد کی قیادت میں ایک نئے عہد کا آغاز کرنے کا عزم دیا اور جب وہ چلے تو راستے کشادہ ہو گئے اور منزلیں ان کے قدموں تلے پھٹی چلی گئیں۔ قدم ہار سے مزار شریف تک نوے فیصد سے زیادہ علاقے پر قبضہ کرنے والے طالبان کو اپنے پورے سفر کے دوران شاید ہی کسی قابل ذکر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ وہ جدھر گئے تو اسیں ان کی آرزوؤں کی طرف اٹھنے کے بجائے ان کے قدموں میں ڈھیر ہوتی

گئیں۔ بد امنی، فساد اور افراتفری کے ستائے ہوئے عوام کو برسوں بعد ایک ایسا نظام مہسر آیا جس میں امن و امان کی ضمانت اور انصاف کی فرمائندگی تھی۔

افغانوں کو ایک عشرے تک بندوقیں، توہین، مشین گنیں اور سنٹر فرام کرنے والوں کو یہ خیال ہی نہ آیا کہ اب انہیں امن و خوشحالی کی ضرورت ہے۔ انہیں روٹی چاہئے۔ ان کے بچے کھلونے مانگتے ہیں۔ وہ اچھی تعلیم کے طلب گار ہیں۔ انہیں شفا خانوں کی حاجت ہے۔ ذرائع رسل و رسائل، فیکشریوں، کارخانوں، درس گاہوں اور تفریح گاہوں کی ضرورت ہے۔ بچپن سے براہ راست ادویہ عمری کو پہنچ جانے والے طالبان، اپنی بستیوں سے باہر آ کر دور سے آنے والے راستوں کو گھومتے رہے کہ شاید جنگ کے دنوں کے پرانے ساتھی، کبھی لوٹ آئیں اور ان کے زخموں پر مرہم لگانے کی کوشش کریں لیکن سالہا سال تک کسی قافلے کے آثار دکھائی نہ دیے۔

اور اب خبر آئی ہے کہ برسوں بعد بھولے سرے دوستوں کے لدے پھندے کارواں بھولی بسری سرزمین کی طرف واپس آ رہے ہیں۔ بھوک سے نڈھال افغان بچے، جوان، بوڑھے، یتیم اور معذور، آنے والوں کی زاہ دیکھ رہے ہیں۔ بم پھینکنے والے سینکڑوں طیارے، کیمیائی ہتھیاروں سے لیس آہدوڑیں، تیز دھار سنگینیں ہڑھائے کمانڈوز اور مہلک ہتھیاروں سے لدے بھری بیڑے لکھ لکھ قریب تر آ رہے ہیں۔ بھول جانے والے دوست بالآخر لوٹ آئے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں۔ ناقوس بجنے کو ہے۔

[7-10-2001]

جاگتی آنکھوں کے خواب

کیا کیا فریب دل کو دیئے اضطراب میں
ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

شاعرانہ واردات عشق و محبت میں ایسے لمحے قابل معافی ہوتے ہیں جب اپنے دل کے اضطراب سے مجبور ہو کر انسان اپنے آپ کو فریب دیتا اور درد و پوار کے ساتھ ہوا کے کسی آوارہ جھونکے کے لمس کو بھی محبوب کے دستِ حنائی کی دستک خیال کر بیٹھتا ہے، لیکن ٹھوس اور تلخ حقائق کی دنیا میں جب تو مومن کے مقدر کا فیصلہ کرنے کی گھڑی آجائے تو دانش و بصیرت کی ایک ایک رتق کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسے فیصلے کرنا ہوتے ہیں جو حال کی ہنگامی مجبوریوں کے ساتھ ساتھ مستقبل کے دیرپا تقاضوں پر بھی پورا اتریں۔ ایسے تاریخ ساز لحاظ میں جاگتی آنکھوں کے خوابوں کو پس پشت ڈال کر ان حقیقتوں کو دیکھنا ہوتا ہے جو بہر حال اپنا وجود رکھتی ہیں اور انہیں نظر انداز کر دینے سے آگے کا سفر زیادہ کٹھن اور زیادہ صبر آزما ہو جاتا ہے۔

انجینئر گلبدین حکمت یار نے ”نوائے وقت“ سے اپنے ایک تازہ انٹرویو میں ہمیں توجہ دلائی ہے کہ ہم معاملات طے کرتے وقت ماضی کے تجربات اور امریکہ کے رویوں کو پیش نظر رکھیں۔ انہوں نے کہا ہے:-

0..... ”امریکہ، افغانستان پر قبضہ کر کے اسے بین کیمپ بنا کر وسط ایشیا میں گھسنا چاہتا ہے تاکہ وہ پاکستان، چین اور روس تک اپنا حلقہ اثر بڑھا سکے۔“

0..... ”امریکہ سے پاکستان کا تعاون تحریک آزادی کشمیر پر بھی برے اثرات مرتب کرے گا۔ کشمیر میں جاری آزادی کی تحریکیں یہ سوچنے پر مجبور ہو سکتی ہیں کہ اگر پاکستان نے اپنے دوست افغانوں سے آنکھیں پھیر لیں تو ان کا مستقبل بھی غیر یقینی ہوگا۔“

0..... ”پاکستان کے ممکنہ تعاون کے عوض امریکہ اسے کچھ نہیں دے گا۔ وہ صرف پاکستان کو ہز باغ

دکھا رہا ہے۔ پاکستان اس جھانسنے میں نہ رہے کہ امریکہ مسئلہ کشمیر میں اس کی مدد کرے گا۔ یہ مسئلہ جب بھی حل ہوا، بھارت کے حق میں ہوگا۔“

ایک اور قومی اخبار سے انٹرویو میں حکمت یار نے اس بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

”مجھے پاکستان کے رویے سے مایوسی ہوئی ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ پاکستان اپنے آپ کو افغانستان کے قبضے میں کیوں اتنا لٹوٹ کر رہا ہے؟ کیا اس کے لئے مسئلہ کشمیر کافی نہیں ہے؟ میں پاکستانی حکام کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ وہ بھرپور تعاون کے باوجود امریکہ سے اس بات کی توقع نہ رکھیں کہ وہ کشمیر کے بارے میں ان کے موقف کی حمایت کرے گا۔ مجھے تو یہ بات بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ پاکستان امریکی دباؤ میں کیوں آ رہا ہے؟ ایران نے امریکہ کو افغانستان پر حملے کے سلسلے میں کسی قسم کا تعاون فراہم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر کسی ملک کے تعلقات امریکہ سے اچھے ہیں تو وہ اس پر دباؤ ڈال کر من مانی کر لے گا اور اگر کسی ملک کے ساتھ تعلقات اچھے نہیں تو وہ چپ ہو جائے گا اور دباؤ ڈالنے کی جرأت نہیں کرے گا۔“

حکمت یار کے تجزیے سے کئی طور پر اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ ہم بہر حال نہ مرد کہستانی ہیں نہ ہندہ صحرائی۔ آسانٹوں کی آلائشیں ہماری زندگی کے ایک ایک لمحہ کا حصہ ہیں۔ ہمیں ایک ایسے فیصلے کی ضرورت تھی جو مشتعل اور غصے سے پھنکارتے ہوئے سمجھنے کی پہلی نکر سے بچائے۔ وہ لٹوٹ گیا اور ہمیں ایک ناگہانی افتاد کی منہ زور یلغار سے پہلو بچا کر اکٹھی ہوئی سانسیں بحال کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اب ہمیں خوف کے آئینے سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے حقیقت پسندی کے ساتھ جائزہ لینا چاہئے کہ امریکہ سے ہماری وابستگی اور تعاون کا ”حدود اربعہ“ کیا ہونا چاہئے اور جس ”وسیع تر قومی مفاد“ کے لئے ہم نے ایک نازک گھڑی پر نازک فیصلہ کیا ہے، اسی ”وسیع تر قومی مفاد“ کے تحفظ کے لئے ہمیں ایک ناقابل اعتماد ”دوست“ کے ساتھ دوستی کو محض تعلق داری تک محدود رکھنا چاہئے یا عشق و وارفتگی سے مغلوب ہو کر قومی مفادات کی ساری پونجی اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دینی چاہئے۔

ہماری یہ شرائط کہ دہشت گردی کی مہم میں افغانستان جانے والے ٹروپس میں اسرائیل اور بھارت کے ٹروپس شامل نہ کئے جائیں یا اس مہم پر اقوام متحدہ کی مہر لگوائی جائے یا اس دوران بھارت ہم سے چیخبر چھانڈ نہ کرے، عبوری نوعیت کی ہیں۔ امریکہ خوشدلی سے انہیں تسلیم کر لے

گا۔ زخموں سے چور ہماری معیشت کو بھی فرسٹ ایڈ امداد کی مرہم پٹی میسر آ سکتی ہے۔ لیکن ان سارے اقدامات کی ڈوری، افغانستان میں امریکی عزائم کے کھونٹے سے بندھی ہے۔ جو نجی امریکہ اپنے فوری اہداف سے فارغ ہوا اور اسے وسط ایشیا کی فیصلوں پر کند ڈالنے کے لئے ہمارے زینے کی ضرورت نہ رہی، اس کے تیور بدل جائیں گے۔

کیا ہم بھول سکتے ہیں کہ کل تک ہم گردن زدنی تھے؟ 12 اکتوبر کے بعد پابندیوں میں جکڑے ہوئے پاکستان کو نجی پابندیوں کے شکنجے میں کس دیا گیا کہ جمہوریت رخصت ہو گئی ہے۔ برطانیہ کی خانہ زاد دولت مشترکہ نے ہمیں اچھوت قرار دے دیا۔ جاپان کی پیشانی پر شکنوں کا گھٹنا جال تن گیا۔ کلنٹن بھارت یا تراقے باوجود چند گھنٹوں کے لئے بھی پاکستان آنے پر آمادہ نہ تھے اور جب آئے بھی تو نصیحتوں اور تنبیہوں پر مشتمل ایک کرخت خطبہ ارشاد فرما کر واپس چلے گئے۔ تب انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ جنرل مشرف ہوائی اڈے یا ایوان صدر کے دروازے پر ان کا استقبال کریں۔ یورپی یونین کے کارندے کھلے عام دھمکیاں دینے لگے اور آزاد اور خود مختار ملک کو اقوام عالم کی بزم میں "طاعون زدہ مریض" کی طرح الگ تھلک کر دیا گیا۔

آج کچھ بھی نہیں بدلا۔ وہی مشرف ہیں اور وہی پاکستان، لیکن غصے سے دہکتے ہوئے رخساروں پر اچانک محبت کی شفق کھل اٹھی ہے۔ جن کے پاس ہمارے لئے سنگ انعام اور تیر دشنام کے سوا کچھ نہ تھا، ان کے ہونٹ پھول بکھیرنے لگے ہیں۔ کل تک ہماری رگ جاں سے لہو کی ایک ایک بوند نچوڑنے والے ہماری بلائیں لے رہے ہیں اور ان کے دلوں میں وصال یار کی ترنا اگڑائیاں لینے لگی ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ خوش رنگ موسم جلد گزر جائے گا۔ پھر ہم ہوں گے اور وہی نامہرباں رہیں۔ ہماری حکمت عملی کا یہ نکتہ کبھی پس منظر میں نہیں جانا چاہئے کہ ہم زمانے بھر کے لئے کتنی ہی جنگیں کیوں نہ لڑتے رہیں، ہمیں اپنی ہمتا اور اپنے وقار کی جنگ تن تہاڑا ناہوگی۔

پاکستانی عوام کے دلوں میں یہ خدشہ نیزے کی اپنی کی طرح ترازو ہے کہ دہشت گردی کی حالیہ مہم سر کرنے والے لشکر کا ایک نہ ایک دستہ، آج یا کل یا پرسوں کشمیر کی وادیوں میں دکھائی دے گا۔ حکمت یار کی تمبیہ نے اس خلش میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

جانتی آنکھوں کے خواب اکثر ایسی کرہنک تعبیریں لاتے ہیں، جو آنکھیں بند کرنے کے باوجود کبھی سلائییاں بن جاتی ہیں۔

”انصاف“..... افغانستان کی دہلیز پر

صدیوں سے ایک ہی منظر دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرائی ہیں۔ نہ جانے یہ آزار مسلسل کب ختم ہونے میں آئے گا؟

www.KitaboSunnat.com

11 ستمبر کو جارج ڈبلیو بوش نے اعلان کیا تھا کہ ”ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پینٹا گان کونشانہ بنانے والوں کو نشان عبرت بنا دیا جائے گا۔ اس دہشت گردی کا ارتکاب کرنے والوں کو ”انصاف“ کے کٹہرے میں لایا جائے گا اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو ”انصاف“ کو ان تک پہنچا دیا جائے گا۔“ لگ بھگ ایک ماہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اسامہ بن لادن کو انصاف کے کٹہرے تک نہیں لایا جا سکا اس لئے 7 اور 8 اکتوبر کی درمیانی شب، جب افغانستان کی لمبی پٹی بستیاں، اکتوبر کی خشک چادر لپیٹے نیند کی آغوش میں جا رہی تھیں تو چیخ چنگھاڑتا انصاف ان کی منڈیروں پر اتر آیا۔ پچاس کروڑ میزائلوں، پچیس لڑاکا طیاروں اور پندرہ ہزاروں کے جلو میں نازل ہونے والے انصاف نے بیک وقت کاٹل، جلال آباد، قندھار اور مزار شریف کے دروازوں پر دستک دی۔ دنیا کی سب سے قوی، سب سے متمول اور سب سے ترقی یافتہ قوم نے شکستہ حال افغانستان کو ”انصاف“ فراہم کرتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کے پندرہ لاکھ جبری جوانوں کے لبو کی سرخی نے امریکہ کے عارض و رخسار کو رعنائی بخشی اور اسے ”سینہ عالم“ کی مسند پر بٹھایا۔

مغرور بوش نے اپنی مسرور قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”طالبان کو حکم عدولی کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔“ ٹونی بلینر نے اعلان کیا کہ ”ہمارا الٹی میٹم نہ ماننے والے طالبان اب نتائج کا سامنا کریں۔“ ملا عبدالسلام ضعیف نے کہا کہ ”امریکہ کے اتحادی دراصل ششی بھر غلام ہیں جو کبھی کامیاب نہیں ہوں گے اور امریکہ کو ان حملوں کی ایسی قیمت ادا کرنا پڑے گی جس کا وہ اس وقت تصور بھی نہیں کر سکتا“ اور افغانستان کے کسی پہاڑ کی اوٹ میں بیٹھے منحنی سے جسم والے اسامہ نامی شخص نے کہا کہ ”میں قسم کھاتا ہوں، جب تک فلسطین میں امن نہیں ہوگا اور جب تک عالم اسلام

امریکی دہشت گردی سے آزاد نہیں ہوگا، امریکی بھی چین کی نینڈ نہیں سوئیں گے۔“

انصاف کی پالکی، بحری بیڑوں، ایٹمی آبدوزوں اور بمبار طیاروں پر لادکر ”بھرموں“ تک پہنچانا امریکہ کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ چین، کوریا، گوسے مالا، انڈونیشیا، کیوبا، کنگو، ویرو، لاؤس، ویت نام، کمبوڈیا، گرینڈا، لبنان، لیبیا، ہیٹسلو آڈور، نکاراگوا، پانامہ، سوڈان، افغانستان، یوگوسلاویہ اور عراق اس طاغوتی انصاف کی کئی کئی قسطیں وصول کر چکے ہیں۔ یہ صرف دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دنوں کی کہانی ہے۔ اس عرصے میں امریکہ نے دنیا بھر کے ہیں ممالک میں بغاوتیں کرائیں اور کم و بیش نصف درجن سربراہان حکومت کو ہلاک کیا۔ پرل ہاربر کو بھانہ بنا کر ”روز ویلٹ“ نے ہیروشیما اور ناگاساکی کو ذراؤ نے خواب بنا دیا تھا اور اب 11 ستمبر کو بھانہ بنا کر انصاف کی سوغات بانٹنے والے بٹش نے ان انسانوں کو چنا ہے جن کے آباؤ اجداد نے انہیں صرف ایک ہی سبق دے رکھا ہے۔ ”آزادی یا موت“ امریکی انصاف کا کم نظر دیوتا، اکثر اپنا ہدف بھول جاتا اور اس کا نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔ اس نے قذافی کی گردن اڑانا چاہی تو ان کی معصوم بچی لہو میں نہا گئی۔ اس نے صدام حسین کو لقمہ بنانا چاہا اور لیلیٰ بنت عطار نامی ایک بے گناہ فنکارہ کو ہڑپ کر گیا۔ اس نے دو سال قبل اسامہ بن لادن کا رشتہ جاس منقطع کرنے کی ٹھانی اور میں بے گناہ انسانوں کے پر خچے اڑا گیا۔ اس نے سوڈان کے ایک ”خونفک کیمیکل پلانٹ“ کا نشانہ لیا اور اوویات بنانے والی ایک فیکٹری کو کھنڈر بنا گیا اور اب انصاف کا یہ دیوتا استبداد افغانستان کے پہاڑوں کے پیچ و خم میں اسامہ کو ڈھونڈنے لگا ہے لیکن خبر آئی ہے کہ صرف کابل میں عورتوں اور بچوں سمیت کم از کم سینتیس افغانی انصاف کی جینٹ چڑھ گئے ہیں۔ ان میں اس شخص کا پورا کنبہ بھی شامل ہے جو کابل کی ایک نواحی مسجد میں پانچ وقت ”اللہ اکبر“ کی صدا بلند کرتا تھا۔

میں نے 7 ستمبر کے کالم میں لکھا تھا کہ ”بھول جانے والے دوست بالآخر لوٹ آئے ہیں۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے کو ہیں۔ ناقوس بجنے کو ہے“ اور 7 ستمبر ہی کو جب میں نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ ناقوس بج چکا ہے۔ یہ رات کا اولین پہر تھا اور سی این این کابل اور قندھار کی فضاؤں میں چھوٹی چھلچھلیاں مسلسل دکھا رہا تھا۔ دنیا بھر کے نیٹ ورک بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ کوئی بتا رہا تھا کہ بحیرہ عرب میں کھڑی آبدوزوں سے میزائل داغے گئے ہیں۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ کارروائی طیارہ بردار بحری جہازوں سے اڑان لینے والے بمباروں کی

ہے۔ کسی کا کہنا تھا کہ وسط ایشیائی ریاستوں کے ہوائی اڈے استعمال ہوئے ہیں۔ وائس آف جرنی کا کہنا تھا کہ جیکب آباد کا شہزادہ اترپورٹ، کونڈہ کاسوئی اترپورٹ اور شمالی علاقے کا سکروہ اترپورٹ امریکہ کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ پاکستانی ذرائع نے اس کی تردید کی ہے لیکن یہ خبر حصد قدح ظہری ہے کہ طیارے تھے یا کروزمیزائل، میری فضاؤں سے ہوتے ہوئے قدح ہار، کابل، جلال آباد اور مزار شریف پہنچے اور معصوم آبادیوں پر آگ برسا گئے۔ مجھے فلسطین، کشمیر، چیچنیا، کوسوو اور بوسنیا کی یاد آئی اور میرے اعصاب چنچنے لگے۔

سی این این مسلسل کابل اور قدح ہار کی فضاؤں میں چھوٹی پھلجھریاں دکھائے جا رہا تھا۔ وہی منظر، وہی تصویر، وہی آگ، وہی خون۔ قریب، فرطادہ، طرابلس، بغداد، بیت المقدس، کابل، قدح ہار، ہر گام اور ہر پام پر صدیوں پرانا ایک ہی منظر کندہ ہے۔ یہ آزار مسلسل کب ختم ہوگا؟ یہ منظر کب بدلے گا؟

مجھے نہ جانے کیوں قاسمی کا ایک بھولا بھرا شعر یاد آ گیا:

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا

میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

کمرے کی جان لیوا گھٹن نا قابل برداشت ہو گئی تو میں باہر کھلی فضا میں نکل گیا۔ اکتوبر کے

دھلے دھلائے آسمان پر ستارے دک رہے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ ممکن ہے انہی ستاروں

کے پھول بیج، عین میرے سر کے اوپر کوئی کروزمیزائل، انصاف کو بغل میں لئے، طالبان کے

تقاب میں کابل کی طرف جا رہا ہو۔

کشاہد محسن کی خشک فضا اور ڈھیروں آکسیجن کے باوجود میرا دم ایک بار پھر ٹھٹھے لگا۔

[10-10-2001]

طالبان کی تنصیبات

امریکی حکام کا کہنا ہے کہ اب افغانستان کے آسمان ان کی مٹھی میں ہیں، ہوائی اڈوں کے پیر ہن چاک کئے جانے چکے ہیں، رن وے نا کارہ بنا دیئے گئے ہیں، کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم دم توڑ چکا ہے، راڈ اوروں کی آنکھیں پھوڑ دی گئی ہیں اور طالبان کی عمر رسیدہ توپوں کی کارکردگی بوزھوں کی تعبیر آمیز کھانسی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ بحیرہ عرب کے نیلگوں پانٹوں سے کوہ ہندو کش کی برف پوش چوٹیوں تک اب امریکی فضائیہ کا تاج ہے۔ اتحادی افواج، رات کی تاریکی ہو یا دن کا اجالا، کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے، افغانستان کے کسی بھی گوشے میں کسی بھی ہدف کو نشانہ بنا سکتی ہیں۔ انہیں کسی طرف سے کسی نوع کی مزاحمت کا خدشہ نہیں۔ آسمان فتح ہو چکے ہیں۔

لیکن مغربی ذرائع ابلاغ کے جن مبصرین کے چہرے کل تک گلنار ہو رہے تھے، آج ان کی پیشانیوں پر حیرتوں کے باب کیوں رقم ہیں؟ شاید وہ اس آشوب کا شکار ہیں کہ افغانستان کے طول و عرض میں خوف و ہراس کی دو لہر کیوں نہیں اٹھی جس نے گیارہ ستمبر کے بعد سے امریکہ کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ فلوریڈا میں ایک شخص کی موت کے بعد کسی اٹھنی جڑوے کی دہشت نے سپر پاور کی راتیں بے خواب کر رکھی ہیں، انہیں چلتے پھرتے، مارکیٹوں میں شاپنگ کرتے، دفتروں میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے، ہر آن یہ خوف گھیرے رہتا ہے کہ نہ جانے کس شیلف کے پیچھے یا کس مانیٹر کی سکرین سے لمبی داڑھی والا اسامہ برآمد ہو جائے۔ سی این این اور بی بی سی پر امریکیوں کے انٹرویوز دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خوف کی صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔

افغانستان کی جنگ کی منصوبہ بندی کرنے والے امریکہ کے عسکری ماہرین کا خیال یہ تھا کہ جب چالیس ممالک کی مشترکہ قوت افغانستان کے دروہام سے ٹکرائے گی تو اس کے پرچھے اڑ جائیں گے اور اب سحر زدہ امریکی سوچ رہے ہیں کہ چار دن اور چار راتوں سے کروڑ میزائلوں اور

بھاری ہموں کی مار کھانے اور اپنی ساری تنصیبات خاکستر کروالینے والے طالبان کے معمولات حیات میں ذرہ برابر فرق کیوں نہیں آیا؟

شاید جارج بش کی قوم کبھی اس سوال کا جواب نہ پاسکے۔ اس نے ابھی تک کوہساروں کی آغوش میں پلنے والے ان بندگان خدا کو پہچانا ہی نہیں، جو اکیسویں صدی میں بھی نان جوین کھاتے اور ”بازوئے حیدر“ رکھتے ہیں۔ امریکہ کے لوگ جس موت سے خوفزدہ ہیں، یہ اس موت کے لئے دیوانہ ہوئے جا رہے ہیں۔ سی این این کا کہنا ہے کہ ملا عمر کے ”ہاؤسنگ کمپلکس“ کو نشانہ بنایا گیا ہے..... انہیں کون سمجھائے کہ ملا عمر تو ایک ٹوٹے پھوٹے خستہ جاں سے مکان میں رہتا ہے۔ وہ ایک پتھر کو سر ہانہ بنا کر کھر درمی زمین پر گہری بیٹھی نیند سو سکتا ہے اور اس کے اشارہ پر جانیں بچھا کر کے لے سکتے ہیں۔

بش نے تازہ ترین ارشاد میں کہا ہے کہ یہ جنگ ایک عشرے تک جاری رہ سکتی ہے۔ یقیناً رہ سکتی ہے۔ امریکہ کی تجوری لبالب بھری ہے اور اس کا اسلحہ خانہ ساری دنیا کو بھسم کرنے کے لئے کافی ہے۔ اڑھائی لاکھ مربع میل پر محیط افغانستان اس کی ایک ریاست ”نیکاس“ سے بھی چھوٹا ملک ہے۔ اس کے کچے گھر وندوں کو پیوند خاک کرنا کونسی مشکل بات ہے۔ امریکہ چاہے تو افغانستان کے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک میزائلوں کی ایسی فصل بوسکتا ہے جو آنے والی صدیوں تک پھل دیتی رہے۔

لیکن کیا وہ اڑھائی کروڑ جواں مردوں کی اس قوم کو جھکا سکتا ہے؟ کیا امریکی مائیں ”ملا ملک“ نامی افغان جیسا سپوت پیدا کر سکتی ہیں جس نے اپنے زخمی اعضا اپنے ہاتھوں سے کاٹنے کے لئے تیز دھار آریوں کا مطالبہ کیا تھا۔ جس امریکہ کے کمانڈوز منرل دائر کی بوتلوں، بسکٹوں کے ڈبوں اور چاکلیٹ کے پیسٹوں کے ساتھ میدان جنگ کا رخ کر رہے ہوں، وہ ایسے پراسرار بندوں کا تصور کس طرح کر سکتا ہے جو ہمتوں روٹی کے نوالے اور پانی کی بوند کے بغیر پہاڑوں کی لمبی مسافتیں طے کر سکتے ہیں۔ کیا امریکہ تک یہ خبر پہنچ گئی ہے کہ وہ بستیوں کو تاراج کرنے کے بعد خوراک کے جو بنڈل گرا رہا ہے، افغان باشندے انہیں ”اللہ اکبر“ کے نعروں کے ساتھ نذر آتش کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بے پناہ انتہائی جنس اور اس سلسلے میں پاکستان کے بھرپور تعاون کے باوجود

امریکہ ابھی تک طالبان کی ”تخصیبات“ کا سراغ نہیں لگا سکا۔ ہوائی اڈوں، بجلی گھروں، راڈاروں، ریڈیو سٹیشنوں اور فوجی ٹھکانوں پر نٹوں وزنی بم گرانے والے امریکہ کو علم ہی نہیں کہ طالبان کی اصل تخصیبات ان کے کشادہ سینوں میں، فولاد سے زیادہ مضبوط قلعوں کی صورت میں موجود ہیں جن کی اساس اللہ پر کامل ایمان اور محمد عربی ﷺ سے لازوال عشق پر ہے۔ اونچی فصیلوں اور ناقابل شکست برجوں والے اس قلعے میں آج تک کوئی شکاف نہیں ڈال سکا۔

افغانستان کی نضاؤں کو فتح کرنے کے بعد امریکہ اس کی زمین پر بھی بالادستی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ ایک عشرہ یا ایک صدی طویل جنگ بھی لڑ سکتا ہے۔ کابل، قندھار، ہرات، جلال آباد، مزار شریف سب راکھ کا ڈھیر بن سکتے ہیں..... لیکن ان ”تخصیبات“ کا کیا بے گا؟

[11-10-2001]

راکھ کا ڈھیر

افغانستان کی ایک 25 سالہ بیٹی "استا گل" کی رنگین تصویر ایک انگریزی اخبار کے صفحہ اول پر شائع ہوئی ہے۔ استا گل کی بڑی بڑی شہابی آنکھوں میں لمبے انتظار کی پرچھائیاں، مہرے کرب کی دھند اور بے کراں اداسیوں کے گھنے سائے تیر رہے ہیں۔ لگتا ہے وہ پچھلے 25 سالوں سے یونہی بیٹھی آتے جاتے موسموں کو دیکھ رہی ہے لیکن اس کے لئے موسم بدلا ہی کب ہے؟ جب وہ چار سال کی تھی تو پڑوس کی ایک سپر پاور نے اس کے وطن پر یلغار کر دی تھی۔ پچھلے 21 سالوں میں وہ جانے کتنی بار اپنے اجاڑ وطن کے ویرانوں میں جاتی اور پھر لوٹ کر پاکستان آتی رہی ہے۔ اس کی عمر کے 21 سال انہی راستوں میں گم ہو گئے۔ کچھ طورخم کے اُس طرف، کچھ طورخم کے اِس طرف۔

استا گل کی آنکھوں میں ایک بے نام سی التجا بھی دکھائی دے رہی ہے۔ شاید اس کی نظریں قطر میں 56 اسلامی ممالک کی نمائندہ تنظیم "اوائی سی" پر لگی تھیں۔ التجا میں موہوم سی امید کا عکس بھی جھلک رہا تھا جیسے وہ کوارٹر سونٹے، جری گھڑ سواروں کا انتظار کر رہی ہو جو کسی لمحے قطر کے صحرا سے صمودار ہونے کو ہیں۔ اسے بتایا گیا تھا کہ 56 اسلامی ممالک کی تنظیم بہت بڑی طاقت ہے۔ یہ 56 ممالک، تین کروڑ مربع کلومیٹر علاقے پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں سو ارب کے لگ بھگ سو ماہیتے ہیں۔ دنیا بھر کے تیل کے ذخائر کا تقریباً 75 فیصد ان کے قبضے میں ہے۔ ان کی معدنی اور زرعی دولت حد و حساب سے باہر ہے۔ ان کی تاریخ شجاعت و بہادری کی لازوال داستانوں سے بھری پڑی ہے اور وہ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

بعض "ناگزیر مجبور یوں" کے باعث اسلامی کانفرنس کوئی فوری اقدام نہ کر سکی۔ امریکہ نے 11 ستمبر کو اعلان کر دیا تھا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور یہی گون کی تاجی کے بعد "دنیا تہل ہو گئی ہے اور ایک نئی کائنات نے جنم لیا ہے۔"

جارج ڈبلیو بوش نے ایک نئی صلیبی جنگ کی تو یہ بھی سادی تھی لیکن اسلامی کانفرنس کو کوئی ٹہلت نہ تھی۔ ٹھیک ایک ماہ بعد 56 اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ قطر کے دارالحکومت دوحہ میں اکٹھے ہوئے۔ اس وقت تک عالم اسلامی کی واحد اٹنی قوت کی فضاؤں کو چیرتے کر دزمیزائل اور بمبار طیارے افغانستان پر قیامت ڈھا چکے تھے۔

اسلامی کانفرنس نے واضح، دو ٹوک اور غیر مبہم انداز میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر حملوں کو دہشت گردی قرار دیتے ہوئے ان کی بھرپور مذمت کی۔ جس فلسطین کے لئے اسامہ بن لادن پوری دنیا سے لڑ رہا ہے اس فلسطین کے صدر نے امریکہ کے ساتھ مل کر بیجیٹی کا اظہار کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہمارے تمام تر وسائل دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی ہم کے لئے حاضر ہیں۔ طالبان کی طرف سے کانفرنس کے نام بھیجی جانے والی ایمل کے جواب میں کہا گیا کہ "افغانستان کی حد تک تو کوئی ہرج نہیں لیکن کسی اور اسلامی ملک کو نشانہ نہ بنایا جائے" کانفرنس کے عزت مآب شرکاء کو گھر جانے کی جلدی تھی اس لئے وہ ایک اسلامی ملک کے خلاف برہنہ امریکہ کی جارحیت کی مذمت نہ کر سکے لیکن جاتے جاتے وہ مصیبت زدہ افغان بھائیوں کے لئے 27 ملین ڈالر کے چندے کا اعلان کر گئے۔

استاگل کو شاید اس بات کی خبر نہیں کہ ہماری دنیا 11 ستمبر سے بہت پہلے ہی بدل گئی تھی اور اب ہمارے پاس بھولی بسری کہانیوں کے سوا کچھ نہیں بچا۔ وہ جس امت مسلمہ سے آس لگائے بیٹھی ہے، اس کی ہر اکائی کو اپنی بقا کی فکر ہے۔ تیل کے تین چوتھائی ذخائر کی مالک، سوارب مسلمانوں کی دنیا کی مجموعی قومی پیداوار، بارہ ہزار بلین ڈالر سالانہ ہے جبکہ صرف جاپان کی سالانہ مجموعی قومی پیداوار 55 ہزار بلین ڈالر ہے۔ دنیا کی مجموعی برآمدات میں عالم اسلام کا حصہ صرف سات فیصد ہے اور وہ سات سو بلین ڈالر کے قرضوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اس عالم اسلام کی حکومتوں اور عوام کے درمیان ایک فاصلہ ہے اس لئے ان کی مجبوریوں کو سمجھنا چاہئے اور ان کے کندھوں پر ان کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہئے۔

امریکہ اور یورپ کے اہداف کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ مصلحتوں کی زنجیروں میں جبری مسلم حکومتیں، ان کا راستہ روکنے کی صلاحیت رکھتی ہیں نہ عزم۔ سر پھرے طالبان کب تک پھرے ہوئے طوفانوں کا سامنا کریں گے؟ اگر سوارب انسان خس و خاشاک ہو سکتے ہیں تو بچے

کچھ دو کروڑ افغانی کیا کر لیں گے؟

استا گل کی آنکھیں جیسے پتھر کی ہو چکی ہیں۔ نہ جانے وہ کس کا انتظار کر رہی ہے۔ اسے کون بتائے کہ دور دیس سے آنے والے شہسوار، صحراؤں کی دھول ہو چکے ہیں۔ عجیب پاگل سی لڑکی ہے۔ اسے کون سمجھائے کہ جن لوگوں کے ہاتھ تمہارے شہید بھائیوں کے حق میں دعا کے لئے نہیں اٹھ سکتے، وہ تمہاری خاطر تلوار کیسے اٹھائیں گے؟

استا گل اور اس جیسی لاکھوں بیٹیاں کب تک انتظار کی آگ میں جلتی رہیں گی۔ انہیں کیسے یقین دلایا جائے کہ عشق کی آگ بجھ چکی ہے اور راکھ کے ڈھیر میں اب کوئی چنگاری باقی نہیں؟

[12-10-2001]

نازک مزاج امریکہ

11 اکتوبر کو پینٹاگان اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملوں کا ایک ماہ مکمل ہو گیا ہے۔ 12 اکتوبر کو یہ دن پینٹاگان کی ایک خصوصی تقریب میں منایا گیا جس میں تقریر کرتے ہوئے امریکی صدر نے پینٹاگان کے 189 ہلاک شدگان کی روجوں کو سلام عقیدت پیش کیا۔ یہ قومی تہوار منانے کے لئے افغانستان میں بھی خصوصی اہتمام کیا گیا چنانچہ 12 اکتوبر کا پورا دن اور پوری رات امریکہ کے بیون اور بی 52 بمبار طیارے کاہل، جلال آباد، قندھار اور مزار شریف کی مساجد، بازاروں اور بستوں پر کلسر بموں اور 5000 پونڈ وزنی لیزر گائیڈڈ میزائلوں کی بارش کرتے رہے۔ ”کورام“ کا پورا گاؤں پیوند زمین ہو گیا اور سوارب مسلمانوں سمیت پوری ”مہذب“ دنیا ٹیلی ویژن نیٹ ورکس پر ”کورام“ میں بچے کھرام اور امریکی جاہ و حشمت کے مناظر دکھتی رہی۔ صرف ایک گاؤں میں دوسو سے زائد افراد لقمہ اجل بن گئے۔ اس رقص اٹھیس پر شاداں برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر نے اعلان کیا ہے کہ ”یہ جشن کم از کم مزید ایک سال جاری رہے گا۔“ برطانوی ڈیفنس سٹاف کے چیف سر مائیکل نے فرط مسرت سے کپکپاتی آواز میں کہا ”ہم نے ڈھیروں بم گرائے ہیں۔“ امریکی وزیر دفاع نے کہا ہے کہ ”اس طرح کی کارروائیوں میں عام لوگ مرتے ہی رہتے ہیں۔“ جارج بوش نے پینٹاگان کے احاطے میں جمع ہونے والے جوش عوام کو بتایا کہ ”اب طالبان اور القاعدہ کے لئے کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی۔“ اور ملا عمر نے صرف اس قدر کہا ہے کہ ”غلامی کی زندگی قبول کرنے سے مر جانا بہتر ہے تاہم ٹیلی ویژن پر ہمارے قتل عام کا تماشا دیکھنے والے مسلمان شرم کریں۔“

مشکل حالات میں گھرے ملک کی تاریخ کے ایک انتہائی مشکل لمحے میں تنہا ایک انتہائی مشکل فیصلہ کرنے والے صدر مشرف کے سامنے واقعی کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ آج بھی کامل غیر جانبداری کے ساتھ سوچا جائے تو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا کہ امریکی غیظ و غضب کی تند و

تجزیہ لہروں کے سامنے بند باندھنا ضروری تھا۔ پاکستان کی تاریخ اور مقبول عوامی جذبہ و احساس سے ہٹ کر ایک مختلف راستہ اختیار کرتے وقت جنرل مشرف نے یقیناً اپنی ذات سے بالاتر ہو کر سوچا اور ایک بڑا رسک لیا۔ لیکن بعد کے حالات بتاتے ہیں کہ نہ باگ ہاتھوں میں رہی نہ پاؤں رکاب میں، نہ حکومتی کارپردازوں نے صدر کے فیصلے کی روح کو سمجھا اور نہ امریکہ نے ان کے اقدام کی نزاکت کو محسوس کیا۔ صدر کی تقریر نے یہ پیغام موثر طور پر عوام تک پہنچا دیا تھا کہ افغانستان کے خلاف کارروائی میں امریکی مہم کا حصہ بننا، ہمارا انتخاب ہے نہ رضا کارانہ فیصلہ، یہ ہماری مجبوری ہے جو حالات کے شدید دباؤ اور واقعات کے جبر کے تحت ہمیں قبول کرنا پڑی ہے۔ انہوں نے عوام کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ آنکھیں بند کر کے کسی مہم جوئی کا راستہ، ہمیں پتھر کے زمانے تک لے جائے گا۔ اگر بعد کا سہارا سزا سی جکتے پر مرکوز رہتا کہ ہم ”جبر، دباؤ اور معذوری“ کے تحت یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہیں تو ذہن صاف رہے۔ لیکن اس مجبوری کے خاکے میں رضا و رغبت، خوشنودی خاطر، رضا کارانہ خود سپردگی اور دلہانہ گرجوئی کا رنگ بھرنے والے حکمت کاروں نے صدر مشرف سے انصاف نہیں کیا۔ نا انصافی کا یہ عمل مسلسل جاری ہے اور اس کا سب سے زیادہ مہلک مظاہرہ خود امریکہ کر رہا ہے۔ اس نے شاید ابھی تک پاکستانی عوام کی نفسیاتی ساخت اور حکومت کی مشکلات کا درست اندازہ نہیں لگایا۔

چند دن قبل صدر مشرف نے یہ کہا کہ ”امریکی حملے مخصوص اہداف تک محدود رہیں گے اور یہ مختصر مدت کے لئے ہوں گے“ تو وہ دراصل پاکستان کی آتش زیر پارائے عامہ سے مخاطب تھے جو بہر حال ایک پڑوسی اور مسلم ملک کے عوام پر ٹوٹی قیامت سے بے حد دکھی ہے۔ منگبر امریکی صدر کو بھی کسی کرخت اور کھردرے رد عمل کی ضرورت نہ تھی لیکن انہوں نے اپنی مخصوص رعونت میں گندھے تو ہیں آمیز لہجے میں فرمایا: ”مجھے نہیں معلوم کہ پاکستانی صدر کو کس نے یہ بات بتائی ہے۔ ہم کسی پر اپنے دفاعی پلان ظاہر نہیں کرتے، یہ جنگ مقاصد کے حصول تک جاری رہے گی۔ وہ کل حاصل ہو جائیں، ایک ماہ میں یا ایک سال میں..... جنگ جاری رہے گی۔“

جارج بش کو اس بات کا اندازہ نہیں ہو رہا کہ جس طرح انہیں امریکی عوام کو مطمئن کرنا ہے اسی طرح صدر مشرف کو بھی اپنے عوام کے زخموں پر مرہم رکھنا ہے۔ امریکہ کو افغانستان پر آتش و آہن کی موسلا دھار بارش برساتے وقت یہ ہرزہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اس کے ہلاکت آفریں ہوں

سے صرف افغان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے پر نچے ہی نہیں اڑتے، پاکستان کے عوام کے قلب و ذہن پر بھی گہری ضرب لگتی ہے۔ امریکہ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ ایک مشکل اور نازک فیصلہ کرنے کے بعد، پاکستان مسلسل گہری دلدل میں دھنستا جا رہا ہے۔ اس کی کمزور معیشت بدستور ہچکیاں لے رہی ہے۔ کئی ترقیاتی منصوبے جامد ہو گئے ہیں۔ کاروباری سرگرمیوں پر اوس پڑ گئی ہے۔ سرمایہ کاری کے امکانات برسوں کی مسافت پر چلے گئے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں واپس جا چکی ہیں۔ ہڑتالوں اور مظاہروں کا سلسلہ پھیلتا جا رہا ہے اور امریکہ ایک طویل جنگ کی دھمکیاں دے کر معاملات کو مزید بگاڑ رہا ہے۔ پاکستان کا تعاون اب ہوائی اڈوں کے رن ویز تک آن پہنچا ہے اور جارج بوش پاکستانی عوام کے شعلہ بدامان احساسات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ایک بے ضرر سے بیان کو بھی برداشت نہیں کر پارہا۔

عالی مقام صدر امریکہ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ افغانستان میں گرائے جانے والے خوراک کے پیکنوں سے افغان عوام کو امریکہ کی "سخاوت اور کشادہ دلی" کا اندازہ ہوگا۔ بستیوں کو قبرستان میں بدل کر، حد نظر تک بکھرے بے جان انسانی اعضاء کے لئے "من و سلوٹی" کا اہتمام کرنے والے امریکہ کی کشادہ دلی واقعی لاجواب ہے۔

شمار اس کی سخاوت کا کیا کریں کہ وہ شخص
چراغ بانٹتا پھرتا ہے چھین کر آنکھیں

[13-10-2001]

لٹے لوگوں کا ماتم

خبروں کے جنگل میں راستہ بنانا مشکل ہو رہا ہے۔

اتوار کے ”مقدس“ دن، اکیسویں صدی کی پہلی صلیبی جنگ کا آغاز کرنے والے امریکہ نے جمعہ کے ”مقدس“ کے پیش نظر ایک دن کے لئے منصوبہ بند حملے ملتوی کر دیئے۔ یہ نوید جانفزاس وقت سنائی گئی جب دنیا کے سارے اسلامی ممالک میں جمعہ کی نماز ادا ہوئے گھنٹوں گزر چکے تھے اور عشاء کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ہفتہ کی صبح سے افغانستان ایک بار پھر کروڑوں کمزوروں اور کھسکے ہوئے لوگوں کی زد میں ہے۔ پاکستان کے گرد گھیرا جگ ہو رہا ہے اور حرکت المجاہدین کے بعد جیش محمد کا تعلق بھی دہشت گردی سے جڑ چکا ہے۔ صدر بوش نے اعلان کیا ہے کہ مقاصد کے حصول کے بعد بھی امریکہ افغانستان میں موجود رہے گا۔ پاکستانی وزارت خارجہ کے ترجمان نے کہا ہے کہ ”امریکی حملے افغان عوام کے خلاف نہیں اس لئے بے گناہ انسانوں کی ہلاکت کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔ یہ سب کچھ بلا ارادہ اور اٹھانے پن میں ہو رہا ہے۔“ طالبان نے ”فتح یا موت“ کا نعرہ لگایا ہے۔ ایک ”جرٹو“ امریکہ کے اعصاب شل کئے دے رہا ہے اور ملا عمر کا دس سالہ بیٹا اس امریکی انصاف کی بھینٹ چڑھ گیا ہے جو پچھلے چھ دنوں اور چھ راتوں سے افغانستان کے دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔

پندرہ سال قبل معمر قذافی کی بیٹی بھی انصاف کی اسی تلوار کا نوالہ بن گئی تھی..... لیکن یہ سب کچھ نادانستہ ہوا تھا۔ امریکہ نے کبھی بھی معصوم اور بے گناہ انسانوں کو نشانہ نہیں بنایا۔ حالیہ صلیبی جنگ کا آغاز کرتے وقت بھی چارج بوش نے یقین دلایا تھا اور وہ بار بار اس یقین دہانی کو دہرا رہے ہیں کہ افغان عوام سے ان کی کوئی دشمنی نہیں۔ 1991ء میں عراق کی بستیوں پر بموں کی بوچھاڑ کرنے سے قبل بھی بڑے بوش نے یقین دلایا تھا کہ وہ عراقی عوام کے دوست ہیں۔ 1982ء میں لبنان پر یلغار سے پہلے بھی واضح کر دیا گیا تھا کہ لبنانی عوام سے ہماری کوئی مخالفت نہیں۔

1986ء میں لیبیا پر بمباری سے قبل بھی یہی اعلان کیا گیا تھا اور 1956ء میں نہر سوئز کے کنارے مصریوں کو نشانہ بنانے سے پہلے بھی یہی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔ ان واقعات میں ہزاروں لاکھوں افراد کی ہلاکت محض اتفاق تھی۔ اصل مقصد غیر مطلوب حکومتوں کو بے دخل کر کے اپنے مطلب کے حکمرانوں کو تخت اقتدار پر بٹھانا تھا۔ اس معصوم سے کھیل میں اگر کچھ معصوم لوگ لاکھ ہو گئے تو اسے قابل مذمت فعل نہیں کہا جاسکتا۔

رعونت اور تکبر ایک ایسا مہلک مرض ہے جو ایک فرد کے سارے لطیف احساسات کو چاٹ جاتا اور اس کی شخصیت کے انسانی پہلوؤں کو مسخ کر کے اسے درندگی کی سطح تک لے آتا ہے۔ ایسے ہے کہ ایسی میراث کے وارث ایسے درندہ صفت لوگ جب ایک بے رحم آدم خور کی طرح ستیوں میں دھارے ہوتے ہیں، تو بھی انہیں یہ زعم ہوتا ہے کہ وہ اخلاق و کردار کی اونچی مسند پر فخر و کش ہیں۔ جارج بش اور ان کی قوم اسی ذہنی کیفیت سے دوچار ہیں۔ انہیں اس امر کا اور اک خیال نہیں کہ وہ جس بے سرو سامان قوم پر مہلک ترین ہتھیاروں کی بارش کر رہے ہیں، کم از کم اس کے پدیدہ جسموں پر ٹمک پاشی تو نہ کریں۔ دو روز قبل صدر ریش نے اپنی سخاوت اور عالی ظرفی کے ثبوت کے طور پر افغانستان کے کھنڈروں پر گرائے جانے والے خوراک کے پیکنوں کا ذکر کیا تھا۔ گزشتہ روز انہوں نے بے پناہ تالیوں کی گونج میں اعلان کیا کہ امریکہ کا ہر بچہ، بھوک اور بیماری سے بھرپور حال افغان بچوں کے لئے ایک ایک ڈالر چندہ دے گا۔

یہ ہے وہ بے رحمانہ درندگی جو صرف تکبر کی کوکھ سے جنم لیتی ہے۔ کوئی امریکہ سے کہنے والا بھی نہیں کہ خدا ہمارے لاشوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ تم اس عہد کی سب سے بڑی قوت ہو جسے چیلنج کرنے کی جرأت کسی میں نہیں۔ ہم یہ بھی مان چکے ہیں کہ تمہارے طیاروں، تمہارے میزائلوں اور تمہارے بموں کو روکنا ہمارے بس میں نہیں۔ ہم تو یہ اعلان بھی کر چکے ہیں کہ تم چاہے جتنی ہتھیار تیار کرو، چاہے جتنے انسانوں کی جانیں لے لو، ہم تمہاری مذمت بھی نہیں کریں گے لیکن ہمیں تزیل اور تحقیر کا نشانہ تو نہ بناؤ۔

اس فرعونی تکبر کا ایک مظاہرہ نیویارک کے میٹرنے بھی کیا جس نے سعودی شہزادے اور شاہ ارد کے بھتیجے، پرنس الولید بن طلال بن عبدالعزیز کا دس بلین ڈالر کا وہ چیک واپس کر دیا جو پرنس نے تیار شدہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے امدادی کارکنوں کے لئے دیا تھا۔ پرنس الولید کا قصور یہ ہے کہ اس

نے کہا تھا..... ”امریکہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے اور اس میں توازن لائے۔“ جمہوری اقدار اور آزادی اظہار کے علمبردار امریکہ سے اتنی سی بات بھی برداشت نہ کی اور اس نے بطور احتجاج دس بلین ڈالر کا چیک پرنس الولید کو واپس کر دیا اور خود اس کی خود سری دیکھی کہ اپنے بچوں کی لاشیں گود میں لئے بیٹھی افغان ماؤں کو یہ نوید دے رہا ہے کہ امریکی بچے تمہارے بچوں کے لئے ڈال رہے ہیں۔

ملا عمر کا دس سالہ بچہ اپنے حصے کے ڈالر وصول کئے بغیر مر گیا۔ امریکی بمباری کے زخموں سے پھر وہ عین اس وقت اپنی جان ہار بیٹھا جب جارج بش تالیوں کی بے پناہ گونج میں اپنے بچوں کو ڈال رہا تھا۔

اور میں..... ملا عمر کے گھر پر باقاعدہ منصوبے اور مکمل تیاری کے ساتھ کی جانے والی گولی باری کے نتیجے میں ”اتفاقیہ“ موت مر جانے والے دس سالہ بچے کی ہلاکت کی خدمت بھی نہیں کر سکتا۔ الہی! میں کس آشوب کا شکار ہو چکا ہوں۔ بیٹھے بٹھائے مجھے کیا ہو گیا ہے۔

سکھا مجھ کو لئے لوگوں کا ماتم
چلے جسموں بجھی آنکھوں کا ماتم

[14-10-2001]

یہ بے خبر لوگ

باجوڑ ایجنسی کے شہزاد گل اور ایک اسی سالہ بڑھیا کی کہانی سن کر مجھے ان پر بہت ترس آیا اور میں ویرنگ ان کی پسماندگی اور جہالت پر کڑھتا رہا۔

اکیسویں صدی کا سورج سوائیزے پر کھڑا ہے اور یہ لوگ ابھی تک پتھر کے زمانے میں جی رہے ہیں۔ ان سادہ لوح اور اجڈ لوگوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ بی بی سی دیکھتے ہیں سی این این۔ وہ جارج بوش کے ان بیانات سے بھی بے خبر ہیں کہ امریکہ افغانستان کے جنگ زدہ عوام کے لئے خوارک کے پیکٹ گرا رہا ہے اور وہاں کے بچے ایک ایک ڈالر جمع کر کے افغان بچوں کو بھیج رہے ہیں۔ وہ اخبارات میں شائع ہونے والے پاکستانی دانشوروں کے گراں قدر افکار و خیالات سے بھی ناواقف ہیں۔ وہ شاید دفتر خارجہ کے ترجمان ریاض محمد خان کی پریس بریفنگ بھی نہیں سن رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زمینی حقائق سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ طالبان دہشت گرد قرار پا چکے ہیں۔

ایک انگریزی اخبار میں شائع ہونے والی مفصل رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے ساتھ ساتھ بسنے والے پاکستانی قبائل آتش زیر پا ہیں۔ شاہراہ ریشم کی بندش اور پولیس چوکیوں پر حملے معمول بنتے جا رہے ہیں۔ جگہ جگہ بھرتی کے دفتر کھلے ہیں جہاں رضا کار افغانستان جانے کے لئے اپنے نام درج کر رہے ہیں۔ مہمند، باجوڑ، خیبر، اورک زئی، شمالی اور جنوبی وزیرستان ایجنسیوں اور وفاق کے زیر انتظام علاقوں میں قائم امدادی کیپ خاصے پر رونق ہیں۔ شمالی اتحاد اور ظاہر شاہ سے ہمدردی رکھنے والے اکاڈمک افراد کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے اور کچھ کے گھرنڈر آتش کر دیئے گئے ہیں۔ دنیا کی واحد سپر پاور کی دہشت سے بے نیاز، سنگلاخ پہاڑوں میں بسیرا کرنے والے یہ لوگ قطعی طور پر بے خبر ہیں کہ دنیا کدھر جا رہی ہے؟ اقوام متحدہ کیا کہہ رہی ہے اور خود سوا ارب مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم، او آئی سی کیا فتویٰ صادر کر چکی ہے؟

باجوڑا بخشی کے گاؤں خارکار بننے والا شہزاد گل بھی تہذیب کی چکاچوند سے محروم اور خود راہ آرزو سے بے خبر ہے۔ اس نے جب سنا کہ سات سمندر پار سے آنے والی ایک گوری قوم نے پڑوس کے افغان مسلمان بھائیوں پر حملہ کر دیا ہے تو وہ بے گل ہو گیا۔ مسجد سے اعلان ہوا کہ لوگوں طالبان کے لئے چندہ دیں۔ بے سرو سامان شہزاد گل نے اپنے کچے گھروندے پر نگاہ ڈالی۔ وہ دکھائی نہ دیا۔ اچانک اس کی نظر گن میں بندھی بکری پر پڑی۔ اس نے رسی پکڑی اور بکری تنظیم فقار شریعت محمدی کے امدادی کیسپ میں جمع کراتے ہوئے بولا ”یہ طالبان تک پہنچاویں“ شہزاد گل ابھی وہیں کھڑا تھا کہ ایک اسی سالہ بڑھیا لاشی ٹپکتے آئی اور چھوٹی سی پوٹلی میز پر رکھتے ہوئے بولا ”یہ افغانستان میں میرے بچوں تک پہنچا دو“ پوٹلی میں تیس اٹھے رکھے تھے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ کھاتے پیتے گھرانوں کی خواتین اپنے زیورات ڈھیر کر رہی ہیں اور چند دنوں میں تنظیم کے دفاتر میں بیس کلو سونا جمع ہو چکا تھا۔ نقد عطیات پچاس لاکھ روپے سے بڑھ گئے تھے۔

ادھر افغان بچوں کو اندازہ ہی نہیں ہو پارہا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کس بلائے بے درماں کا نام ہے۔ وہ ایک کلسٹر بم گراتا ہے جو زمین سے ٹکرانے سے قبل فضا میں ایک سو پچاس چھوٹے چھوٹے بموں کو جنم دیتا ہے۔ 2500 پونڈ وزنی بم فضا میں تیرتے پھرتے ہیں اور افغان بچے ان کی طرف اس طرح لپکتے ہیں جس طرح بسنت کے دنوں میں لاہور کے مچلے کئی پتلیوں لوٹتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان بموں کی تیاری میں انتہائی اعلیٰ قسم کا فولاد استعمال ہوا ہے۔ یہ فولاد آج کل کابل میں 125 روپے کلو اور لنڈی کوتل میں 250 روپے کلو کے حساب سے بک رہا ہے۔ غیر ملکی صحافیوں کے قافلے افغانستان میں اتر چکے ہیں۔ انہیں یقین نہیں آرہا کہ امریکہ اور برطانیہ جیسی عظیم طاقتیں، ساری دنیا کے ساتھ مل کر افغانستان کی جس غریب ترین اور نہتی قوم کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ بنا رہی ہیں نہ اس کے اعصاب شل ہو رہے ہیں، نہ اس کی طرحداری میں کوئی فرق آرہا ہے۔ وہ بمبار طیارے سے گرتے بموں اور کروڑ میزائلوں کو پھیلھریاں سمجھ کر مسرور ہوتے ہیں۔ لطف اٹھاتے، رقص کرتے اور نعرے لگاتے ہیں۔ بھرپور آسائشوں میں زندہ رہنے والے اخبار نویسوں کو اندازہ ہی نہیں ہو پارہا کہ اس افلاس زدہ قوم کی رگوں میں دوڑنے والے لہو کی حیاتیاتی اور کیمیائی ساخت کیا ہے؟

انہیں کون بتائے کہ جنسل پچھلے پائیس سالوں میں پٹی بڑھی ہے ان کے کانوں میں پڑنے

والی پہلی آواز اذان کے ساتھ ساتھ ہمیں کے دھماکوں کی تھی۔ ان کے بڑوں نے ان کے لئے دولت و ثروت کے بجائے غیرت و حمیت کی میراث چھوڑی ہے۔ غیر ملکی ٹیلی ویژن کا نمائندہ شاید کابل کے اس عمر رسیدہ مگر مجاہدانہ بانگین رکھنے والے شخص کی اس بات کا مفہوم بھی نہ سمجھ سکا ہو کہ ”مسئلہ امریکہ کی طاقت اور ہمارے کمزور ہونے کا نہیں۔ مسئلہ زندہ رہنے یا مر جانے کا بھی نہیں۔“

مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم احمد شاہ ابدالی اور محمود غزنوی کی روحوں کو کیا جواب دیں گے؟

میں مسلسل اس ادھیڑ بن میں مصروف ہوں کہ اپنے آپ کو جارج بش کے بجائے مردہ انسانوں کی روحوں کے سامنے جو ابدہ سمجھنے والے ان سادہ لوح انسانوں کا کیا بنے گا؟ طالبان کو تمیں انڈے پیچھے والی بڑھیا اور بکری کا تھنہ ارسال کرنے والے شہزاد گل کو کس طرح باور کرایا جائے کہ امریکہ گستاخی کرنے والوں کو پتھر کے زمانے میں دھکیل دیتا ہے؟

یہ بے چارے تو پہلے ہی پتھر کے زمانے میں تہی رہے ہیں۔

[17-10-2001]

پہلا مرحلہ

امریکہ عیسائی اور ہنریائی کیفیت میں چلا ہے۔ فی الحال وہ اس امر کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کی قدرت کھو چکا ہے کہ 11 ستمبر کے بعد اچانک بدل جانے والی دنیا میں وہ کہاں کھڑا ہے؟ اس کے وقار میں کتنا اضافہ ہوا ہے؟ دنیا کی واحد سپر پاور کی حیثیت سے اس کی ہیبت و دہشت کا سکہ کتنا مستحکم ہوا ہے؟ اسلامی ممالک کے علاوہ یورپ اور دیگر خطوں میں اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کے کس قدر جذبات ابھرے ہیں اور جس ”بلا جواز نفرت“ کا ذکر وہ بار بار کر رہا ہے، اس میں کتنی کمی آئی ہے؟

7 اکتوبر کے بعد نئے انفانوں پر وحشیانہ بمباری کے بعد پوری دنیا میں ایک ابال سا اٹھا ہے۔ اسلامی ممالک کو بار بار پیغام دینے کے باوجود کہ امریکہ کی حالیہ جنگ اسلام کے خلاف نہیں، محض دہشت گردوں کے خلاف ہے، شاید ہی کوئی اسلامی ملک ایسا ہو جہاں بھرپور امریکہ مخالف مظاہرے نہیں ہوئے۔ انڈونیشیا، پاکستان، ملائیشیا، بنگلہ دیش، سعودی عرب، لبنان، اومان، ترکی، ایران، فلسطین، عراق، بھارت، لیبیا، شام اور متعدد دوسرے اسلامی ممالک کے علاوہ مظاہروں کا سلسلہ اٹلی، سری لنکا، فلپائن، برازیل، بھارت، فرانس، جرمنی، برطانیہ اور خود امریکہ کے اندر تک پھیل چکا ہے۔ دنیا کے کسی گوشے سے بھی انفانوں پر آتش و آہن کی بوجھاڑ کے حق میں کوئی آواز نہیں اٹھ رہی۔

اتوام متحدہ کے دفاتر کے بعد اب ریڈ کراس کے خوراک کے گوداموں کو بھی نذر آتش کر دیا گیا ہے۔ امریکہ کے بھیانک ماضی کی ایک ایک کہانی بہ اندازہ لگھی اور پڑھی جا رہی ہے۔ اس کے چہرے کے حقیقی خدو خال نمایاں ہو رہے ہیں۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پیپلا گون میں ہلاک ہونے والوں کے دکھ میں چلا انسانیت کے لئے افغانستان میں خاک و خون میں تڑپتی لاشوں سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ سو پر دوں کے پیچھے چھپی دہشت گردی قابل مذمت ہے تو طاقت کے نشے

میں بدست ملک کی طرف سے دن دہاڑے انسانی بستیوں پر دیوہیکل مشینوں کے ذریعے ٹنوں وزنی بم گرانے سے بھی زیادہ ناقابل معافی ہے۔

پاکستان کی صورت حال تیزی سے بدل رہی ہے۔ معروف امریکی جریدے نیوز ویک کے مطابق 87 فیصد پاکستانیوں کی ہمدردیاں طالبان کے ساتھ ہیں اور 82 فیصد پاکستانی اسامہ بن لادن کو مجاہد خیال کرتے ہیں۔ ”واشنگٹن پوسٹ“ میں شائع ہونے والے اپنے تازہ مضمون میں پامیلا کاشیل لکھتی ہیں:

”پاکستان میں عوام کا موڈ بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ رائے عامہ پر اثر انداز ہونے والے عناصر جو قبل ازیں صدر مشرف کے فیصلے کے حامی تھے، اب زبردست شکوک و شبہات کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ متوازن سوچ کے حامل لوگ جو عام حالات میں مشتبہ و ہشت گرد اسامہ بن لادن یا اسے پناہ دینے والی شدت پسند طالبان قیادت سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے اب سخت فحشے میں آ کر حکومتی پالیسی پر تنقید کرنے لگے ہیں۔ اچانک شہروں کی مارکیٹوں میں اسامہ بن لادن کی تصویروں والی ٹی شرٹس دکھائی دینے لگی ہیں۔ طلباء اور عام دفتری ملازم بھی اب مذہبی تنظیموں کے جلسوں میں شریک ہونے لگے ہیں اور امریکہ کے خلاف جہاد کا عہد کر رہے ہیں۔ خوبصورتی سے آراستہ ڈرائنگ روموں سے لے کر مساجد تک بے شمار پاکستانیوں کو یقین ہے کہ امریکہ میں 11 ستمبر کے واقعات کے پیچھے اسرائیل کا ہاتھ ہے۔“ یہ بات اب حالات کی پیش رفت پر نظر رکھنے والے ایک عام شخص کو بھی دکھائی دینے لگی ہے کہ امریکہ جنگ ہارنا جا رہا ہے۔ عالمی سطح پر اس کے خلاف زبردست اشتعال جنم لے رہا ہے جو آسانی سے ختم ہونے والا نہیں۔ مسلم حکمرانوں سے تو اتنا بھی نہیں ہو پایا کہ وہ افغانستان پر بے رحمانہ بمباری اور معصوم بچوں کی ہلاکت کی مذمت ہی کر دیتے لیکن اسلامی ممالک میں بسنے والے عوام کی واضح اکثریت کا دھار مخالف سمت میں بہ رہا ہے۔ چھپن اسلامی ممالک کی عظیم اسلامی کانفرنس کے اعلامیے پر جارج بش نے زبردست مسرت و اطمینان کا اظہار کیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ان اسلامی ممالک میں عوامی ردعمل کی لے دن بد دن تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ یقیناً انسانی تاریخ میں کسی حکمران کے اتنے پتلے نہیں چلے جتنے جارج بش کے چل چکے ہیں اور کسی ”دہشت گرد“ کی اتنی تصویریں نہ بچی ہوں گی جتنی اسامہ بن لادن کی۔

صدر بٹش کے خیال میں امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کا پہلا مرحلہ جیت لیا ہے۔ اس اعتبار سے تو واقعی جیت لیا ہے کہ افغانستان کی فضاؤں پر اس کا تصرف ہے۔ اس کے طیارے خوراک کے بنڈل گرانے اور خوراک کے گودام جلانے کے تاریخی کارنامے سرانجام دے رہے ہیں۔ کابل پانی اور بجلی سے محروم ہو چکا ہے اور قندھار میں شاید انار کا کوئی تومنہ چیز بھی سلامت نہ بچا ہو اور طالبان کی زنگ آلود توپوں کے گولے ہدف تک پہنچنے کی سکت کھو چکے ہیں۔

لیکن ”فتح یاب“ مرحلہ اول کے باوجود پورا امریکہ خوف کی صلیب پر لٹکا ہوا ہے۔ اس کے شہریوں کے دن بے سکون اور راتیں بے خواب ہو چکی ہیں۔ اس کی اکانومی پر ہیہم ضربیں لگ رہی ہیں۔ پانچ پانچ لاکھ ڈالر کے بم ساون بھادوں کی طرح برسائے جا رہے ہیں۔ لا حاصل جنگ چند دنوں میں اربوں ڈالر پڑپ کر چکی ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ امریکہ کے خلاف کچھ سوئی کچھ اگھستی نفرتیں ایک بار پھر پوری طرح بیدار اور سرگرم ہو چکی ہیں۔ عالمی ضمیر کی خفش شدید عوامی رد عمل کے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے اور اپنے خلاف ہمہ گیر نفرت کے اسباب جاننے کے لئے نگر مند امریکی قیادت تازہ نفرتوں کے ایسے بیج بو رہی ہے جو سالوں صدیوں تک فصل دیتے رہیں گے۔

مرحلہ اول میں ”گھٹت“ کھانے والے طالبان، اسامہ بن لادن اور القاعدہ، شاید برسوں کی جنگ و دو اور بے انتہا سرمایہ خرچ کرنے کے بعد بھی امریکہ کو اتنا ”بے لباس“ نہ کر پاتے۔

www.KitaboSunnat.com

[18-10-2001]

اپنی اپنی ”القاعدہ“

11 ستمبر کے واقعات کی آڑ لے کر جب امریکہ نے اخلاقیات، عدل اور انسانیت کی تمام قدروں کو پامال کرتے ہوئے ایک خستہ جان قوم کو اپنی بے محابا جنگی مشینری کی زد میں رکھ لیا تو مکروہ عزائم رکھنے والی ہر سامراجی قوت کی رال ٹکٹنے لگی۔ ہر ایک نے جانا کہ اس کے عزائم کی تکمیل کا چانغزالحہ آن پہنچا ہے۔ اب یہ سہولت اپنے ہدف کا یقین کر کے اس پر یلغار کی جاسکتی اور اپنی اس درندگی کو ”دہشت گردی“ کے خلاف عالمی مہم کا نام دیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ہر فرعون مزاج ملک نے اپنی اپنی ”القاعدہ“ تراشی اپنے اپنے ”اسامہ“ اور اپنے اپنے ”طالبان“ تخلیق کئے اور امریکی چھتری کے سائے تلے ان کے خلاف بھرپور کارروائی کا آغاز کر دیا۔

اسرائیل نے حماس اور اسلامک لبریشن فرنٹ اور بھارت نے مقبوضہ کشمیر کی تحریک حریت کو نشانے پر دھرایا۔ گزشتہ ہفتے جب اسرائیلی حکومت کے ترجمان سے معصوم فلسطینیوں کی ہلاکت کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے بڑے روکھے انداز میں جواب دیا ”ہم اپنے دفاع کا وہی حق استعمال کر رہے ہیں جو امریکہ افغانستان میں کر رہا ہے“ اور پاکستان میں بھارت کے سابق سفیر پارتھ سارگھی نے اسی تیوری کی آڑ لیتے ہوئے کہا ہے کہ ”اگر امریکہ ہزاروں میل دور آ کر افغانستان میں دہشت گردی کے کیچوں پر حملے کر سکتا ہے تو ہم اپنے شہروں پر بم گرانے اور اسمبلیوں کو تباہ کرنے والوں کے ساتھ یہ سلوک کیوں نہیں کر سکتے؟“

اس منظر کے نقوش 11 ستمبر کا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی ابھرنا شروع ہو گئے تھے۔ ”نوشتہ دیوار“ کی طرف واضح اور متعین اشارے بھی کئے جا رہے تھے لیکن ہمارے منصوبہ سازوں کا خیال تھا کہ ”ہم نے امریکہ کا دست دباؤ بننے کا فیصلہ ہی اسٹی پروگرام اور کشمیر میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے کیا ہے“ کمزور دل اور دوسوں کی ماری ہوئی سوچ رکھنے والوں کا خیال تھا کہ ہم چاہیں نہ چاہیں، جلد یا بدیر، کشمیر کی تحریک آزادی کو دہشت گردی کی گیل ڈال دی جائے

گی۔ اس ”القاعدہ“ کو کچلنے کے لئے بھارت، امریکہ کا کردار ادا کرے گا اور ہم اس کے طالبان قرار پائیں گے۔ اس مثلث کے تینوں زاویے اب خاصے واضح ہو چکے ہیں۔ حالات کے جبر کے تحت ایک مشکل اور غیر مقبول فیصلہ کرتے وقت ہم نے امریکہ سے کہا تھا کہ وہ اس دوران بھارت کو کسی مہم جوئی سے باز رکھے ہمیں بتایا گیا تھا کہ آپ مطمئن رہیں اور ہم مطمئن ہیں۔

بھارت مقبوضہ کشمیر میں جاری تحریک حریت کو کچلنے کے لئے ایک طرف تو سات لاکھ سفاک سپاہ سے پوری سفاکی کے ساتھ کام لے رہا ہے اور دوسری طرف سرگرم سفارت کاری کے ذریعے اپنے آپ کو ”دہشت گردی“ کا شکار ثابت کرنے کے لئے بھرپور کوششیں کر رہا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ”دہشت گردی“ مکہ رائج الوقت ہے اور اگر ایک مرتبہ وہ کشمیر کی تحریک آزادی پر دہشت گردی کا لیبل لگانے میں کامیاب ہو گیا تو اس کا کام آسان ہو جائے گا۔

کارگل کے دوران حاصل ہونے والی وسیع تر عالمی ہمدردی نے اس کے ارادوں کو جلا بخشی۔ اس مقصد کے لئے اس نے امریکہ اور روس کے ساتھ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے معاہدے کئے۔ ایران اور چین کے ساتھ بھی اسی نوع کی مفاہمت پیدا کی۔ اکتوبر کے اوائل میں جسونت سنگھ امریکہ گئے تو ان کی سفارتی مہم کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ امریکہ جس دہشت گردی کا نشانہ بنا ہے، ہم پچھلے بارہ سالوں سے اسے برداشت کر رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ دہشت گردی کا قلع قمع کرنے کے لئے شروع کی جانے والی عالمی تحریک، کشمیر میں جاری ”دہشت گردی“ پر بھی توجہ دے۔ 2 اکتوبر کو واشنگٹن میں جسونت سنگھ کے کندھے سے کندھا ملا کر کولن پاول نے اعلان کیا تھا کہ ”ہماری مہم صرف القاعدہ اور اسامہ بن لادن تک محدود نہیں رہے گی۔ ہم بھارت میں ہونے والی دہشت گردی سمیت دنیا بھر میں جاری دہشت گردی پر وار کریں گے۔“ گزشتہ ہفتے جسونت سنگھ نے انکشاف کیا کہ ”ہم نے پاکستان کو سہتی سکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن ٹونی بلیر نے ردک دیا“ اب نومولود وزیر دفاع جارج فرینچس نے غضب ناک لہجے میں کہا ہے کہ ”جوں کشمیر میں حریت پسندوں کے خلاف فوجی کارروائی ناگزیر ہو چکی ہے۔ اب صرف اس کارروائی کی نوعیت، وقت اور مقام کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔“

15 اکتوبر کے دن ابھی کولن پاول کا طیارہ اسلام آباد کی فضاؤں میں تھا کہ بھارتی فوج نے ”دہشت گردی“ کے خلاف مہم کا آغاز کرتے ہوئے پاکستان کی پوسٹوں پر گولہ باری شروع کر دی

اور کئی ماہ سے جاری سیز فائر کی دھجیاں اڑادیں۔ یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ امریکہ پاکستان کو ایک جزوقتی آلے کے طور پر تو استعمال کر سکتا ہے مگر اس کے طویل المیعاد مقاصد کے سارے رشتے صرف بھارت سے جڑے ہیں۔ ہم نے کولن پاؤل کی ضرورت سے زیادہ عزت افزائی کی۔ پروٹوکول کے سارے ضابطوں کو نظر انداز کر کے صدر مشرف پریس کانفرنس میں ان کے پہلو پہ پہلو کھڑے ہوئے۔ بھارت میں ان کا استقبال امور خارجہ کی سیکرٹری نے کیا اور پریس کانفرنس میں ان کے ہم مرتبہ جسونت سنگھ شریک ہوئے۔ ہمارے ہاں انہوں نے پانی کا ایک گھونٹ پینا بھی گوارا نہ کیا اور بھارت جاتے ہی جسونت سنگھ کی طرف سے دیئے گئے عشائیے میں شرکت فرمائی۔ وزیر اعظم کو اگلے ماہ دورہ امریکہ کی دعوت دی جس کا جسونت سنگھ نے شکر یہ تک ادا نہ کیا۔ موصوف نے ایک بار پھر سری نگر کے واقعہ کا حوالہ دے کر یہ عہد و ہرایا کہ:

”بھارتی کشمیر میں جاری دہشت گردی کا خاتمہ عالمی ہم کا حصہ ہوگا۔“

جناب کولن پاؤل کے دورہ جنوبی ایشیا سے شلوک و شبہات کا ازالہ نہیں ہو سکا بلکہ معاملات زیادہ پیچیدہ، گھمبیر اور تشویشناک ہو گئے ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ سامراجی ذہن اور سفاکانہ مزاج رکھنے والے تین ممالک اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لئے ہم قدم ہیں۔ امریکہ، اسرائیل اور بھارت، عالمی دہشت گردی کے خلاف ”جہاد“ کے نام پر آزادی کی تحریکوں اور اسلامی تشخص کی حال تنظیموں کو سفاکانہ طور پر کچلنے پر مشفق ہو چکے ہیں۔ تینوں نے اپنی اپنی ”القاعدہ“ اپنے اپنے ”اسامہ“ اور اپنے اپنے ”طالبان“ کا تعین کر لیا ہے۔ لیبیا پوتی کے باوجود تینوں میں سے کوئی کسی دوسرے کے ارادوں میں مزاحم نہیں ہوگا۔

مہذب دنیا کے نئے دستور العمل کا جا دوسر چڑھ کر بولنے لگا ہے اور خود فریبی کے سارے رنگ اپنی آنکھوں میں بسالینے کے باوجود اہل پاکستان کی بے گلی بڑھتی جا رہی ہے۔

سوچنا ہوں یہ ترے قدموں کی آہٹ ہے مگر
دل یہ کہتا ہے کہ کوئی سانحہ ہونے کو ہے

[19-10-2001]

ڈالروں کا مرہم؟

قدحارتب بھی ایک خانماں بر باد شہر تھا اور اب تو شاید اس کے زخم خوردہ درود یوار بھی ڈھیر ہو چکے ہوں۔ امریکہ کے سینکڑوں طیاروں کی پیہم بمباری اور کروڑ میزائلوں کی موسلا دھار بارش نے اس حراماں نصیب ہستی میں کیا باقی چھوڑا ہوگا؟ ملا عمر کے گھر کی تلاش میں نکلنے والے آوارہ خو میزائل نہ جانے کتنے گھروں کو خاکستر کر چکے ہوں گے۔ ممکن ہے وہ مہمان خانہ بھی سلامت نہ ہو جہاں امیر المومنین سے ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ ممکن ہے ”احمد شاہ بابا“ کا وسیع و عریض اور بلند و بالا مزار بھی ڈھیر ہو چکا ہو۔ ممکن ہے اس مزار کے پہلو میں بنی عظیم الشان عمارت بھی، جو مسجد کے طور پر استعمال ہوتی تھی، کھنڈر بن چکی ہو۔ ممکن ہے اس عمارت میں رکھے تین صندوقوں کے پرچے بھی اڑ چکے ہوں اور ممکن ہے یکے بعد دیگرے ایک دوسرے میں بند ان تین صندوقوں میں سے سب سے چھوٹے صندوق میں رکھا.....

لیکن اس تصویر سے کلیجہ منہ کو آنا اور قلم بچکیاں لینے لگتا ہے۔

ہر روز اپنے سینے پر سینکڑوں فضائی حملوں اور پانچ پانچ ہزار ٹن وزنی بموں کی یورش پیہم برداشت کرنے والے شہر میں کیا بچا ہوگا؟ سی این این اور بی بی سی جب بھی قندھار کا نام لیتے ہیں ایک انجانا سا خوف، ایک بے نام سا کرب میرے اعصاب میں چنگاریاں ہی بھردیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کوئی کند آری سے میرے دل کی گول گول قاشیں کاٹ رہا ہے۔ ناقابل برداشت اذیت میری ایک ایک سانس کو جکڑ لیتی ہے۔ میں اپنے ذہن کو جھک کر گرد و پیش میں کھوجانا چاہتا ہوں لیکن کوئی بس نہیں چلتا۔ نظر کا ہر زاویہ اور سوچ کی ہر لہر کسی نہ کسی طور قندھار کی طرف نکل جاتی ہے۔ شاہ بابا کا مزار، مسجد کے طور پر استعمال ہونے والی عظیم الشان عمارت، یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے اندر رکھے تین صندوق اور سب سے اندر والے صندوق میں.....

لگ بھگ پونے تین سو سال قبل قندھار کو ایرانی سلطنت سے آزاد کرانے والا نادر شاہ جب

اپنی بی سپاہ کے کچھ افسروں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو افغان سرداروں کے قبائلی جرگے نے صابر شاہ نامی روحانی شخصیت کی تحریک پر پچیس سالہ جبری کمانڈر احمد شاہ درانی کو افغانستان کا فرمانروا جنم لیا۔ یہ یووان تاریخ میں احمد شاہ ابدالی کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی یووان نے 1761ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو عبرتناک شکست دی۔ وہ ہند کی ہم پر تھا جب افواہ ازی کہ ”مرہٹوں نے احمد شاہ کی پٹائی کر کے اسے بھگا دیا ہے۔“ یہ افواہ احمد شاہ کی جبری والدہ ”زرغونہ انا“ تک پہنچی تو اس نے کمال تمکنت سے کہا..... ”نا ممکن! میرا بیٹا مر سکتا ہے لیکن میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھا سکتا۔“ افغان اپنے اس بہادر سپوت کو محبت و عقیدت کے ساتھ ”احمد شاہ بابا“ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ احمد شاہ بابا کے مزار پر کندہ ہے.....

می رسداز ہر طرف در گوش بدخواہان او
از زبان خنجرش ہر دم ہزاراں سرزنش

اپنے تیز و ہار خنجر کی زبان سے زمانے بھر کے بدخواہوں کو ہر آن سرزنش کا سندیرہ بھیجے والا شاہ بابا شاید اب اپنے پہلو میں رکھے تین صندوقوں کا تحفظ بھی نہ کر سکے کہ سوارب مسلمانوں کی تلواریں کند ہو چکی ہیں اور آج کل ان کی شاموں کی دلپسند تفریح ٹیلی ویژن پر افغانوں کی بربادگی کا تماشا کرنا ہے۔

قدحار کے وسط میں شاہ بابا کے خوبصورت مقبرے کے پہلو میں ایک پر شکوہ اور عالی شان عمارت کے اندر یکے بعد دیگرے تین منقل صندوق بڑی حفاظت کے ساتھ رکھے ہیں جن کی ہمہ وقت پاسبانی کی جاتی ہے۔

غزوہ احد میں رسول اکرم ﷺ کے دندان مبارک شہید ہونے کی خبر یمن کے حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو فرط اضطراب نے ان پر جذب کی عجیب کیفیت طاری کر دی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل پھوٹ پڑا اور انہوں نے اپنے دندان بھی توڑ ڈالے۔ مجذوبانہ شان رکھتے والے رئیس التابیین حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے عہد رسالت ﷺ میں عبا بنہ اسلام قبول کیا لیکن حضور ﷺ کی زیارت سے محروم رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا..... ”یمن سے ایک آدمی تمہارے پاس آئے گا جس کا نام اہلبیس ہوگا۔ وہ تابیین میں سے بہترین شخص ہوگا۔ تم میں سے جو شخص

بھی اس سے طے، امت کے لئے معفرت کی دعا کرائے۔" روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنا خرقہ مبارک حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو ارسال فرمایا جو انہوں نے دولت و عالم سے عزیز تر جانا۔ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے وفات کے بعد یہ خرقہ مبارک کئی واسطوں سے ہوتا ہوا بغداد، وہاں سے بلخ اور بلخ سے افغانستان کے صوبہ بدخشاں کے مقام جوزگان منتقل ہوا۔ احمد شاہ ابدلی بصد عقیدت و احترام خرقہ مبارک کو جوزگان سے قندھار لے آئے۔ قندھار پر طالبان کے قبضے کے بعد امیر المومنین ملا عمر اخوند نے شورائے عالیٰ کی اجازت سے ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں یکے بعد دیگرے تین صندوقوں کو کھولا اور خرقہ مبارک کی زیارت کی۔ اہل قندھار کو ستر سال بعد یہ سعادت نصیب ہوئی۔

ہمارے لئے ملا عمر کی اجازت سے خرقہ مبارک کی زیارت کا خصوصی اہتمام کیا گیا۔ یہ طالبان کی طرف سے ہمارے لئے پیش بہا تحفہ تھا جو آج بھی ہمارے دلوں کو جذب و کیف کی سرستیاں دے جاتا ہے اور ہرات میں محو خواب جامی کا شعر بے اختیار زبان پر آ جاتا ہے.....

در عشق تو دندان شکست است، بہ الفت

تو جامہ رسانید اویس قرنی را

لیکن جانے قندھار کس حال میں ہے؟ دو ہفتوں سے اس پر بسوں اور میزائلوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ کم بلندی پر اڑنے والے ایسے 130 طیارے جیل کوڑوں کی طرح منڈلا رہے ہیں اور ان میں سے ہر طیارہ بیک وقت سینکڑوں گولے برساتا ہے۔ کنکریٹ کے بکروں کے سینے میں دور تک اتر جانے والے بموں کے سامنے تین ہستی صندوقوں کی کیا حیثیت ہے؟

کیا یہ شہر جمال نابود ہو جائے گا؟ کیا شاہ بابا کا مقبرہ اور اس مقبرے کے پہلو میں کھڑی پر شکوہ عمارت بھی ڈھیر ہو جائے گی؟ کیا قندھار میں اترنے والے امریکی کمانڈوز کے ناپاک قدم مسجد کے طور پر استعمال ہونے والی اس عمارت تک بھی پہنچ جائیں گے؟ کیا تین مقفل صندوق بھی ان کی دستبرد میں ہوں گے؟ اور کیا وہ یکے بعد دیگرے ایک دوسرے کے اندر رکھے صندوقوں میں سے سب سے چھوٹے صندوق تک بھی پہنچ جائیں گے؟ اور کیا اس صندوق کے اندر.....

اس تصور ہی سے کلیجہ منہ کو آتا اور قلم پتکیاں لینے لگتا ہے؟

خدا نخواستہ ہمارے سینوں پر یہ گھاؤ لگ گیا تو اسے کتنے "ڈالروں" کا سرمایہ درکار ہوگا؟

[20-10-2001]

ابا بیلین کہاں ہیں؟

ماڈرن کنڈکاسات سالہ ضیاء اللہ حیران و مشہور ہے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق ٹیلی ویژن پر افغانستان کی تباہ حالی اور امریکہ کی ”انصاف پروری“ کے مناظر دیکھ کر معصوم بچے نے اپنے ابو سے پوچھا ”کروڑوں مسلمان افغانستان کی سلامتی اور امریکہ کی تباہی کے لئے دعائیں مانگتے ہیں لیکن ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟ ابھی تک مجاہدین نے کوئی جنگی جہاز کیوں نہیں گرایا؟ کل امریکہ، اسرائیل یا بھارت، پاکستان پر حملہ کریں گے تو کیا ہم بھی ان کے طیارے نہیں گرائیں گے؟ اللہ تعالیٰ ان طیاروں کی تباہی کے لئے ابا بیل کیوں نہیں بھیجتا۔“ ضیاء اللہ کے باپ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا کہ ہمارے ایمان کمزور ہیں۔ ہم میں جہاد کا جذبہ ختم ہو گیا ہے۔ اسلامی ممالک نے بھی افغان حکومت کی حمایت کے بجائے امریکہ کا ساتھ دیا ہے۔

ضیاء اللہ کے باپ نے یقیناً کئی دلائل دے کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی ہوگی لیکن معصوم بچوں کے پاس معاملات کو جانچنے اور پرکھنے کی اپنی کسوٹی ہوتی ہے۔ وہ زمینی حقائق کی نزاکتوں کو سمجھنے سے عاری ہوتے ہیں۔ رومانویت کی دنیا میں رہنے اور کہانیوں کی طلسماتی فضا میں مانس لینے والے ان بچوں کے احساسات کے آئینے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ وہ اس تعلق کی گہرائی تک بھی نہیں پہنچ پاتے کہ دنیا رومانویت کے دور سے آگے نکل آئی ہے اور اب سوچ کے تمام تر دھارے مفادات کے سرچشموں سے پھوٹنے اور مراعات کی خوشنما جنت میں جذب ہو جاتے ہیں۔ ملکوں کے باہمی تعلقات میں بھی یہی اصول کارفرما ہے اور انسانیت کی تہذیبی و اخلاقی اقدار سے تعلق رکھنے والے الفاظ، اصطلاحات اور تراکیب اب صرف کتابوں کے بوسیدہ اوراق میں باقی ہیں۔

ہاتھیوں کے لشکر کو کھائے ہوئے بھس میں بدل دینے والے اللہ کا فرمان ہے کہ وہ ایسی کسی قوم کی حالت تبدیل نہیں کرتا جسے خود اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو۔ ہمیں یقیناً اپنی حالت بدلنے کا خیال ہے بلکہ یہ خیال ہمہ وقت ہمارے اعصاب پر سوار رہتا ہے لیکن جہد مسلسل، عمل پیہم اور ایمان کامل کے ہتھیار کند ہو چکے ہیں۔ ہمیں لامحدود آسائشوں کی طلب نے اپنا بیج بنا دیا ہے۔ ہمارے دلوں میں دودھ اور شہد کی نہروں کی ترنا ہے لیکن تیشہ فرہارے کر سنگلاخ چٹانوں کا جگر پیرنے کا یار نہیں۔ ہم سب انکار اور غفلت شعار قبیلے کے لوگ ہیں جن کی پوری زندگی صرف ذات کے دائرے کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ ہم نعرے تراشنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن عمل کی دنیا میں ہمارے قدم ڈگرگانے لگتے ہیں اور دو چار گام چلنے کے ساتھ ہی سانس پھول جاتی ہیں۔ ہم قرضوں، مزید قرضوں، ری شیڈ ونگ، آسان شرائط، معافی، رعایت اور اہل کرم کی کشادہ دستی کو ہی اپنی کامرانی کا پیمانہ بنا چکے ہیں۔ فقیروں کا بھس بنانے کے بعد ہمارے انداز و اطوار بھی فقیروں جیسے ہو گئے ہیں۔ حواس غمہ رکھنے کے باوجود ہماری آنکھیں وہی منظر دیکھتی ہیں جو مغرب کا مصور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور ہمارے افکار انہیں دلائل سے سو پاتے ہیں جو مغرب کی دانش ہمیں سکھاتی ہے۔ کھائے ہوئے بھس جیسے لوگوں کی دعائیں تو چھت کی منڈیر تک نہیں جا سکتیں، عرش معلیٰ تک کیسے پہنچیں گی۔

ہمیں معلوم ہے کہ طالبان سادہ و معصوم لوگ ہیں جن کی امیدیں قلیل اور مقاصد جلیل ہیں۔ جولڈتوں اور آسائشوں کو مقصود حیات نہیں بناتے۔ جنہیں اللہ رسول کا نام لیتے، چہروں پر سنت رسول سجاتے، سردوں پر عمامے باندھتے، اللہ کے حضور سر جھکاتے اور روکھی سوکھی کھا کر "الحمد للہ" پڑھتے شرم نہیں آتی۔ انہوں نے خون کی ندیاں بہائے بغیر افغانستان کے نوے فیصد علاقے پر اپنی فرمانروائی کا سکہ جمایا۔ وہ جدھر بھی گئے، جہاں بھی گئے، آوارہ مزاج فوجی دھڑوں کے ستارے ہوئے عوام نے کھلی ہانہوں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے غربت، پسماندگی، بیروزگاری اور قحط سالی کے ستارے ہوئے معاشرے میں مثالی امن و امان قائم کیا۔ ہتھیاروں پر ناز کرنے والے قبائلی معاشرے کو ہتھیاروں سے پاک کرنے کا قابل رشک کارنامہ سرانجام دیا۔

اقوام متحدہ کی حالیہ رپورٹ بتاتی ہے کہ طالبان کے زیر قبضہ علاقے میں پوسٹ کی کاشت میں 94 فیصد کمی آگئی ہے جبکہ شمالی اتحاد کا علاقہ آج بھی پوسٹ کا گڑھ ہے۔ طالبان نے دنیا بھر کی

بہر ہمدردانہ اور جارحانہ سوچ کے باوجود کسی ملک کے معاملات میں مداخلت نہیں کی لیکن اس کے وجود ساری دنیا ان کے تعاقب میں ہے اور امریکہ کے جدید ہتھیاروں کے رپورٹ افغانستان کی چراگاہ میں دندناتے پھرتے ہیں۔ طالبان کے دل ایمان و یقین سے خالی نہیں ہوئے۔ انہیں یقین ہے کہ وہ حق پر ہیں۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو اگلے برس، ابا بیلین ضرور آئیں گی۔ امریکہ کے دیوید بیکل طیارے زخمی پرندوں کی طرح گریں گے۔ آٹار ابھی سے نظر آنے لگے ہیں۔ جو لوگ موت سے نہیں ڈرتے، موت ان سے دور بھاگتی ہے۔ یہ دنوں، ہفتوں اور مہینوں کی نہیں، سالوں اور صدیوں کی جنگ ہے۔ یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہاتھیوں والے کھائے ہوئے بھس میں تبدیل نہیں ہو جاتے۔

البتہ ضیاء اللہ کا یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ ہمارا کیا بنے گا؟

ابا بیلوں سے خالی آسمان بہر حال قبرستانوں کی طرح ایمان سے خالی دلوں کا مقدر ہوتے ہیں۔ ہمارا حال یہ ہے کہ کھلی آنکھوں سے سب کچھ دیکھنے، سب کچھ سمجھنے کے باوجود خاموش ہیں۔ اپنے سروں سے گزرتے بموں اور میزائلوں کے باوجود سکون کی گہری نیند سوتے ہیں۔ ڈائٹنگ ٹیمپل پر انواع و اقسام کے کھانے جا کر ٹیلی ویژن پر ایک پر ایک نوالے کے لئے بلکتے بچوں اور راکھ ہوتی بستیوں کا نظارہ کرتے ہیں۔ ہمارا کیا بنے گا؟

رہا امریکہ..... تو وہ بلاشبہ بدست عفریت کی طرح پھرا ہوا ہے۔ اسامہ اور ملا عمر کا پوچھنے کے بعد بھی اسے جین نصیب نہیں ہوگا۔ آج ابا بیلوں کے منتظر کتنے ہی ضیاء اللہ عالم اسلام کے گوشے گوشے میں اپنے اپنے ابو سے یہی سوال پوچھ رہے ہیں۔ انہیں کوئی شافی جواب نہیں مل رہا اور ان کے معصوم دلوں کی خلش دھیرے دھیرے دائمی نفرت میں ڈھل رہی ہے۔ آج امریکہ پوچھتا ہے۔

”تم لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہو؟ ہم تو بہت اچھے لوگ ہیں۔“

سات سالہ ضیاء اللہ اس کا جواب نہیں دے سکتا۔

”اچھے لوگ“ مکافات عمل سے بے نیاز، برے دنوں کی ایسی فصل بور ہے ہیں جس کا پھل امریکہ کی آنے والی نسلوں کے حصے میں آئے گا اور وہ کسی بلند و بالا عمارت کے طے کے پہلو میں کھڑی ہو کر اپنے صدر بٹش کی طرح پوچھیں گی۔

”تم لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہو؟“

تب ضیاء اللہ جوان ہو چکا ہوگا۔ وہ اپنے بچے کو بتائے گا۔

”بیٹا..... بعض اوقات ابا بلیں نظر نہیں آتیں لیکن وہ فضاؤں میں موجود رہتی ہیں۔

ہاتھیوں والوں کی بد مستی بڑھ جائے تو وہ انہیں کھائے ہوئے بھس میں بدل دیتی ہیں۔“ یہ سطور

لکھی جا چکی تھیں تو خبر آئی کہ امریکہ کا ایک ہیلی کاپٹر کریش ہو گیا اور دو امریکی فوجی ہلاک ہو گئے

ہیں، ضیاء اللہ سے اب کیا کہیں؟ اس تک بھی یہ اطلاع کسی نہ کسی طرح پہنچ چکی ہوگی۔ ابتدائے

عشق ہے.....

[21-10-2001]

افتاد کی داد طلبی

وزیر خارجہ جناب عبدالستار نے پی ٹی وی پر اپنا مقدمہ پیش کرتے ہوئے بعض اہم دلائل دیئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ”11 ستمبر کے بعد ہم نے طالبان کو بہت سمجھایا کہ تم شدید خطرے سے دو چار ہو، اگر تم نے سلامتی کونسل کی قرارداد پر عمل نہ کیا تو حالات بہت خراب ہو جائیں گے۔ افق پر خطرات منڈلا رہے ہیں اور آپ کا بہت نقصان ہوگا لیکن جب وہ خود کنویں میں چھلانگ لگانا چاہتے ہوں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

جناب عبدالستار نے ایک سوال کے جواب میں ان ثمرات کی تفصیل بتائی جو افغانستان کے خلاف جنگ میں امریکہ کا حلیف بننے سے ہمارے حصہ میں آئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اس پالیسی کے طفیل:

- (1) پاکستان بین الاقوامی دھارے کے عین وسط میں آ گیا ہے اور اس کی تنہائی ختم ہو گئی ہے۔
- (2) عالمی لیڈر اور زعماء مسلسل پاکستان آ کر ہم سے ہمدردی اور یکجہتی کا اظہار کر رہے ہیں۔
- (3) اگرچہ مالی مفادات کا حصول ہمارا مقصد نہیں لیکن ہماری معیشت کو فروغ حاصل ہوگا۔ یورپی منڈیاں ہمارے لئے کھل رہی ہیں۔ برآمدات میں اضافہ ہوگا اور نئی صنعتیں لگیں گی۔
- (4) ہم نے دوستوں سے کہا ہے کہ ہماری صحیح اور ٹھوس مدد کرنا چاہتے ہیں تو قرضوں کے سلسلے میں مدد کریں مثلاً سود میں کمی اور ادائیگی کی میعاد میں مہلت۔

وزیر خارجہ کے ارشادات پر ایک مقالہ تحریر کیا جاسکتا ہے۔ میں یہ علمی و تحقیقی کام براہِ ارشاد عارف کے لئے چھوڑ دیتا ہوں۔ جہاں تک ثمرات کے اقتصادی پہلو کا تعلق ہے، اس کا حال وزیر خزانہ شوکت عزیز نے بیان کر دیا ہے۔ گزشتہ روز انہوں نے انکشاف کیا کہ ”ابھی تک صرف اطلاعات ہی ہوئے ہیں، عملاً کچھ نہیں ملا۔“

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ”جتنی حالات کی وجہ سے قومی معیشت دو ارب ڈالر کے نقصان سے

دو چار ہے اور امریکہ سمیت مختلف ممالک نے جو کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے اس کی مجموعی مالیت 80 کروڑ ڈالر ہے۔ "عالم یہ ہے کہ آج بھی پاکستان پر اندرونی اور بیرونی قرضوں کا بوجھ باسٹھ ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے جن میں سے بیرونی قرضے سینتیس ارب ڈالر سے زیادہ ہیں۔ اس سال ہم نے قومی بجٹ کا 47 فیصد حصہ قرضوں اور سود کی ادائیگی کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ امریکہ، عالمی بینک، ایشیائی ترقیاتی بینک اور یورپی یونین کی طرف سے "مرہم پنی" کے سوا کچھ نہیں مل رہا۔ آئی ایم ایف نے غربت کے خاتمے کے لئے 25 بلین ڈالر کی فراہمی کا بھی یقین نہیں دلایا۔ ہمیں توقع تھی اور آج بھی اس کا موہوم سارشتہ ختم نہیں ہوا کہ شاید ہمارے قرضے معاف ہو جائیں لیکن یہ خواب اب بکھرتا جا رہا ہے۔ عالمی مالیاتی اداروں کے تیرہ ارب ڈالر سے زائد کے قرضوں کی معافی کا کوئی امکان نہیں۔ پیرس کلب کا واجب الادا قرضہ 12 بلین ڈالر ہے جس میں سے 5 بلین صرف جاپان کا ہے۔ صدر مشرف کی طرف سے جاپانی وزیر اعظم سے کیا جانے والی براہ راست درخواست کے باوجود کوئی مثبت جواب نہیں ملا اور اب شوکت عزیز خود زمین ہموار کرنے جا رہے ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ جاپان کی طرف سے کسی قابل لحاظ رعایت کا امکان نہیں۔ پیرس کلب کے باقی 7 ارب ڈالر امریکہ اور جی سی ڈون کے دوسرے ممالک کے ہیں۔ ہمیں توقع تھی کہ افغانستان پر پہلا میزائل گرنے سے پہلے امریکہ کم از کم 7 ارب ڈالر کے قرضے سے ضرور تجاوت دلا دے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ساری بونڈ بانڈی، ملا کر بھی شاید ایک ڈیڑھ ارب ڈالر کی معافی نہ مل سکے۔

دوسری طرف نقصانات کا حجم اندازہ و امکان سے کہیں زیادہ ہے۔ برآمدات کا ہدف پہلے ہی دو ارب ڈالر کے لگ بھگ کم کیا جا چکا ہے۔ محصولات میں بھی نمایاں کمی آرہی ہے۔ کساد بازاری نے کاروباری اور صنعتی سرگرمیوں پر شدید منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔ اندرونی سرمایہ کاری جامد ہے اور بیرونی سرمایہ کاری کم و بیش ایک عشرے تک ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ امریکہ اور مغربی ممالک کی سرمایہ کاری پہلے ہی خطرے سے دوچار ہے اور ان کے مال کے بائیکاٹ کی اپیلیں ہو رہی ہیں۔ افغان مہاجرین کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ جنگ کے پہلے ہی جھکے سے ہمارا بجٹ خسارہ تشویشناک حد تک بڑھ گیا ہے اور باہر سے ملنے والی ساری امداد صرف اسی خسارے کا پیٹ بھرنے پر صرف ہو جائے گی۔ اٹھائی جانے والی پابندیاں محض رکھی ہیں اور سرطان زدہ قومی معیشت کو حیات نو کا مڑ نہ نہیں سنا سکتیں۔ یوں بھی ان کا بڑا مقصد امریکی اسلحے کی نئی منڈیاں تلاش کرنا ہے۔

ترقیاتی کام رک گئے ہیں۔ غازی بروقتھارا جیکٹ پر کام غیر معینہ عرصے کے لئے بند ہو چکا ہے۔ گوادر کی بندرگاہ، سینڈک پراجیکٹ، سکران کوشل ہائی وے سب کچھ خیال و خواب ہو چکا ہے۔ ایران سے بھارت جانے والی پائپ لائن کا پلان سردخانے میں چلا گیا ہے۔ حکومت نے درجنوں میگا پراجیکٹس کی نوید سنائی تھی لیکن یہ غنچے بن کھلے مرچھا چکے ہیں۔ انٹرنیشنل ادھر کارخ کرنا چھوڑ دیا ہے اور سول ایوی ایشن اتھارٹی کو روزانہ کروڑوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ سیاحت ختم ہو چکی ہے، پرائیویٹائزیشن کا عمل بھی رک گیا ہے۔ صنعتی و کاروباری سرگرمیوں کے انجماد، سرمایہ کاری کے فقدان، درآمدی و برآمدی کاروبار میں مندرے اور پاکستانوں کے لئے بین الاقوامی موسم ناخوشگوار ہو جانے کے باعث ڈالر کی طلب میں کمی آئی ہے اور ہم اسے بھی اپنی اقتصادی ہنرمندی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اگر جارج بوش کے عزائم کے مطابق افغانستان کو تاراج کرنے اور بستیوں کو قبرستانوں میں بدلنے کا عمل، پہاڑوں کو سرمہ بنانے تک جاری رہتا ہے تو پاکستان مسلسل اس آگ کا ایندھن بنا رہے گا۔ اس حقیقت کو جھٹلانے کی ضرورت نہیں کہ جنگ کا اصل مرکز پاکستان ہے، افغانستان تو محض نشانہ بازی اور چاند ماری کا اڈہ ہے۔ اس اجڑے دیار کی معیشت پہلے ہی آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے بے نیاز ہے۔ اس کے پاس نہ کچھ کھانے کو ہے نہ کھونے کو۔ لامحالہ اس کے حصے کا زیاں بھی ہماری جمہولی میں پڑے گا۔

بین الاقوامی دھارے کے عین وسط میں آنے یا "بھنڈور کی آنکھ کا تل" بن جانے میں کوئی فرق نہیں۔ دھارا تو نہ جانے کہاں نکل جائے گا لیکن ہم برسوں اسی گرداب میں غوطے کھاتے رہیں گے۔ وزیر خارجہ نے خود کہا ہے کہ "امریکہ ہم سے 1990ء والا سلوک دہرا سکتا ہے۔" بین الاقوامی لیڈروں اور زعماء کے اظہارِ کجی و ہمدردی کو ہماری مقامی ثقافت میں "پرسا" دینا کہتے ہیں۔ رہا یہ معاملہ کہ "ہمارے افغان بھائی خود کنویں میں چھلانگ لگانا چاہتے ہوں تو ہم کیا کریں؟" یقیناً ہم کچھ نہیں کر سکتے لیکن سوچ سمجھ کر، شعوری فیصلے کے تحت کنویں میں چھلانگ لگانے والے کے پاس اگلے مرحلوں کی کچھ نہ کچھ حکمت عملی ضرور ہوتی ہے البتہ اچانک کسی دستِ غیب کا دھکا کھا کر کنویں میں گرنے والے کو اگلے لمحے کی خبر بھی نہیں ہوتی۔

سر آڑنے والی ناگہانی افتاد کو حکمت و دانش کی قبائے افکار پہنانا اور ثمرات و نوازشات کے گوشوارے بنانا، کچھ اچھا نہیں لگتا، داد طلبی بھی سلیقہ مانگتی ہے۔

[22-10-2001]

رومانویت اور طالبان (۶)

پہلے ہمارے وزیر خارجہ اور اب دانشوروں کے ایک طبقے نے طالبان اور ان کے ہمنواؤں پر ذہنی تھاق نظر انداز کرنے اور ”رومانویت پرست“ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ جناب عبدالستار تو شاید نہ جانتے ہوں لیکن میرے اہل علم دوستوں کو یقیناً معلوم ہے کہ ”رومانویت“ انسانی فطرت کا ایسا پہلو ہے جو اسے دوسری مخلوق سے ممتاز کرتا اور ارفع اقدار کے لئے قربانی و ایثار کا حوصلہ دیتا ہے۔ اندھی مادیت فکر کے ہرزائیے اور عمل کے ہر پہلو کو نفع و نقصان کے حوالے سے دیکھتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسباب کی دنیا بڑی تلخ حقیقتیں رکھتی ہے اور جو لوگ انہیں پس پشت ڈال کر ”خودکشی“ کی راہ پر چل نکلتے ہیں وہ بلاشبہ کم حکمتی اور بے بصیرتی کے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ کوئی مذہب، کوئی اسلوب تہذیب اور کوئی فلسفہ حیات اس امر کی تلقین نہیں کرتا کہ ظاہری اسباب نظر انداز کر کے محض عقائد و نظریات یا رومانوی تصورات کو اپنی ڈھال بنا لیا جائے اور ساری توقعات صرف فیضانِ سماوی سے وابستہ کر لی جائیں۔

ایمان و یقین کی بلند ترین رفعتوں سے ہمکنار انبیاء نے بھی ایسا نہیں کیا اور حضور ختمی مرتبت ﷺ نے بھی کفار سے نیچے آزمائی کرتے وقت کبھی گھوڑوں اور تلواروں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا بلکہ اپنے رب کی طرف سے اپنے گھوڑے تیار رکھنے کا حکم بھی سنایا ہے۔ مومن کو تحقیق و جستجو، فکر و تدبر اور حکمت و دانش کا درس دیا گیا ہے اور اس تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ جدید علوم پر دسترس حاصل کر کے سائنسی ایجادات کے ذریعے عصر حاضر پر برتری حاصل کی جائے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں اس کے مظاہر کثرت سے ملتے ہیں لیکن ذہنوی اسباب کے ساتھ ساتھ ایمان و یقین کی پختگی، حق پر ہونے کا اعتماد اور اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت پر بھروسہ مومن کا اہم قرار پاتے ہیں۔ ظاہری اور باطنی قوت کا استخراج ہر مرد مسلمان کو مثالی ہانگین عطا کرتا اور باطل قوتوں

سے کمرانے کا حوصلہ دیتا ہے۔

مادی حقائق کے شعور کے باوجود رومانوی تصورات سے محرومی ایک ایسا آشوب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہئے۔ اگر ایک فرد کا دل اس سے عاری ہو جائے تو اس کی عزت و ناموس کے سارے داہنے دم توڑ بیٹھتے ہیں اور ایک قوم یہ دولت گنوا بیٹھے تو وہ راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ اس کے بعد فرد اور جماعت دونوں کے لئے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ وہ ہر طاقتور کے سامنے گردن جھکا دیں اور زندگی کو غیرت و حمیت کے حوالے سے نہیں، سانسوں کے تسلسل کے پیمانے سے جانچیں۔ یہ وہ معیار ہے جو صرف ایک ہی جنگی حکمت عملی کی طرف اشارہ کرتا ہے ”اگر طاقت رکھتے ہو تو دوسروں کو مارو، اگر طاقت نہیں رکھتے تو بغیر لڑے ہتھیار ڈال دو۔“ اس حکمت عملی کی تبلیغ کرنے والے دانشور نہیں جانتے کہ وہ انسان کو کس دشت بے اماں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ باوقار زندگی کا تقاضا ہے کہ اہل حقیقتوں کے باوجود ”رومانویت“ ذہن و قلب کے کسی نہ کسی گوشے میں ضرور موجود رہے۔

اسی رومانویت کی کوکھ سے جرات و شجاعت کا وہ جوہر پھوٹتا ہے جو بے سرو سامانی اور کم مائیگی کے باوجود کسی اصول، کسی بالا تر نظریے، کسی ملکوئی تصور یا کسی رومانوی آدرش کے لئے سب کچھ ناپ دینے کا عزم عطا کرتا ہے۔ جدید ترین ہتھیاروں سے لیس قومیں بھی ”رومانویت“ کے احساس کو زندہ رکھتی ہیں کیونکہ مشین محض احساس تحفظ اور رومانویت جان لڑانے کا جذبہ دیتی ہے۔ جب پاکستان کی فوج ایف-16، جدید ترین آبدوزوں، برق رفتار ٹینکوں، شاہین اور محوری میزائلوں، ایٹمی قوت اور سخت ترین تربیتی مراحل کے باوجود اپنی چھاؤنیوں کے ماتھے پر ”ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ“ کا جھومر جاتی ہے تو دراصل وہ اسی ”رومانویت“ کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ جب ہم اپنی جنگی مشقوں کو ”ضرب مومن“ کا نام دیتے اور اپنی پلٹوں کو مشاہیر اسلام کے نام سے منسوب کرتے ہیں تو ہمارا مقسود ”رومانویت“ کی اس چنگاری کو بجھنے سے بچانا ہوتا ہے۔ امریکہ دنیا کی مہلک ترین جنگی مشینری کے باوجود جب ایک نعتی اور مفلوک الحال قوم پر چڑھائی کرتا ہے تو صرف پٹا گون اور درلڈ ٹریڈ سنٹر کا بدلہ لینے کی بات نہیں کرتا۔ وہ اپنی قوم اور اپنی سپاہ کو ”آزادی کے تحفظ کے لئے عزم و استقلال کے ساتھ ایک طویل جدوجہد“ (ENDURING FREEDOM) کا رومانوی پیغام دیتا ہے۔ بھارت کے تمام میزائلوں کے نام ان کے

سورماؤں کے نام پر ہیں اور برطانیہ جیسی ترقی یافتہ قوم نے اپنی جمہوریت کو ابھی تک صدیوں پرانی بادشاہت کی "رومانویت" پر ہٹا رکھی ہے۔

"رومانویت" قائدے اور خسارے کا الگ پیمانہ رکھتی ہے۔ وہ حکمت و دانش کی آنکھ پر پٹی باندھ کر کسی "رومانوی تصور" کے لئے معرکہ آرا ہونے پر ابھارتی ہے۔ جب حضور ﷺ گھوڑوں اور تین سو جانبازوں کے ساتھ دوسواہن پوش گھڑسواروں سمیت ایک ہزار مسلح افراد کے لشکر سے نکلے ہیں تو ان کے پاس کسی دانش زدہ ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے کوئی "منطق" نہیں ہوتی۔ منطق ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں ہوتی جو زندگی اور موت کے سطحی تصور سے بلند ہو کر کسی بالاتر آدرش کی "رومانویت" میں مبتلا ہوتے ہیں۔ منطق نہ بھڑکتی آگ میں کود پڑنے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تھی، نہ ہسپانیہ کے ساحل پر اپنے جہازوں کو نذر آتش کر دینے والے طارق بن زیاد کے پاس اور نہ زندگی کو ماہ و سال کے بجائے گیندر اور شیر کے استعاروں سے سمجھنے والے ٹیپو سلطان کے پاس۔

منطق طالبان کے پاس بھی نہیں ہے۔ وہ بھی گئے زمانوں کی ایک "بوسیدہ رومانویت" کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ جانتے ہیں کہ ہزاروں یادندہ زنی ہم ان کے پر نچے اڑادیں گے۔ جانتے ہیں کہ وہ امریکہ کی قاہری کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جانتے ہیں کہ دنیا بھر کو ساتھ لے کر حملہ آور ہونے والی عظیم سپر پاور افغانستان کو خاک کا پیوند بنا سکتی ہے اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے گھروں کے اندر اور گھروں کے باہر بچانے کو کچھ نہیں۔ صرف دلوں میں رومانویت کی چنگاری دکھ رہی ہے۔

امریکہ انہیں میزائلوں اور بموں سے مار رہا ہے۔ ہم ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے منطق و دانش کے کوڑے برسار رہے ہیں۔

[24-10-2001]

رومانویت اور طالبان (2)

امت مسلمہ کے رومانوی تصور کو ایک طرف رکھ دیجئے اور گیارہ ستمبر کے بعد کے واقعات کا غیر جانبداری سے جائزہ لیجئے۔ افغانستان پر غیر منصفانہ امریکی یلغار کے حوالے سے طالبان کے ساتھ کھڑا ہونا کسی مذہبی رشتے کا نہیں، انسانیت کا تقاضا ہے۔ اگر ہم اپنے مخصوص مفادات یا قومی تقاضوں کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو اپنی اس مجبوری و معذوری کو منطقی اور استدلال کا جامہ پہنانے کی ضرورت نہیں۔ طالبان نے تو شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ امریکہ کسی غیر جانبدار ملک یا فورم کو سارے شواہد فراہم کر دے، ہم اسامہ اس ملک یا فورم کے حوالے کر دیں گے۔ اگر وہ بادی النظر میں مجرم دکھائی دے تو اس پر کسی غیر جانبدار عدالت میں مقدمہ چلائیں۔ انہوں نے تو آج بھی مذاکرات کا راستہ بند نہیں کیا۔ بے چگ رعزت کا مظاہرہ تو دوسری طرف سے ہو رہا ہے۔

معاملات کو وسیع تر تناظر میں دیکھے بغیر حقیقت واضح نہیں ہوگی۔

امریکہ اپنا مخصوص تہذیبی مزاج رکھتا ہے۔ وہ کسی طور یہ حق دینے کے لئے تیار نہیں کہ کوئی دوسرا ملک کسی بھی بہانے اس کی تہذیبی و ثقافتی شناخت پر حملہ کرے۔ اگر وہاں پر ”ہم جنس پرستی“ کو قانونی تحفظ دے دیا جاتا ہے یا کنواری ماؤں کے حقوق کا چارٹر منظور ہوتا ہے یا برہنگی انسانی آزادی کی ایک ادا قرار پاتی اور شادی کے بغیر گھر بسانے کی اجازت دے دی جاتی ہے یا مرد، مرد کے ساتھ بطور بیوی رہ سکتا ہے تو افغانستان یا کسی بھی اسلامی ملک کو اس کے خلاف احتجاج کرنے کا حق نہیں۔ اسی طرح افغانستان کے عوام بھی اپنی ثقافت، اپنی تہذیب اور اپنی معاشرت رکھتے ہیں۔ انہیں اس پر عمل پیرا ہونے اور فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ اپنی آزاد روی کی حفاظت کے لئے ہبلک ترین ہتھیاروں سے یلغار کرنے والوں کو دوسروں کے اسلوب حیات کا بھی احترام کرنا چاہئے، چاہے وہ ان کی نظر میں کتنا ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اگر ہم ساحل سمندر پر اٹھکیلیاں کرتی برہنہ خواتین کو ”شرم دھیا“ کا درس دیتے کا حق نہیں رکھتے تو افغان خواتین کو بے حجاب کرنے اور

ان کے نقاب لوچنے کا اختیار کسی دوسرے کو کیسے دیا جاسکتا ہے؟

طالبان کو کن جرائم کی سزا مل رہی ہے؟ یہ کہ وہ خواتین کے حقوق کا احترام نہیں کرتے؟ یہ کہ وہ پردے کی پابندی کراتے ہیں؟ یہ کہ وہ ڈاڑھیاں رکھتے ہیں؟ یہ کہ وہ کڑی سزائیں دیتے ہیں؟ یہ کہ وہ تصویر نہیں بنواتے اور ٹیلی ویژن نہیں دیکھتے؟ یا یہ کہ وہ جمہوری طور پر منتخب حکمران نہیں ہیں؟ دنیا کے بہت سے ممالک میں اس نوع کے جرائم کا ارتکاب ہو رہا ہے لیکن وہ سب امریکہ کے حلقہ رفاقت میں ہیں۔ جن چھپن اسلامی ممالک کو جارج بش نے خراج تحسین پیش کیا ہے ان میں پچاس سے زائد جمہوریت سے محروم ہیں۔ طالبان کا اصل جرم یہ ہے کہ وہ امریکی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے وسیع تر اہداف و مقاصد کا آلہ کار نہیں بنے۔ وہ ایک ایسی مستحکم نظریاتی اساس پر ڈٹے ہوئے ہیں جس سے امریکہ خوف کھاتا ہے۔ کیونکہ خطرے کو گہری قبر میں دفن کرنے کے بعد وہ اس کو انا نظرینے کی قوت کو ختم کر دینا چاہتا ہے جو امریکہ یا مغرب کی تہذیب، اس کے سیاسی مقاصد اور اس کی اجارہ داری کی مزاحمت کر سکتا ہے۔ سابق امریکی نائب صدر اور بش کے مقابلے میں صدارت کے امیدوار مسز الگورتو کوئی بار کہہ چکے ہیں کہ ”کیونکہ کوئٹہ دینے کے بعد ہمارا مقابلہ اسلام کے ساتھ ہے“ اس وقت مقابلہ افغانستان، ملائیشیا، اسامہ کے ساتھ نہیں امریکہ کا نشانہ اسلام ہی ہے۔ پاکستان افغانستان کے مقابلے میں معتدل ملک سمی لیکن دو قومی نظریہ اس کی بنیاد ہے اور اس نظریے کی بنیاد اسلام ہی ہے۔

تصور کیجئے! اگر کل امریکہ انہی دلائل کے زور پر جو اس نے عیارہ تمبر کو پاکستانی قیادت کے سامنے رکھے تھے، ہمیں کہتا ہے کہ کشمیر کی رٹ لگانا چھوڑ دو۔ موجودہ لائن آف کنٹرول کو مستقل سرحد تسلیم کر لو ورنہ تمہیں پتھر کے زمانے میں واپس دین گے، تو ہم کیا کریں گے؟ کیا ہم اس وقت بھی اپنے ایشی پروگرام کے تحفظ کے لئے یہ کڑوا گھونٹ پی لیں گے؟ اور پھر اس وقت ہمیں کیا کرنا ہوگا جب امریکہ، سلامتی کونسل کے کسی تازہ وارنٹ کے ساتھ ہمارے دروازے پر دستک دے گا اور کہے گا ”ایشی تھیبیاٹ کی سنجیاں ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم سب کچھ بھسم کر ڈالیں گے۔“ کیا زندگی اور موت کے اس معرکہ میں ہمیں ”رومانویت“ کی ضرورت نہیں پڑے گی؟

مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے نامہ اعمال کی تیرگی، مغرب کی زلف میں پہنچ کر حسن بن جاتی ہے۔ جن باتوں کی آڑ لے کر طالبان کو مطعون کہا جاتا ہے، وہ امریکہ میں قانون کی بالادستی اور

انصاف کی عملداری کہلاتی ہیں۔ کوئی خاتون یا مرد صحافی، ویزا یا کسی بھی دوسری قانونی دستاویز کے بغیر، افغانستان میں داخل ہو جائے اور انتظامیہ اسے گرفت میں لے کر پوچھ گچھ کرے تو ساری دنیا طوفان کھڑا کر دیتی ہے اور ہم بھی روشن خیالی کے زعم میں شریک احتجاج ہو جاتے ہیں۔ کوئی سو رہا بنیروز امریکی سرحد کے اندر گھس کر دکھائے۔

سابق صدر کلنٹن نے خود انکشاف کیا ہے کہ اکتوبر 1999ء میں انہوں نے اسامہ کے قتل کے احکامات جاری کر دیئے تھے اور اس فرمان پر عمل ہونے ہی والا تھا کہ پاکستان میں حکومت بدل گئی۔ تب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی ایک سو دس منزلیں سلامت تھیں اور پیدھان شعلوں کی لپیٹ میں نہیں آیا تھا۔ 11 ستمبر کو مجرم کا کھرا نیویارک اور واشنگٹن سے کابل اور قندھار تک نہیں آیا۔ یہ کھرا کابل اور قندھار سے وہاں تک پہنچایا گیا ہے۔ امریکہ بہانے کی تلاش میں تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ طالبان اسامہ حوالے کر کے اس حربے کو ناکام بنا سکتے تھے۔ لیکن کیا امریکہ اس کے بعد کوئی اور فرمائش نہ کرتا؟ کیا پھر ملا عمر کا مطالبہ نہ ہوتا؟ یقیناً جاننے یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا جب تک امریکہ کو اپنا اسلحہ آزمانے کا موقع نہ ملتا۔

امریکہ کو نہ اسامہ سے دلچسپی ہے نہ طالبان کو کابل سے بے دخل کرنے میں۔ جب صدر بوش اور امریکی پالیسی ساز سالوں اور عشروں تک جنگ جاری رکھنے کی بات کرتے ہیں تو ان کے حقیقی عزائم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ غارتگری کا موجودہ سلسلہ جاری رہا تو چند دنوں بعد افغانستان کسی ذی رذخ سے عاری ویران سیارہ بن جائے گا..... تو پھر سال اور عشرے کس لئے؟

طالبان نے بلاشبہ خسارے کا سودا کیا ہے لیکن یقیناً جاننے، فہم و فراست، عقل و دانش اور حکمت و تدبیر کا ذخیرہ رکھنے والوں کو بھی، کسی نہ کسی مرحلے، کسی نہ کسی موڑ پر خسارے کا سودا کرنا اور نیم جاں رومانویت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اکیسویں صدی کے عنقریب نے ابھی بہت سی شہ رگوں کا لہو چینا ہے۔ افغانستان، عراق، شام، لبنان، انڈونیشیا، ملائیشیا، پاکستان، ایران..... اور نہ جانے کون کون.....

اور دانشور دوستوں سے صرف اتنی التماس ہے کہ خدارا، ڈھیروں دانش کے باوجود تھوڑا سا جنوں، تھوڑی سی دیوانگی، تھوڑی سی رومانویت باقی رہنے دیجئے کہ یہ خیمہ بھی لٹ جائے تو شام غریباں بڑی کٹھن ہو جاتی ہے۔

[25-10-2001]

امریکہ کا نظریہ ضرورت

دن اور رات کی تیز کے بغیر، امریکی میزائل اور بم افغانوں کے پرچے ازار ہے ہیں۔ بچے کچھ لوگ پناہ کی تلاش میں سرحدوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ بی بی سی کے مطابق جلال آباد اور قندھار جیسے شہروں کی ستر فیصد آبادی نامعلوم منزلوں کی طرف نکل گئی ہے اور امریکہ سائنس سائنس کرتی بستیوں میں وہاں کے ”عوام“ کی اسٹگوں کے مطابق ایک وسیع البیاد حکومت تشکیل دینے میں مصروف ہے۔

دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کی حیثیت سے امریکہ نے خود ہی یہ استحقاق حاصل کر لیا ہے کہ وہ دنیا کے ایک سو نوے کے لگ بھگ ممالک میں سے جہاں چاہے، اپنی مرضی و منشا اور پسند کے مطابق حکومت تخلیق کرے۔ وہ جمہوریت کا علمبردار اور عوام کے بنیادی حقوق کا مبلغ ہے۔ اس نے اپنے ملک کے اندر، اپنے آئین کے مطابق ایک نظام وضع کر رکھا ہے جس کے باعث سارے امور مملکت طے شدہ طریقہ ہائے کار کے مطابق چلتے ہیں۔

ایک ”بالغ نظر اور روشن خیال“ عالمی طاقت کے طور پر وہ ہمیشہ اس امر کی تلقین کرتا ہے کہ مختلف ممالک میں جمہوری نظام کار فرما ہو۔ عوام خود اپنی آزادانہ رائے سے اپنے حکمرانوں کا انتخاب کریں لیکن نظریہ ضرورت کے تحت وہ کسی بھی نوع کی حکومت کو سند جواز عطا کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کی محبوباؤں میں جمہوری، شخصی، فوجی، یک جماعتی، موروثی، شاہی، آمرانہ اور قاہرات سبھی قسم کی حکومتیں شامل ہیں۔ کسی بھی حکومت کے لئے امریکہ کے سیاسی حرم میں جگہ پانے کی واحد شرط یہ ہے کہ وہ امریکی عظمت کی قصیدہ خواں اور اس کے عزائم کی پاسباں ہو اور اپنے عوام کے جذبہ و احساس کے بجائے امریکی حکمرانوں کی اقتاد طبع کے مطابق عمل کرے۔

افغانستان پر حالیہ بمباری اور کوچہ و بازار کی تباہ کاری کا مقصد بھی وہاں ایک مستحکم اور ہمہ رنگ حکومت قائم کرنا ہے جسے ”وسیع البیاد حکومت“ کا نام دیا گیا ہے۔ روس کا عمل دخل ہونے

کے بعد سے امریکہ کئی بار اس نوع کی حکومت کے قیام کی کوششیں کرتے کرتے طالبان تک پہنچا تھا۔ اس عمل میں کئی سال صرف ہو گئے لیکن پھر معلوم ہوا کہ دینی مدارس کے یہ نوجوان، جو جہاد افغانستان کا اثاثہ تھے، خاصے خودسرواقت ہوئے ہیں لہذا انہیں افغانستان کے منظر سے ہٹانے کے مشورے ہونے لگے۔ اس مقدس مشن کا بنیادی محرک یہ بتایا گیا کہ اکثریت کی نمائندگی کرنے کے باوجود طالبان کو پورے افغانستان پر حکمرانی کا حق نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس کے شمال میں ازبک، تاجک اور ہزارے بھی بستے ہیں اور حکومت میں ان کا حصہ ضروری ہے۔ دنیا کی ہر نسل میں جمہوریت کا مطلب اکثریت کا حق حکمرانی ہے۔ خود جارج بوش ایک موہوم سی ٹیکنیکل اکثریت کی بدولت صدر امریکہ بنے بیٹھے ہیں لیکن افغانستان کے لئے جمہوریت کا مفہوم، اکثریت کا حق حکمرانی نہیں، ہر نسل، ہر مسلک اور ہر طبقے کی شمولیت ہے۔

یہ معاملہ پچھلے تین سالوں سے گرم ہے۔ اس دوران جتنے بھی عالمی زما پاکستان تشریف لائے، انہوں نے افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت کے قیام کی بات ضروری کی۔ آکاش نیل جیسے بے بنیاد حکمرانوں نے بھی اسے ٹھیک کلام بنالیا۔ اقوام متحدہ بھی سرگرم ہو گئی۔ نیل منڈے تہ چھ کی توہیناگان اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے پلے سے افغانستان میں ایک وسیع البنیاد حکومت کے خدوخال تراشنے کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ امریکہ اپنی بھرپور عسکری قوت کے ساتھ طالبان پر ٹوٹ پڑا۔ یہ سخت جان لوگ آتش و آہن کی بارش کے باوجود ڈنرے رہے اور اب عالم یہ ہے کہ امریکہ اور روس اپنی سپاہ آتھیا روں اور طیاروں کے ہمراہ شمالی اتحاد کے شانہ بشانہ آکھڑے ہوئے ہیں۔ جنرل فہیم اور جنرل رشید دوہتم کی راہنمائی امریکی اور بھارتی ماہرین کر رہے ہیں۔ ڈالر پانی کی طرح بہائے جا رہے ہیں اور اسلحہ کی سپلائی لائن ٹوٹنے نہیں پارہی۔ امریکی بمبار طیارے طالبان کے اگلے مورچوں پر بمباری کرتے ہوئے، اپنی محفوظ چھتری تلے شمالی اتحاد کو مزار شریف اور کابل کی طرف ہانک رہے ہیں لیکن وسیع البنیادی کی منزل کو جانے والا یہ قافلہ بڑا است گام ثابت ہو رہا ہے۔ پاکستان نے طالبان کی حکومت کو تسلیم کر رکھا ہے لیکن وہ بھی اپنی تسلیم شدہ حکومت کی آخری ہنگی کے لئے لمحے گن رہا ہے۔ چاروں طرف سے گھرے ان دیوانہ خونندگان خدا کا دائرہ حکمرانی نوے فیصد افغانستان پر محیط ہے لیکن امریکہ کا کہنا ہے کہ جب تک طالبان مکمل طور پر معدوم نہیں ہو جاتے اور وہ فیصد افغانستان پر قابض بھان تھی کا کتبہ کابل نہیں ہٹتا، وسیع البنیاد حکومت

قائم نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وسیع البیاد کا مفہوم تاجک، ازبک، ہزارہ اور پنجتنوں پر مشتمل حکومت نہیں، بلکہ اس سے مراد ایسی سلیقہ شعار اور خوش جمال حکومت کا قیام ہے جس کی دلبرانہ ادائیں بیک وقت امریکہ، روس، بھارت، ایران اور کسی قدر پاکستان کو بھی لبھاسکیں۔ طالبان حکومت گزشتہ چالیس سالوں کے اندر افغانستان میں قائم ہونے والی سب سے مستحکم حکومت تھی جس نے افغانستان میں مرکزیت کا تصور پختہ کیا اور انتشار کاراستہ روکا لیکن وہ صرف پاکستان کی تسکین قلب کا سامان تھی۔ یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی لہذا اب ایک ایسی ہرولعزیز حکومت کی راہ ہموار ہو رہی ہے جس کی دلربائی تمام پڑوسیوں، تمام متعلقہ فریقوں اور سب سے بڑھ کر امریکہ کا دل لبھاسکے۔ یہی ”وسیع البیاد“ کی اساس ہے۔

بی بی سی اور سی این این کے رپورٹرز محاذ پر بیٹھے شمالی اتحاد کی پیش قدمی کی نوید دے رہے ہیں لیکن طالبان کا سورج غروب ہونے میں نہیں آ رہا۔ چیلیں اور گدھ افغانستان کے جھلے ہوئے درختوں کی سلگتی شاخوں پر بیٹھے لاش گرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ پاکستان میں کسی نام نہاد ”اسمبلی برائے امن و جمہوریت“ کا ایک غول جمع ہے۔ روم میں ایک معذور اور مخبوط الحواس بوڑھا عروس اقتدار کی آرزو میں دو لہا بنا بیٹھا ہے۔ جس پاکستان کو یقین دلایا گیا تھا کہ شمالی اتحاد کی پیٹھ نہیں ٹھونگی جائے گی، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹھکست خواب کا منظر دیکھ رہا ہے۔

آج امریکہ کا نظریہ ضرورت ایک بار پھر حرکت میں ہے۔ افغان آبادیوں پر پانچ پانچ ہزار پونڈ وزنی بموں کی گھن گرج میں، افغان عوام کی آزادانہ مرضی و منشا کے مطابق، ایک وسیع البیاد حکومت جنم لینے کو ہے۔ اس کے سفارتخانے دنیا بھر میں ہوں گے۔ اس کی آمد کے ساتھ ہی افغانستان میں چار سو رنگ و نور کا سیل اٹھے گا۔ لاکھوں سمارٹ بم اور ہزاروں بارودی سرنگیں پھولوں کی طرح کھل اٹھیں گی۔ کوہ ہندوکش کے سینے سے دودھ اور شہد کے جھرنے پھوٹیں گے۔..... اور ہم ملا عبدالسلام ضعیف کو کسی مہاجر کیپ کی طرف دھکیل کر مطمئن ہو جائیں گے لیکن سنا ہے کہ ضرورت کے تحت تبدیل ہو جانے والے نظریے، ضرورت کے تحت ٹھکانے بھی بدل لیتے ہیں۔

[26-10-2001]

روح محمد ﷺ

علامہ اقبال نے ابلیس کی زبان سے بیروکاران ابلیس کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ”افغانیوں کی غیرت دینی کا علاج یہ ہے کہ ”ملا“ کو افغانستان کے کوہ و دامن سے نکال دیا جائے اور موت سے نہ ڈرنے والے ان فاقہ مستوں کے سینے، روح محمد ﷺ، سے خالی کر دیئے جائیں۔“

امریکہ ساری دنیا کو جلو میں لئے ابلیس کے اس فرمان کو رو بہ عمل لانے کی کوشش میں ہے لیکن منزل مراد کے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔ یوں لگتا ہے جیسے ابا بلیس بہت دور ”بلندی پر“ سات آسمانوں کے آس پاس اپنے ننھے پر پھڑ پھڑانے لگی ہیں۔ غرور سے تئی گردنیں آہستہ آہستہ جھک رہی ہیں، ”دہشت گردوں“ کو زمین کی اتھاہ گہرائیوں سے نکل لینے کا اعلان کرنے والوں کا لہجہ مر جھار رہا ہے اور ان کے دلوں میں بیٹھی پہاڑوں جیسی نخوت و کدورت روئی کے گالوں کی طرح اڑنے لگی ہے۔ بیس دن اور بیس راتیں گزرنے کو ہیں۔ اس صدی کی سب سے بڑی عسکری قوت یکہ و تنہا کھڑے بے مایہ افغانوں کو کلسٹر بموں سے مار رہی ہے۔ ان کی آبادیوں، ان کے ہسپتالوں، ان کی مسجدوں، ان کے ذخیروں، ان کی بسوں، ان کے خیموں اور ان کی کمین گاہوں پر ہر نوع کے بموں کی ہلاکت کاری آ رہی ہے۔ سورج سوانیزے پر کھڑا آگ برسا رہا ہے اور قیامت کی اس گھڑی میں طالبان کا سایہ بھی ان کا ساتھ چھوڑ چکا ہے۔ پاکستان سمیت تمام اسلامی ممالک، عالمی برادری کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں۔

ابا بلیس ابھی بہت دور ہیں۔ ان کے اترنے میں کچھ وقت لگے گا لیکن امریکی سپاہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر آف آپریشنز ریزر ایڈمرل سٹفل ایم نے کہا ہے کہ ”میں حیرت زدہ رہ گیا ہوں کہ طالبان کس مضبوطی کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں۔ وہ یقیناً زبردست جنگجو ہیں۔ مجھے تو ملا عمر پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ وہ نوشتہ دیوار سامنے دیکھ کر بھی نتائج سے بے نیاز ہے۔“

میں دنوں تک اپنے منہ سے جھاگ اڑانے والے امریکی وزیر دفاع رمز فیلڈ کا کہنا ہے کہ ”اسامہ کو پکڑنا زیادہ مشکل ہے، دنیا بہت بڑی ہے۔ اس میں بے شمار ممالک ہیں۔ اسامہ کے پاس بے تحاشا دولت ہے۔ اس کی حمایت کرنے والے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ اسے قتل کر بھی دیا گیا تو دہشت گردوں کا نیٹ ورک کام کرتا رہے گا۔ طالبان بہت سخت جان ہیں۔ وہ شکست کھانے کے لئے تیار نہیں۔“ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے بننائے ہوئے لہجے میں کہا ہے کہ ”رمضان کے تقدس کے باوجود حملے جاری رہیں گے۔“

حملے یقیناً جاری رہیں گے کیونکہ طاقت کے نشے میں بدست لوگ، اپنی شرمناک ہزیمت کو بھی طاقت کے مزید اظہار کی گرد میں چھپا لینا چاہتے ہیں۔ افغانستان میں 90 تمہیبات اور 9 نام نہاد نریننگ کیمپوں میں غارنگری کے بعد بھی طالبان اپنے مورچوں میں موجود ہیں۔ امریکی وزیر دفاع نے مہذب دنیا کو یہ خوشخبری بھی سنائی ہے کہ موجودہ گرم جنگ، سرد جنگ کی طرح بہت طویل ہو سکتی ہے۔ امریکہ کو اندازہ نہیں کہ اسے اس طویل جنگ کی کتنی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ افغانستان پر حملوں کی شکل میں وہ براہ راست تین سو ملین ڈالر روزانہ اس آگ میں جھونک رہا ہے۔ اب تک تیس ہزار سے زائد بم اور میزائل گرائے جا چکے ہیں جن میں سے ہر ایک کی قیمت لاکھوں ڈالر میں ہے۔ اتنی بڑی جنگی مشینری کو حرکت میں لانے، اس خطے تک پہنچانے اور یہاں موجود رکھنے پر کروڑوں ڈالر خرچ آ رہے ہیں۔ اسے پاکستان اور بعض دوسرے ممالک کو ”حق خدمت“ بھی ڈالوں کی شکل میں دینا پڑ رہا ہے۔ امریکی اکاؤنٹی پہلے ہی شدید دھچکا کھا چکی ہے اور فوری طور پر اس کے سنبھلنے کے آثار نہیں۔

افغانستان کی پوری معیشت کا حجم چار بلین ڈالر بتایا جاتا ہے جبکہ امریکہ حالیہ مہم کی پہلی قسط چالیس بلین ڈالر کی شکل میں ادا کر چکا ہے۔ صرف اسامہ کی روح قبض کرنے کے لئے ایک بلین ڈالر مختصر کئے گئے ہیں۔ ضحیح کی چند روزہ جنگ میں امریکہ نے جو ڈرامہ رچایا تھا اس میں نفع ہی نفع تھا۔ سیاسی اور سٹریٹجیکل مفادات کے علاوہ اس نے سعودی عرب سے کم و بیش ایک سو ساٹھ بلین ڈالر اور کویت سے 80 بلین ڈالر وصول کئے۔ کسی نہ کسی کھاتے کے نام پر وصولیوں کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رہنے والے لہاسوں میں لپٹے اور اندھیروں میں دور تک دیکھنے

والی مشینیں آنکھوں والے امریکی کمانڈوز افغانستان کی زمین پر قدم رکھنے کے تصور سے بھی ہراساں ہیں اور ادھر سرفردشوں کے کارواں تھمنے میں نہیں آ رہے۔ دیر اور بوئیر سے ساڑھے سترہ سو مجاہدین کا قافلہ روانہ ہوا تو کھلے میدان میں ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں نے دعاؤں کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔ ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ اپنے سروں پر اپنے بستر اور کندھوں سے اپنی رائفیں لٹکائے ان رومانوی کرداروں کی رخصتی کے وقت ڈیزھ من سونا، پچاس لاکھ روپے، منوں چاندی اور سینکڑوں طلائی گھڑیاں ان پر نچھاور کی گئیں۔

یقیناً جذبے، ہتھیاروں کا متبادل نہیں۔ بلاشبہ کروڑوں اور کلسٹر میزائل بے قابو اور بے مہار ہوتے ہیں لیکن بارہ فٹ لمبے کروڑ میزائلوں کو اپنی مسجدوں کے میناروں پر نصب کرنے اور ان سے بندھے لاؤڈ سپیکروں سے ”اللہ اکبر“ کی صدائیں بلند کرنے والے طالبان کو کون منائے گا؟ انہیں حکمرانی سے بے دخل کیا جاسکتا ہے۔ افغانستان کی سرزمین کو ان کی قتل گاہ بنایا جاسکتا ہے۔ کیسائی ہتھیاروں کے ذریعے کوہ ہندوکش کے غاروں کو اسامہ گلنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ ملا عمر کو قصہ پارینہ بنایا جاسکتا ہے لیکن اس ”روح محمد ﷺ“ کا کیا بنے گا جو چودہ سو سال سے جوں کی توں موجود ہے اور جو ہر کربلا کے بعد زندہ تر ہو جاتی ہے۔

ابابلیس ابھی بہت دور، سات آسمانوں کے آس پاس بھڑ بھڑا رہی ہیں لیکن امریکہ کے لئے حیرتوں اور معجزوں کے باب کھل چکے ہیں۔ رمز فیانڈ کو پتہ چل گیا ہے کہ جس دنیا کو وہ اپنے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں بند کئے بیٹھے تھے وہ بہت وسیع ہے اور جن طالبان کو وہ چوبیس گھنٹوں میں لقمہ بنانے کا دعویٰ کر رہے تھے وہ شاید عشروں پر محیط سرد جنگ سے بھی طویل تر گرم جنگ کے باوجود فنا نہ ہو سکیں۔

[27-10-2001]

دوستی کا تازہ سفر

پاکستان میں متعین امریکی سفیر مادام وینڈی جیمبرلین نے اپنے ایک تازہ انٹرویو میں پاکستانی عوام کے لئے گرمجوشی اور تحسین کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ”پاکستان کے لوگ امریکیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی اقلیت، چھوٹا سا گروہ ایسا ہے جسے سیاسی جماعتیں، آئندہ سال ہونے والے انتخابات کی پیش بندی کے طور پر استعمال کر رہی ہیں۔“ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ”امریکہ یہاں طویل مدت کے لئے آیا ہے اور اس مدت کے دوران ہم پاکستان سے جڑے رہیں گے۔“

امریکہ اور پاکستان کے نئے رومانس اور تازہ دوستی کے حوالے سے مادام نے بہت کچھ کہا ہے۔ ہمارے پاس مادام کے اس دعوے کو جھٹلانے کا کوئی واضح ثبوت نہیں کہ پاکستانی عوام کی اکثریت امریکی پالیسیوں کی حامی ہے۔ مادام تو دنیا کی واحد سپر پاور کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان کا فرمایا ہوا بہر حال مستند ٹھہرتا ہے۔ ہم تو کسی کا بھی یہ دعویٰ جھٹلانے کی پوزیشن میں نہیں کہ اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ مادام کے علاوہ دیگر امریکی زعماء کے شیریں لبوں سے بھی مسلسل پھول چھڑ رہے ہیں لیکن عوام کے دلوں میں بد اعتمادی مستقل طور پر بکل مارے بیٹھی ہے اور پاکستانی قیادت بھی یکسوئی کا اظہار نہیں کر رہی۔ پہلے وزیر خارجہ عبدالستار نے کہا کہ ”امریکہ 1990ء والی بے رخی دوہرا سکتا ہے اور میں اس ضمن میں کوئی ضمانت نہیں دے سکتا“ اب صدر مشرف نے بھی ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ”پاکستان کے عوام امریکہ پر اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں۔“

کچھ لوگ امریکہ کی بے وفائی اور بے مروتی کا شکوہ کرتے وقت ماضی کا سہارا لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 1962ء میں چین بھارت جنگ کے دوران ہمارے لئے کشمیر کا قضیہ چکانے کا سنہری موقع پیدا ہو گیا تھا لیکن امریکہ نے کہا ”صبر کرو۔ میں تمہیں کشمیر دلوں گا“ ہم صبر کر کے

بیٹھ گئے اور اب تک بیٹھے ہوئے ہیں۔

1965ء میں ہمیں موت و حیات کا معرکہ درپیش ہوا تو امریکہ برسوں پر محیط دوستی کو ایک طرف رکھ کر حیلہ سازی اور بہانہ جوئی کرتا رہا۔ 1971ء میں اس کے بحری بیڑے دہمبر کی سر دراتوں میں کھلے سمندروں پر۔ کھلی چاندنی سے دل بہلاتے رہے اور پاکستان دولخت ہو گیا۔ 1990ء کی دہائی میں ہم نے اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر روسیوں کو شکست دی اور جب پیچھے پلٹ کر دیکھا تو امریکہ کہیں نظر نہ آیا۔ یہ اور اس طرح کے کئی دوسرے واقعات کا سہارا لے کر ”مایوس عناصر“ بدگمانیاں پھیلاتے اور امریکہ کی وفا شعاری پر بد اعتمادی کا اظہار کرتے ہیں۔ تاہم اب امریکہ نے کہا ہے کہ ”ماضی“ پر مٹی ڈالو آگے دیکھو ہم کس طرح دوستی بنا رہے اور وفا شعاری کی روایت کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کرتے ہیں۔ سو ہم نے ماضی پر مٹی ڈال کر دوستی کے نئے سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ اس سفر کو اب ایک ماہ سترہ دن ہو گئے ہیں۔ ان 47 دنوں کی رفاقت میں ہی امریکہ نے ہمیں باور کرا دیا ہے کہ وہ واقعی ہم سے مخلص ہے اور پاکستان کو صدق دل کے ساتھ ترقی و خوشحالی کی معراج کمال تک پہنچانے کا آرزو مند ہے۔

11 ستمبر کے فوراً بعد گرجوش دوستی کا نیا سفر شروع ہوتے ہی پاکستان نے کہا کہ ”ہماری جاٹاری اور خدمت شعاری شک و شبہ سے بالاتر ہے لیکن ظالم سماج کا منہ بند کرنے کے لئے ہمیں اسامہ کے خلاف کچھ ثبوت فراہم کر دو“ امریکہ نے فوراً یہ ثبوت فراہم کر دیئے جس پر صدر مشرف نے کہا کہ ہمیں قابل قدر ثبوت دکھا دیئے گئے ہیں۔ دفتر خارجہ کے ترجمان نے مزید کہا کہ ”ان ثبوتوں کی بنیاد پر کسی بھی عدالت میں اسامہ کے خلاف فرد جرم عائد کی جاسکتی ہے۔“ امریکہ اور برطانیہ نے اگلے ہی دن اعلان کیا کہ ”اسامہ کے خلاف دستیاب ثبوتوں کی بنا پر ہمارے مروجہ قانون کے تحت ہماری عدالتوں سے سزا نہیں دلوائی جاسکتی“ صدر مشرف نے قوم کو یقین دلایا کہ ”امریکہ نے افغانستان میں جنگی مہم مختصر رکھنے کا یقین دلایا ہے۔ جارج بش نے مخصوص فرعونی لہجے میں کہا ”مجھے نہیں معلوم پاکستانی جنرل کو یہ کس نے بتایا جنگ کئی سالوں تک جاری رہ سکتی ہے“ ہم نے اپنے عوام کے زخموں پر پھاہار کھنے کی کوشش میں اعلان کیا ”امریکی حملے صرف مخصوص اہداف پر ہوں گے“ امریکہ نے جو اب ہسپتالوں، ریڈ کراس کے مرکز، خوراک کے گوداموں، عبادت گاہوں اور بستیوں کا بھر کس نکال دیا۔ ہم نے کہا ”شمالی اتحاد کی حوصلہ افزائی کسی قیمت پر

برداشت نہیں کی جائے گی۔ امریکہ نے یہ یقین دلایا ہے کہ پاکستان کے تحفظات کا خیال رکھا جائے گا۔“ کون پاول نے اعلان کیا کہ ”پاکستان کو افغانستان میں اپنی پسند کی حکومت کے لئے ڈکیشن دینے کا حق حاصل نہیں“ ہماری خواہش کے احترام میں امریکہ کے فوجی ماہرین شمالی اتحاد کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ امریکی فضائیہ ان کے سروں کا ساٹبان بن گئی اور آج ”امریکہ اور شمالی اتحاد“ یک جان و دو قالب ہیں۔ ہم نے کہا ”امریکہ نے یقین دلایا ہے کہ کشمیر میں ہمارے مفادات کو نقصان نہیں پہنچے گا اور وہاں جاری تحریک آزادی کو دہشت گردی کا نام نہیں دیا جائے گا۔“ امریکہ نے حرکت المجاہدین، جیش محمد، الرشید ٹرسٹ اور رابطہ ٹرسٹ پر پابندی لگا دی اور کون پاول نے جسوت سنگھ کے ہمراہ اعلان کیا کہ ”ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور سری نگر کی دہشت گردی ایک جیسی ہے۔ افغانستان کے بعد دنیا بھر میں دہشت گردی کے خلاف کارروائی ہوگی۔“ صدر مشرف نے کہا ”ماڈریٹ طالبان کو برداشت کیا جاسکتا ہے“ امریکہ نے جواب دیا ”نئی افغان حکومت میں ماڈریٹ طالبان کی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔ طالبان لیڈرشپ میں کوئی ماڈریٹ نہیں۔“ ہم نے کہا یہ گارنٹی ہے کہ امریکہ واپس چلا جائے گا۔ امریکہ نے کہا کہ ”میں اپنے نئے دوست کے جبر و فراق کا صدمہ نہیں سہہ سکتا اور ”مدتوں قیام کروں گا“ ہم نے عرضی گزاری رمضان میں بے گناہ مسلمانوں کا خون نہ بہایا جائے جو اب ملا ”رمضان میں جنگ جاری رہے گی۔ مسلمان خود رمضان میں جنگیں لڑتے رہے ہیں۔“ ہم نے کہا ”کم از کم ہمارے قرضے تو معاف کر دو۔“ بتایا گیا ”ایسا ممکن نہیں۔“ مادام وینڈی چیمبر لین سے پوچھا گیا ”صدر پاکستان نے کہا ہے کہ اقتصادی بحران سے نکلنے کے لئے سولین ڈالر درکار ہوں گے“ مادام نے مسکراتے ہوئے کہا ”صرف پاکستان ہی اس صورت حال سے دوچار نہیں۔“

دوستی کے اس تازہ سفر نے ہمیں اور بھی بہت کچھ دیا ہے۔ سینتالیس دنوں میں پانچ بلین ڈالر رومانس کے اس مرحلہ تازہ کی نذر ہو چکے ہیں۔ خزاں کے اس موسم میں ہمارے لئے تسکین کا واحد پہلو امریکہ کی گرجوشی اور تحسین کے جذبات ہیں۔ یہ تصور ہی ہمارے پہلو کو گرمانے کے لئے کافی ہے کہ ”امریکہ ہم سے جڑا رہے گا۔“

رہی چھوٹی سی اقلیت، تو وہ جشن بہاراں کا منظر دکھتے ہی راہ راست پر آجائے گی۔

کہوٹہ کا گھرا

بے یقینی کی گرواڑتی ہے توج اور جھوٹ کی پہچان کھو جاتی ہے۔ انواہیں مصدقہ خبروں کا روپ دھار لیتی اور ٹھوس حقائق، گلی کوچوں کی خانہ ساز انواہیں قرار دے کر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں۔ ان دنوں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے جس کے سبب کنفیوژن کی دھند گہری ہو رہی ہے اور بیجان بڑھتا جا رہا ہے۔

برطانوی ذرائع ابلاغ نے الزام لگایا ہے کہ اسامہ بن لادن کے پاس ایٹمی مواد موجود ہے جو پاکستان سے حاصل کیا گیا ہے۔ ”دی ٹائمز“ میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق کئی سال قبل اس بات کے شواہد مل گئے تھے کہ اسامہ بن لادن کے ساتھی نیوکلیر سسٹم خریدنے، چوری کرنے یا سنگل کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ایٹمی جنس ذرائع کو خدشہ ہے کہ یہ لوگ ریڈیو ایکٹیو میٹریل حاصل کر چکے ہیں۔

اس نام نہاد رپورٹ سے ایک دن پہلے امریکی وزیر خارجہ کولن پاول اور برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیر نے ایک ہی بات ایک ہی جیسے الفاظ میں کہی کہ ”ایٹمی اور کیمیائی ہتھیار دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتے ہیں۔“ اسی دن یہ اطلاع بھی آئی کہ امریکی سینٹ کی امور خارجہ کمیٹی کے چیئرمین سینٹر جو بینڈن کے مطابق صدر بش ارکان کانگریس سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں صلاح مشورے کر رہے ہیں۔ اس مشاورت کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ جنرل مشرف کی حکومت ختم ہونے کی صورت میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت اور ایٹمی اثاثوں کو غیر موثر بنا دیا جائے۔

یہ سب کچھ عین ان دنوں ہوا جب پاکستان میں نیوکلیر پروگرام کے کنٹرول اینڈ کمانڈ سسٹم کے حوالے سے صدر مشرف نے ایک اعلیٰ سطحی اجلاس کی صدارت کی۔ اس اجلاس کے بعد حکومت

نے سسٹم کے تحفظ اور دیگر پہلوؤں کے بارے میں کامل اطمینان کا اظہار کیا۔ وزارت خارجہ کے ترجمان ریاض محمد خان نے مغربی ذرائع ابلاغ کی تراشیدہ خبروں کو مضحکہ خیز اور بے بنیاد قرار دیا۔ پاکستان کا نیو کلیئر پروگرام چودہ کروڑ پاکستانیوں کا ایسا خواب ہے جس کی تعبیر کے لئے انہوں نے بڑے جتن کئے۔ اس ”رومانویت“ کے لئے انہوں نے ترقی و خوشحالی کی لاتعداد امتگوں اور معاشی آسودگی کی ان گنت آرزوؤں کی قربانی دی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی تصویر، ضیاء الحق کی تعبیر اور نواز شریف کے اعلان تکبیر تک قوم سیسہ پلائی دیوار کی طرح کھڑی رہی۔ پاکستان کی مسلح افواج کے ادارے کی حیثیت میں ایٹمی پروگرام کے تحفظ اور نشوونما کے لئے تاریخی کردار ادا کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں خزاں رسیدہ چٹوں کی طرح جھڑتی حکومتوں کے باوجود فوج نے ایٹمی پروگرام کو تسلسل فراہم کیا، اس کی پاسبانی اور اس کے تقاضوں کو سیاسی بازیگری سے بالاتر رکھا۔ پاکستان کو بے بال و پر رکھنے کی خواہشمند طاقتوں نے دباؤ، ترغیب اور تحریص کا ہر حربہ آزما لیا لیکن ایٹمی پروگرام قومی تفاخر کی سب سے توانا علامت کے طور پر سیاستدانوں، فوج اور عوام کے مشترکہ عزم کے سہارے آگے بڑھا اور پایہ تکمیل تک پہنچا۔

1998ء میں بھارتی دھماکوں کے بعد پاکستان شدید عالمی دباؤ کی زد میں آ گیا تھا۔ امریکہ کے صدر نے پانچ مرتبہ وزیراعظم نواز شریف سے بات کی۔ جب کبھی اس گفتگو کا مصدقہ ریکارڈ منظر عام پر آئے گا تو عوام کو اندازہ ہوگا کہ مئی 98ء میں کلنٹن کا لب و لہجہ، گیارہ ستمبر والے جارج بش کے لب و لہجہ سے مختلف نہیں تھا لیکن اس وقت بے مثال قومی اتفاق رائے نے حکمرانوں کی مشکل آسان کر دی تھی۔ حکومت، فوج اور عوام نے ایک دوسرے کی آواز میں آواز ملا کر ”اللہ اکبر“ کا نعروں لگایا اور پاکستان کا نام پہلی اسلامی ایٹمی قوت کے طور پر نقش کر دیا۔

قوم آج بھی اس ضمن میں پوری طرح یکسو ہے۔ سیاستدان راندہ درگاہ ہو جانے کے بعد بھی پاکستان کی کلاہ افشار کی اس کلنی کا دفاع چاہتے ہیں اور فوج اب بھی ایک ادارے کے طور پر ایٹمی پروگرام کے تحفظ کا ناقابل شکست عزم رکھتی ہے۔ ہر پاکستانی کو یقین ہے کہ کوئی فرد، کوئی گروہ، کوئی جمہوری یا غیر جمہوری حکومت اور کوئی ادارہ قومی ناموس کا سودا نہیں کر سکتا لیکن تیز ہواؤں کے موسم میں جب پھول ایکا اکی جھڑنے لگتے ہیں اور سبزہ زاروں کی ہریالی بے سبب پیلپی پڑنے لگتی ہے تو دل خواہ محوواہ کسی نامہرباں رت کے خوف سے بھر جاتے ہیں۔ امریکہ اور اس کے

اتحادیوں نے افغانستان کے پہاڑوں سے سر پھوڑنے کے بعد چانک ایٹمی اور کیمیائی ہتھیاروں کا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں ہمیشہ ایک ڈھیلی ڈھالی، غیر منضبط، سطحی جذبوں کی حامل طفلانہ سی ریاست کے طور پر پیش کیا گیا۔ یہ تاثر بار بار پھیلا یا گیا کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت محفوظ ہاتھوں میں نہیں..... وہ کسی بھی وقت، کسی بھی شخص کے ہاتھ لگ سکتی ہے اور وہ اس سے مسلح ہو کر کہیں بھی قیامت پھا کر سکتا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف حالیہ مہم کا سیلاب بلا جن منزلوں سے ہو کر گزرے گا ان میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت بھی شامل ہے۔ انہونیوں کی آندھی تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ 11 ستمبر سے قبل موسموں کا مارا کوئی قنوطی شخص یا افق پار تک دیکھنے والا کوئی دور میں مدبر اس منظر کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان، امریکہ کا اہم ترین حلیف بن کر پڑوس کے ایک در ماندہ اسلامی ملک کی غارت گری میں شریک ہو جائے گا۔ نیویارک اور واشنگٹن کے حادثے ہمیں اس کھائی میں گرا گئے اور بے شمار اندیشوں کے بیج بو گئے۔ نہ جانے کب کہوٹہ کا کھرا کسی اور ”11 ستمبر“ تک پہنچا دیا جائے اور ہم بھی طالبان کی طرح ایک دشت بے اماں میں کھڑے ہوں۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہئے کہ ”عالمی برادری“ دست قاتل پر بیعت کر چکی ہے اور امت مسلمہ ”طلسم وہم و گمان“ کے سوا کچھ نہیں۔

[29-10-2001]

جوابدہی!

مسلم لیگ (ن) کے قائم مقام صدر، برادر عزیز جاوید ہاشمی نے پرجوش ”حرف ستائش“ کے بعد بڑی سلیقہ مندی سے میری توجہ 25 اکتوبر کو شائع ہونے والے کالم ”رومانویت اور طالبان 2“ کے ان الفاظ کی طرف مبذول کرائی ہے۔

”سابق صدر کلنٹن نے خود انکشاف کیا ہے کہ اکتوبر 1999ء میں انہوں نے اسامہ کے قتل کے احکامات جاری کر دیئے تھے اور اس فرمان پر عمل ہونے ہی والا تھا کہ پاکستان میں حکومت بدل گئی۔“

ہاشمی صاحب کے بقول اس جملے سے یہ غلط تاثر ملتا ہے کہ میاں نواز شریف کی حکومت کسی امریکی پلان کا حصہ تھی جو اس حکومت کے ختم ہو جانے کے بعد پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ انہوں نے اپنے نقطہ نظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور توقع ظاہر کی کہ مناسب انداز میں اس کی وضاحت کر دی جائے گی۔ اگلے دن مسلم لیگ (ن) کے بازیاب سیکرٹری اطلاعات جناب صدیق الفاروق نے دوبارہ یاد دہانی کے ساتھ مجھے سابق صدر کلنٹن کی گفتگو پر مشتمل ایک تراشہ ٹیکس کیا۔ یہ روزنامہ ”نیشن“ کے 24 ستمبر کے شمارے میں شائع ہونے والی اے ایف پی کی سٹوری کا ٹکس ہے جس کے متعلقہ حصے کے الفاظ یہ ہیں:

"I authorised the arrest and if necessary, the killing of Osama Bin Laden, and we actually made contact with a group inside Afghanistan to do it. They were unsuccessful, he added. Clinton said that his administration also began training commandos for a possible ground assault aimed at

capturing or killing Osama, but the adequate intelligence and support from key international governments was lacking."

”میں نے اسامہ بن لادن کو گرفتار کرنے اور اگر ضروری ہو تو ہلاک کرنے کا اختیار دے دیا تھا اور دراصل ہم نے اس کام کے لئے افغانستان کے اندر ایک گروپ سے رابطہ بھی قائم کر لیا تھا لیکن وہ لوگ کامیاب نہ ہو سکے۔“ کلنٹن نے کہا کہ ان کی انتظامیہ نے ممکنہ زمینی حملے کے لئے کمانڈوز کو تربیت دینے کا کام بھی شروع کر دیا تھا جس کا مقصد اسامہ کو پکڑنا یا ہلاک کرنا تھا لیکن کلیدی اہمیت رکھنے والی بین الاقوامی حکومتوں سے کافی معلومات اور تعاون حاصل نہ ہو سکا۔“

اس اقتباس کے حوالے سے جناب جاوید ہاشمی نے ان نکات کو نمایاں کیا۔

- (1) یہ کہ صدر کلنٹن نے کہیں بھی پاکستان یا میاں نواز شریف کا ذکر نہیں کیا۔
- (2) جس گروپ کا حوالہ دیا گیا اسے افغانستان کے اندر بتایا گیا ہے۔
- (3) صدر کلنٹن نے خود اعتراف کیا ہے کہ کلیدی اہمیت رکھنے والی حکومتوں نے نہ تو کافی معلومات فراہم کیں، نہ تعاون کیا۔

(4) ان حکومتوں میں یقیناً کلیدی اہمیت رکھنے والی پاکستانی حکومت بھی شامل تھی۔

میں معذرت خواہ ہوں کہ صدر کلنٹن کی گفتگو کا درست ریکارڈ پیش نظر نہ ہونے کے باعث ایک غلط تاثر پیدا ہوا۔

ہاشمی صاحب کا فرض تو ادا ہو گیا لیکن جناب کلنٹن نے جو کچھ کہا اس میں ہمارے لئے غور و فکر کا خاصا سامان موجود ہے۔ انہوں نے کس فخریہ انداز میں انکشاف فرمایا ہے کہ ”میں نے اسامہ کو گرفتار کرنے اور اگر ضروری ہو تو ہلاک کرنے کا اختیار دیا تھا۔“ اب تک اسامہ بن لادن پر کسی بھی واردات کے حوالے سے کسی بھی عدالت میں نہ کوئی مقدمہ چلانا سزا ہوئی لیکن امریکی صدر نے خفیہ طور پر ان کے قتل کا حکم جاری کر دیا اور اجرتی قاتلوں کی تربیت شروع کر دی۔

دو روز قبل برادر ام اعجاز الحق نے اسلام آباد میں نوائے وقت، نیشن لیڈر شپ لیکچرز کے دوران ایک واقعہ بیان کیا جس کے وہ معنی شاہد بلکہ شریک تھے۔ اردن کے شاہ حسین کے جنازے میں شرکت کے لئے اس وقت کے وزیراعظم میاں نواز شریف کی سربراہی میں جو وفد عمان گیا اس

میں جناب اعجاز الحق اور جناب سرتاج عزیز بھی شامل تھے۔ وفد کی ملاقات برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیر سے بھی ہوئی۔ رمی جملوں کے بعد میاں نواز شریف نے ٹونی بلیر سے کہا ”جناب وزیراعظم! میں ایک اہم مسئلے پر آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں اپنا ایک شہری مطلوب ہے جو آپ کے ملک میں بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے منظم دہشت گردی کی بے شمار وارداتیں کی ہیں اور باقاعدہ ایک نیٹ ورک قائم کر رکھا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ہم اپنے ملکی قانون کے مطابق اس کا حسابہ کر سکیں۔“ ٹونی بلیر بے توجہی سے کبھی چھت کے نقش و نگار، کبھی دیواروں کی مینا کاری کا جائزہ لیتے رہے۔ میاں صاحب کی بات ختم ہوئی تو ہولے ”میں نے تو اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔“ پھر انہوں نے سوالیہ نظروں سے پہلو میں بیٹھے اپنے مشیر کی طرف دیکھا مشیر فلسفیانہ انداز میں میاں صاحب سے مخاطب ہوا۔ ”جناب وزیراعظم! بات یہ ہے کہ اس طرح کے معاملات کا فیصلہ ہمارا ہوم ڈیپارٹمنٹ کرتا ہے اور شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ ہمارا ہوم ڈیپارٹمنٹ، 10۔ ڈاؤنگ سٹریٹ سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔“

یقیناً برطانیہ اور امریکہ کے سارے ڈیپارٹمنٹ اور سارے ادارے، اپنے ملک کے آئین، قانون اور ضابطوں کی وجہ سے بے حد مضبوط ہیں۔ امریکی صدر اور وزیراعظم آئینی دستوری شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور وہ کسی ڈرائیور کا چالان بھی نہیں چھڑا سکتے لیکن باہر کی دنیا کے لئے وائٹ ہاؤس اور 10۔ ڈاؤنگ سٹریٹ دہشت گردانیا کے ایسے اڈے ہیں جو کسی بھی ملک پر قہر بن کر ٹوٹ سکتے اور کسی بھی شخص کی گردن اڑا دینے کا حکم نامہ جاری کر سکتے ہیں۔ وہ دنیا کے آزاد اور خود مختار ملکوں کو مخاطب کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ”فیصلہ کر لو..... یا تم ہمارے ساتھ ہو یا پھر دہشت گردوں کے ساتھ“ انہیں کوئی نہیں بتا سکتا کہ ہمارے بھی کچھ قاعدے اور ضابطے ہیں۔ ہم بھی کوئی نظام اور دستور رکھتے ہیں۔ ہم بھی کسی کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ہم بھی.....

لیکن کیا ہم واقعی کوئی قاعدہ اور ضابطہ رکھتے ہیں؟ کیا ہمارا بھی کوئی نظام اور دستور ہے؟ کیا ہم بھی کسی کے سامنے جوابدہ ہیں؟ جب عالم یہ ہو کہ نیل کے ساحل سے کاشغر کی خاک تک رنگ رنگ شخصی حکومتوں کا مینا بازار سجا ہو، قاعدے اور ضابطے حکمرانوں کے اشارہ ابرو سے بندھے ہوں، آئین اور دستور فولادی الماریوں میں مقفل ہوں تو ہم امریکہ کے سوا کس کے سامنے جوابدہ ہو سکتے ہیں؟

جناب معین حیدر سے التماس

لاہور میں ڈسٹرکٹ اسمبلی سے خطاب کے بعد ایک سوال کے جواب میں وفاقی وزیر داخلہ لیفٹیننٹ جنرل (ر) معین حیدر نے کہا ہے کہ وہ افغانستان میں شہید ہونے والوں کے لئے ”ہلاک“ کا لفظ استعمال کرنے کے بارے میں پاکستان ٹیلی ویژن کے حکام سے بات کریں گے۔ نہ معلوم یہ خبر آتش بجاں افغانیوں تک پہنچی ہے کہ نہیں۔ وہاں تو فضاؤں میں تیرتی آہنی مشینیں پہاڑوں کو روٹی کی طرح ”دھن“ رہی ہیں۔ طالبان کے اگلے مورچوں پر مسلسل گیارہ گیارہ گھنٹے بمباری ہو رہی ہے۔ اب تک دس لاکھ ٹن فولاد اور بارود برسایا جا چکا ہے لیکن پیوند لگے کپڑوں والے فاقہ مست ڈٹے ہوئے ہیں۔ القابات اور خطابات سے بے نیاز لوگ زندہ رہے تو پتھروں کی اوٹ، کچے گھر و بندوں کی آڑ اور کوساروں کی پناہ گاہوں سے اپنی سرزمین کا تحفظ کرتے رہیں گے اور مر گئے تو حد سود زیاں سے آگے نکل جائیں گے.....

جوڑ کے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے

ان جبری افغانوں کی داستانیں صدیوں سے کہی جا رہی ہیں اور دیر تک کہی جاتی رہیں گی۔ وہ 1980ء کی دہائی میں ایک سپر پاور کے سامنے دیوار بن گئے اور آج 2000ء کی دہائی میں واحد بیخ جانے والی سپر پاور کے قہر و غضب کا مجاہدانہ پامردی سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ان کا مطلوب و مقصود نہ مال غنیمت ہے نہ کشور کشائی۔ ”آزادی یا موت“ کے درمیان سے ایک راستہ شمالی اتحاد کے آسودہ حال خیموں کی طرف بھی نکلتا ہے جہاں زمانہ امن سے بھی زیادہ آسائشیں ہیں۔ موسم کی شدت سے محفوظ رہنے کے اسباب ہیں، ڈالروں کی ریل پیل ہے، ہسپتال پر امریکی طیاروں کا سائبان، جسموں پر نئی کمانڈو وردیاں اور پیٹھ پر بندھے تھیلوں میں ہائی انرجی بسکٹوں کے پیکٹ ہیں۔ طالبان چاہیں تو اسامہ بن لادن کا سر پلیٹ میں رکھ کر جارج بوش کی خدمت عالیہ میں پیش

کر سکتے ہیں اور کم از کم وقتی طور پر ڈھیروں مراعات حاصل کر سکتے ہیں لیکن جب زندگی کا تصور ”ساگر ہوں“ سے وابستہ نہ ہو تو صاحب ایمان لوگوں کے لئے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

یہ کئی برس پہلے کی بات ہے۔ جب لیفٹیننٹ جنرل (ر) عمران اللہ خان راولپنڈی کے کور کمانڈر تھے۔ سیاحین کے بارے میں میرا ایک مضمون پڑھ کر انہوں نے ملاقات کی دعوت دی اور میرے لئے خصوصی طور پر دورہ سیاحین کا اہتمام کیا۔ شگفتہ بیبا صاحب قلم، کرنل اشفاق حسین اس وقت مجھ سے ان کی رفاقت میں مجھے دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ پر، بہ یک وقت فطرت اور دشمن سے معرکہ آراء مجاہدوں سے ملنے، ان سے باتیں کرنے، ان کے جذبہ بے کراں اور شوق فراواں کی تپش کو بہت قریب سے محسوس کرنے کا موقع ملا۔ لاہور میونسپل کارپوریشن کے سابق ایڈمنسٹریٹر بریگیڈیئر (ر) یعسوب ڈوگر ان دنوں بریگیڈ کمانڈر کے طور پر فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ سیاحین کے پہلے اہم پڑاؤ کی ٹھہرتی رات کے اولین لمحوں میں، انہوں نے پاک فوج کے ایک نوجوان کپتان کی کہانی سنائی۔ جو اس سال کپتان کسی بڑے شہر کی پر آسائش چھاؤنی میں تعینات تھا اور بڑی دور سے بریگیڈر صاحب کے کسی گھرے دوست کا سفارشی رقعہ لایا تھا۔ سخت فوجی ڈسپلن کے قائل بریگیڈ کمانڈر کو کپتان کی یہ ادا پسند نہ آئی، جو نہ جانے کس طرح کی سفارش لے آیا تھا۔ اسے ملاقات کا موقع ملا۔ سفارشی رقعہ کمانڈر کو دے کر نوجوان فوجی انداز میں مستعد کھڑا ہو گیا۔ رقعہ پڑھ کر بریگیڈر نے کپتان پر نگاہ ڈالی جس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک جانے کو تھیں۔ وہ یہ سفارش لے کر آیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس کی پوسٹنگ سیاحین کر دی جائے۔ وہ دشمن سے بچنے لڑانا چاہتا ہے اور اس کے دل میں شہادت کی آرزو چل رہی ہے۔ یہ کہانی سنا تے وقت بریگیڈر ڈوگر کی اپنی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔

واپسی کے سفر کے لئے جب ہمارا پہلی کا پٹر سیاحین کی ایک برف پوش چوکی سے سکر دو کے لئے اڑا تو اس میں دو شہیدوں کی میتیں بھی تھیں۔ پاکستان کے یہ دو جوان سال بیٹے بھارتی فوج کے ساتھ شدید معرکہ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ دونوں کے سینے چاک تھے اور ان کے سروں پر جنت کی ملکوٹی فضاؤں کا عکس، حد نظر تک پھیلے برف زاروں میں لہورنگ شفق کی طرح کھل اٹھا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ پہلی کا پٹر لطیف بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے کی طرح تیر رہا ہے اور چاروں طرف جاودانی نعموں کی گونج رچ بس گئی ہے۔ سات سال بعد جب ہم ہرات سے

قدحار جا رہے تھے تو اس طیارے میں بھی ایک ”شہید“ کی میت رکھی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ یہ شہید یقیناً پروفیسر ربانی، حکمت یار، احمد شاہ مسعود یا سیاف کے کسی سپاہی کا نشانہ بنا ہوگا۔ نشانہ بننے اور نشانہ بنانے والے، دونوں برسوں اکٹھے روس کے خلاف لڑتے رہے ہوں گے۔ دونوں ”اللہ اکبر“ کا نعرہ لگا کر ایک دوسرے کے مد مقابل آئے ہوں گے۔ میں کس کو قاتل کہوں اور کس کے سینے پر شہادت کا تمغہ سجاؤں؟ شعوری کوشش کے باوجود نہ کہیں شفق کھلی، نہ جاودانی نعموں کی گونج سنائی دی۔

لیکن وہ سرفروش جو سات سمندر پار سے آئی ایک سفاک سپاہ کا لقمہ بن رہے ہیں، وہ جو امرود جو بے سرو سامانی کے باوجود ایک لافانی نظریے اور اپنی ارض وطن کے تحفظ کے لئے قربان ہو رہے ہیں، وہ عفت شعار خواتین اور وہ معصوم بچے جو کچے گھر وندوں میں بیٹھے ایک عارت گر کا نشانہ بن رہے ہیں..... انہیں کیا نام دیا جائے؟

مجھے بہت سے خطوط ملے ہیں جن میں پوچھا گیا ہے کہ ”پی ٹی وی طالبان کی تخصیبات اور مورچوں کو دہشت گردوں کے ٹھکانے کیوں کہتا ہے؟ امریکی بموں اور میزائلوں کا نشانہ بننے والوں کو شہید کہنے سے کیوں ڈرتا ہے؟ نیوز کاسٹرز امریکی طیاروں کی بمباری کا ذکر اس جوش و جذبہ کے ساتھ کیوں کرتے ہیں جس جوش و جذبہ کے ساتھ شکیل احمد ہلو اڑھ اور پٹھان کوٹ پر حملوں کی خبریں پڑھتا تھا؟“

میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں۔ میں خط لکھنے والوں سے یہ بھی نہیں پوچھ سکتا کہ اگر ہم افغانوں کو شہید کہنا شروع کر دیں تو اپنے لئے کون سا لقب تجویز کریں گے؟ تاہم میں محترم معین حیدر صاحب سے، اپنے دیرینہ تعلق خاطر کا واسطہ دے کر، درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اس طرح کے کسی بکھیڑے میں نہ پڑیں۔ اپنی توجہ قاضی حسین احمد کے ساتھ مناظرے پر مرکوز رکھیں۔ آہنی عزم و یقین، ناقابل شکست قوت ایمانی اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں جیسی جو امرودی کے ساتھ اکیسویں صدی کی تاریخ کا روشن دیباچہ رقم کرنے والے شہیدوں کی معصوم روحوں کو خیر ناموں کے بے روح الفاظ کی آلودگی سے پاک رہنے دیں۔ ”کشکجان خنجر تسلیم“ اخباروں کی سرخیوں اور خیر ناموں کے خطابات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

ہم بھی کیا لوگ ہیں؟

نہ جانے کیوں، غریب کی خور و بیٹی کی طرح ہماری ایٹمی صلاحیت چوپالوں کا موضوع اور اوباشوں کی حریص نگاہوں کا سامان بنتی جا رہی ہے۔ بھارت میں انتہا پسند ہندوؤں کی حکومت ہے اور ریاستی دہشت گردی ان کی سرشت میں شامل ہے لیکن کوئی بھارتی ایٹم بم کا نام بھی نہیں لیتا۔ وہ دنیا کی نظروں میں ایک ذمہ دار اور بالغ نظر جمہوری ریاست کے طور پر جانا جاتا ہے اور ہم جذبات کی بے ہنگم لہروں کے ساتھ بہنے والی ایسی قوم سمجھے جا رہے ہیں جو کسی بھی وقت ایٹمی کھلونے سے چھیڑ چھاڑ شروع کر سکتی ہے۔ گزشتہ چند دنوں سے امریکی ذرائع ابلاغ نے ایک سوچی سمجھی سیکیم کے تحت پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلانے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ ہماری ایٹمی صلاحیت نام نہاد دہشت گردوں کے ہاتھ لگ جانے کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ حکومت میں کسی تبدیلی کے سبب ساری دنیا ایٹمی حملوں کے خطرے سے دوچار ہو جائے گی۔

حکومتی سطح سے واضح بیانات کے باوجود، اب ایک بار پھر وزیر خارجہ جناب عبدالستار کو ایٹمی صلاحیت کی ”عفت و پاکبازی“ کا یقین دلانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ انہوں نے بجا طور پر دنیا کو یقین دلایا ہے کہ ”ایٹمی پروگرام کے بارے میں کئے گئے انتظامات لیک پروف ہیں۔ یہ خدشہ کہ ایٹمی ہتھیار انتہا پسندوں کے ہاتھ لگ جائیں گے، بے بنیاد ہے۔ سیکورٹی، کمانڈ اینڈ کنٹرول کا پورا نظام ایک ڈسپلن میں بندھا ہے۔“ پاکستانی وزیر خارجہ نے یہ انکشاف بھی فرمایا کہ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے دورہ پاکستان کے دوران ایٹمی تخصیبات کے تحفظ کے حوالے سے پیشکش کی تھی کہ ہمارے ماہرین امریکہ جا کر ایٹمی تحفظ کے انتظامات کا جائزہ لیں۔ اب کولن پاول صاحب نے پھر کہا ہے کہ ”پاکستان کو، ضروری سمجھے تو، نیوکلیر حفاظتی انتظامات بہتر بنانے کے لئے فنی تعاون فراہم کیا جاسکتا ہے۔“

یہ سب کچھ ایسے وقت میں ہو رہا ہے جب ہم اپنی قومی تاریخ اور روایات کو بوسیدہ کپڑوں کی الماری میں پھینک کر، امریکہ کے شانہ بشانہ ایک مسلمان ملک کے خلاف برسرا پیکار ہیں۔ امریکہ اندازہ ہی نہیں کر پارہا کہ صدر مشرف نے کتنا مشکل اور کس قدر نازک فیصلہ کیا ہے۔ پاکستان کو امریکی قہر و غضب سے محفوظ رکھنے کے لئے ہم نے جو اپنے گھر کے سارے دروازے کھول دیئے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ پاکستانی عوام کے جذبات پر اوس پڑ گئی ہے یا امریکہ کی کسی توجہ شکن ادا نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ وقتی طور پر اپنی سلامتی، بقا اور تحفظ کے لئے کیا جانے والا یہ فیصلہ ناگزیر تھا تو ناگوار بھی تھا۔ اس مجبوری ہی کے باعث ہم سمندر، ہوا اور زمین سے وہ تعاون فراہم کر رہے ہیں جو کبھی ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ جب کابل، ہرات، قندھار، جلال آباد اور مزار شریف پر بم گرتے ہیں تو ہر پاکستانی کے دل پر بھی ایک کروڑ میزائل گرتا ہے۔ جب کسی افغان بچے کے سرخ و سفید گالوں پر خون کی دھاریاں پھوٹی ہیں تو ہماری راتیں بھی بے خواب ہو جاتی ہیں جب ہم کئی کئی گھنٹے، سادوں بھادوں کی جھڑی کی طرح ”کارپٹ بمنگ“ کی خبریں سنتے اور حد نظر تک قطار در قطار، پہلو بہ پہلو آگ اور دھوئیں کے سیاہ بادل دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھیں بھی سلگنے لگتی ہیں۔ امریکہ کے کسی تھنک ٹینک نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ پاکستان کس قیامت سے گزر رہا ہے اور امریکی کولیشن کا حصہ بننے کے بعد ہماری دنیا بھی کتنی بدل گئی ہے۔ امریکہ کا یہ خیال درست نہیں کہ کچھ قرضوں کی ری شیڈولنگ، چند ڈالروں کی خیرات، تھوڑی سی شاباش، صدر مشرف کے لئے ایک عدد خصوصی عشائیہ اور ان کی حکومت کی مضبوطی کا مشورہ، ہماری خدمت شعاری کا بھاری معاوضہ ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ سب کچھ امریکہ کی جھولی میں ڈال کر بھی ہمیں عملاً یہی کچھ مل رہا ہے کہ کبھی بغاوت کا شوشہ چھوڑا جاتا ہے، کبھی انٹی پروگرام کے نیچے ادھیڑے جاتے ہیں، کبھی کشمیر کی تحریک حریت کو دہشت گردی کا لیبل لگتا ہے اور کبھی ہماری ایجنسیاں بے اعتبار قرار پاتی ہیں۔ اگر غیر مشروط و قاداری کے موسم میں بھی یہی سوغات ہمارے جیسے میں آرہی ہے تو طوفان تھم جانے کے بعد کا منظر کیا ہوگا؟

لیکن ایک طبقے کی امیدوں کی بھتی اب بھی ہری ہے اور اس کے خوابوں کے چمن میں رنگا رنگ پھول کھل رہے ہیں۔ خوش گمانی سی خوش گمانی ہے کہ جس سنگمر کی نظریں ہماری شہرگ پر جمی ہیں ہم اسی کو مسیحا سمجھے بیٹھے ہیں۔

اب تو شاعری قصہ ماضی ہو چکی لیکن برسوں پہلے کی ایک نظم، شاید ہمارے حسب حال ہو۔
ہم بھی کیا لوگ ہیں؟
جو سلگتی ہواؤں سے خوشبو
گھٹاؤں سے
مہکی ہوئی چاندنی مانگتے ہیں
سردشت بیٹھے
ازل سے، دکتی ہوئی ریت سے
شبنمی ساعتوں کی نمو چاہتے ہیں
خلاؤں کی بے نام سی دستوں میں بھکتے
ہراک سانس کی ٹرب سے
ریزہ ریزہ بکھرتے
فصیل انا سے
اتھاہ پستیوں میں لڑھکتے چلے جا رہے ہیں
مگر پھر بھی خوش ہیں کہ ہم کو
لہکتے گلابوں
مہکتی ہوئی نرسوں کی تمنا یہاں لائی ہے
ہم بھی کیا لوگ ہیں
جو فریب نظر کو بھی
آسودہ چشمی سے تعبیر کرتے
سرابوں سے
صدیوں کی نشہ لہی کو بجانے پہ ایمان رکھتے ہیں

[03-11-2001]

حاجی بلور اور 'مولوی'

عوامی نیشنل پارٹی نے بھی "ملک و قوم کے وسیع تر مفاد" میں ایک واضح موقف اختیار کر لیا ہے۔ جناب ولی خان نے عملی سیاست سے کنارہ کش ہونے کے باوجود ایک بھرپور پریس کانفرنس میں اس موقف کا اظہار فرمایا اور اب اے این پی کے ایک اور مرکزی رہنما حاجی غلام احمد بلور نے پی ٹی وی کے ایک پروگرام "نیوز نائٹ" میں گلوں شکوؤں کی بیاض کھول کر، افغان قوم کے درد سے کچکپاتی آواز میں پاکستان، آئی ایس آئی، علمائے کرام اور طالبان کی شان میں قصیدے پڑھے ہیں۔ انہیں شکایت ہے کہ افغانستان پر نوٹے والی قیامت، آئی ایس آئی اور مولویوں نے مسلط کی ہے۔ ان کے بقول اس کا سلسلہ ظاہر شاہ کی حکومت کا تختہ الٹنے سے شروع ہوا اور روس کی رخصتی کے بعد مولویوں کے برسر اقتدار آجانے سے معاملات بگڑ گئے کیونکہ مولوی حکومت کا اہل ہی نہیں۔

کہنے کو اتنا کچھ ہے کہ داستان ختم ہونے میں نہ آئے لیکن حاجی صاحب کی توجہ فرمائی کے لئے محض چند اشارے کافی ہونے چاہئیں۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی دینی مدرسے سے باضابطہ طور پر فارغ التحصیل اور مسلمہ عالم دین کو اقتدار کی مسند پر بٹھانے کا اعزاز حاجی صاحب ہی کی جماعت کو حاصل ہے۔ 1970ء کے انتخابات کے نتیجے میں جب آج کی اے این پی اور اس وقت کی نیپ کا خان عبدالقیوم خان کی متوقع وزارت اعلیٰ کے ہولناک خواب سے سامنا ہوا تو اس نے بعض آزاد ارکان کو ساتھ ملا کر چار نشستوں والی جمعیت العلمائے اسلام کے سربراہ مولانا مفتی محمود کو وزارت اعلیٰ کی مسند پر بٹھادیا اور خود بھی وزارتوں سے لطف اندوز ہونے لگی۔ نیشنل عوامی پارٹی اس یونائیٹڈ سیکرٹریٹ فرنٹ (یو ڈی ایف) کی اہم رکن تھی جس نے ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے میں ایک اور عالم دین مولانا شاہ احمد نورانی کو وزارت عظمیٰ کا امیدوار نامزد کیا تھا۔ اس پی این اے کے سربراہ بھی مولانا مفتی محمود تھے جس نے حیدرآباد جیل کا پھانک کھولنے اور جناب ولی

خان کو آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اسامہ کو غیر افغانی قرار دینے والے حاجی صاحب سے پوچھا جاسکتا ہے کہ خلافت عثمانیہ کا جنوبی ایشیا کے مسلمانوں سے کیا رشتہ تھا اور باچا خان جیسے بزرگ کیوں تحریک خلافت کے ہمنوا بن گئے تھے؟ مولانا عبید اللہ سندھی کا افغانوں سے کیا رشتہ تھا؟ وہ اسی افغانستان میں بیٹھ کر جہاں آج اسامہ بیٹھا ہے ”ریشی رومال“ تحریک کی قیادت کرتے رہے اور آتش بجاں افغانی اس تحریک کو اپنے عشق و جنوں سے سینچتے رہے۔ بلور صاحب کی پارٹی کا ریکارڈ تو ایک طرفہ تماشا ہے۔ ان کے مدوح ظاہر شاہ کا تختہ کسی مولوی نے نہیں، اس کے اپنے عزیز دادو خان نے لٹا تھا۔ آج ظاہر شاہ کے ہجر میں بے گل اے این پی نے اس وقت داؤد ولی، بھائی بھائی کا نعرہ لگایا تھا۔

اپریل 1987ء میں نور محمد ترہ کنی نے داؤد کو قتل کر کے اقتدار خود سنبھال لیا۔ سردار داؤد کی بیٹیوں اور اہل خانہ نے ہاتھوں میں قرآن اٹھا کر جان بخشی کی التجائیں کیں لیکن ترہ کنی نے ان کے سینے چھلنی کر دیئے۔ روسی استعمار کا یہ ایجنٹ تخت نشین ہوا تو چار سہ سے ولی ترہ کئی، بھائی بھائی کا نعرہ گونجا۔ اس کے بعد حفیظ اللہ امین، بہرک کارمل اور نجیب اللہ تک ایک خونیں ڈرامے کی قسطیں چلتی رہیں۔ بلور صاحب کی جماعت کی ہمدردیاں اس وقت تک ہر صاحب اقتدار قاتل کے ساتھ رہیں جب تک وہ مقتول ہو کر محروم اقتدار نہیں ہو گیا۔ ”مولوی“ اقتدار اور خون کے اس کھیل سے الگ تھلک دس سال تک روسیوں کے خلاف لڑتا رہا۔

باچا خان کو جلال آباد میں دفن کرنے کی وجہ آزاد ”افغانیوں کی خاک پاک“ قرار دیا گیا۔ آزاد افغانستان کی خاک پاک میں پندرہ لاکھ شہیدوں کا لبو جذب ہے۔ جب روس کی ریڈ آرمی افغانستان پر آگ اور فولاد کی بارش برسا رہی تھی اور مولوی کا غیر متزلزل ایمان، روسی استعمار کے راستے کا بھاری پتھر بن گیا تھا تو ولی خان نے کابل سے واپس پر کہا تھا ”میں نے تو وہاں کسی روسی کو نہیں دیکھا۔“ افغان عورتوں، بوزھوں اور بچوں کے لئے پٹے قافلے پاکستان آ رہے تھے تو بلور صاحب کی پارٹی کے سرچش پشاور کی سڑکوں پر نعرے لگا رہے تھے ”بھگلوڑوں کو واپس بھیجو“ آئی ایس آئی کو گالی دینے والوں کی زبان پر ”را“، ”خاد“ اور ”جی بی“ کا نام کیوں نہیں آتا؟ پاکستان کے خلاف پہلی مرتبہ منظم دہشت گردی کرنے والی تنظیموں پختون زلمے اور الذوالفقار کے ہیڈ کوارٹر طالبان کے افغانستان میں نہیں، اس افغانستان میں تھے جس پر حاجی

صاحب کے منہ بولے بھائیوں اور سرپرستوں کی حکمرانی تھی۔ نجیب اللہ کے دور میں صرف کابل کے آس پاس، پاکستان کے خلاف دہشت گردوں کو ٹریننگ دینے والے 25 کیمپ قائم تھے۔

آج حاجی صاحب کو یہ دکھ ہے کہ اسامہ کی وجہ سے افغان بچے مر رہے ہیں۔ جب روس کی وجہ سے افغان بچوں کے پرچے اڑ رہے تھے تو آپ طورخم پر پھولوں کے بار لئے کس کا انتظار کر رہے تھے؟ اگر آپ کے سینے میں دل اور دل میں افغان بچوں کا درد ہے تو مجھے بتائیے کہ آپ کی جماعت ان کے لئے کیا کر رہی ہے؟ ایک ایک ڈالرجع کرنے کا اعلان تو خیر بہ دست جارج بش نے بھی کر دیا ہے۔ ولی باغ سے بھی ایسا کوئی فرمان جاری ہوا ہے؟

حاجی صاحب اگر اپنی کتاب سیاست میں کسی عقیدے، کسی نظریے اور کسی اصول کا کوئی باب نہیں رکھتے اور صرف ”قومیت“ کے کھونٹے سے بندھے ہیں تو بھی ان پر لازم آتا ہے کہ قیامت کی اس گھڑی میں افغانوں کے زخموں پر مرہم رکھیں، کم از کم نمک پاشی تو نہ کریں۔ رہے اہل پاکستان تو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ پختونوں کی عمگساری کا دم بھرنے والے، امریکی سامراج کے پرچم برادر بن چکے ہیں اور دنیا بھر میں تبارہ جانے والا ”مولوی“ آج بھی 21 ویں صدی کے فرعون کے خلاف سینہ سپر ہے۔

[04-11-2001]

اندوہِ وفا

”اندوہِ وفا“ بھی ایک عذابِ مسلسل سے کم نہیں ہوتا۔ آدمی سانسِ رو کے تنی رسی پر چلتا رہتا ہے کہ کہیں اس کی ذرا سی جنبش بے جا اس کے لئے ہلاکت کا سبب نہ بن جائے اور وہ محبوب کی نظروں سے گر کر راندہ درگاہ نہ ہو جائے۔ عشق کے اس کھیل میں سب سے المناک لمحہ وہ ہوتا ہے جب وفا کی صلیب پر لٹکا ہوا شخص ہر نوع کی قربانی و ایثار کے باوجود محبوب کی نظروں میں مشکوک ٹھہرتا ہے اور اس کی مخلصانہ وفا شعاری کو بھی منافقت یا چالبازی کا نام دیا جاتا ہے۔

ہم بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہیں۔ گیارہ ستمبر کے بعد سے امریکہ کی خوشنودی خاطر ہماری پہلی ترجیح بن چکی ہے۔ اس کے لئے ہم نے قومی انا اور چودہ کروڑ عوام کی طرحداری کو پوٹلی میں باندھ کر ایک طرف رکھ دیا ہے اور ”دہشت گردی“ کا خاتمہ کرنے والے کاروانِ شوق میں کچھ اس انداز سے شریک ہیں کہ:-

ہوش اڑتے جا رہے ہیں گرمی رفتار سے

عالم یہ ہے کہ اب ہم امریکہ کے دل کی دھڑکتوں کو بھی محسوس کرنے لگے ہیں۔ اس کے ہونٹوں کی جنبش سے بھی پہلے اس کی مرضی و منشا کو اپنے الفاظ کی مینا کاری سے سجا کر پیش کر دیتے ہیں۔ وہ طالبان کا نانا دہشت گردی سے ملانے کے لئے کسی بہانے کی تلاش میں ہوتا ہے تو ہم بھاری بھر کم دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں۔ امریکہ ایک بات کہتا ہے تو ہم اس کے معنی و مفہوم کو چار چاند لگانے والے بیانات کی برکھار سا دیتے ہیں۔ وہ ڈرتے ڈرتے اسامہ کے خلاف ثبوتوں کے قابل اعتبار ہونے کا اشارہ دیتا ہے تو ہم کو وہ ہمالیہ پر کھڑے ہو کر ان ثبوتوں کے مستند اور ایف آئی آر کٹوانے کے لئے نہایت معتبر ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی بکھار ہمارے منہ سے دبی دبی سسکیاں بھی نکل جاتی ہیں ”جنگ مختصر ہونی چاہئے..... رمضان میں بمباری معطل رہنی چاہئے..... ہماری ایٹمی صلاحیت کو کچھ نہ کہنا..... کشمیر میں ہمارے رقیب کی

دلجوئی نہیں ہونی چاہئے..... شمالی اتحاد ہمارا مخالف ہے، اسے کامل سے دور رکھنا..... ہماری مالی حالت بہت پتلی ہے، تھوڑی سی توجہ چاہئے۔“ جب ہماری یہ سسکیاں بھی جبین یار پر شکنتوں کا جال بن دیتی ہیں تو ہم فوراً ”وفاداری بہ شرط استواری“ کی راہ پر واپس آ جاتے ہیں۔

ستم یہ ہے کہ امریکہ ابھی تک ہمارے ”جذبہ بے اختیار شوق“ پر یقین نہیں کر رہا۔ کبھی اس کا میڈیا یہ دور کی کوڑی لاتا ہے کہ ”پاکستان کا ایٹمی پروگرام محفوظ نہیں اور وہ دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتا ہے۔“ کبھی ہماری ایٹمی صلاحیت کی گردن دبوچنے کے لئے فوجی مشقوں کی خبر آتی ہے۔ تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی جب دنیا کی سب سے بڑی جنگی مشینری رکھنے والی سپر پاور کوڈیزھ ہزار افغانی بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی لاشوں کے سوا کچھ نہ ملا تو ایسی خبریں دی جانے لگیں کہ پاکستان نے درست معلومات فراہم نہیں کیں۔ آئی ایس آئی پر انگلیاں اٹھائی جانے لگیں کہ اس میں طالبان سے ہمدردی رکھنے والے عناصر موجود ہیں جو درست اطلاعات کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ امریکی عزائم کے لئے مصروف کار کمانڈر عبدالحق کی موت کا تعلق بھی پاکستانی ایجنسیوں کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے۔ تازہ خبر یہ آئی ہے کہ ”پاکستان خفیہ طریقے سے طالبان کو اسلحہ اور دوسرا ساز و سامان فراہم کر رہا ہے۔“ جوں جوں امریکہ ایک لاکھ جگمگ میں الجھتا جا رہا ہے، توں توں ہماری خدمات گزاری اور وفا شعاری مشکوک قرار پاری ہے۔

ہم نے امریکی اہداف کے ساتھ، اپنی تسلی کے لئے جن پاکستانی مفادات کا ضمیمہ تھی کر رکھا ہے، ان میں ایٹمی اثاثوں کے علاوہ کشمیر کا زور قومی معیشت بھی شامل ہے۔ ایٹمی پروگرام تو جنس بازار بن ہی چکا ہے، کشمیر کے بارے میں تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ حرکت المجاہدین اور جمیش محمد باضابطہ طور پر دہشت گرد تنظیمیں قرار پائی ہیں۔ واجپائی نے اس پر مسرت کا اظہار کیا ہے اور بھارت نے سرکاری طور پر اعلان کیا ہے کہ اب ”ہم کو بھی آزاد کشمیر میں دہشت گردی کے کمپوں کے خلاف کارروائی کا اختیار مل گیا ہے۔“ معیشت کے بارے میں قومی اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق صدر مشرف نے وزارت خزانہ اور پلاننگ کمیشن کو ہدایات جاری کی ہیں کہ وہ شدید معاشی دباؤ کی وجہ سے نئی حکمت عملی مرتب کریں۔ نیشنل ڈسٹرچ پروگرام، فلڈ کنٹرول پراجیکٹس اور پشاور اسلام آباد موٹروے کے لئے مختص رقم میں سے بارہ ارب روپے نکالے جا رہے ہیں۔ یہ رقم پاکستانی برآمدات میں ہونے والی تین فیصد کمی کا خسارہ پورا کرنے کے لئے استعمال ہوگی۔ جناب

شوکت عزیز نوکیو سے یقین دہانیوں کی جاپانی گڑیا لے کر واپس آرہے ہیں اور قرضوں کی معافی کا باب بند کر دیا گیا ہے۔ پاکستان میں کاروباری اور صنعتی سرگرمیاں بری طرح متاثر ہو رہی ہیں۔ صرف سول ایوی ایشن اتھارٹی کو ماہانہ تیس لاکھ ڈالر کا نقصان ہو رہا ہے۔

اٹھائیس بین الاقوامی فضائی کمپنیوں میں سے گیارہ کے طیارے 11 ستمبر کے بعد لوٹ کے نہیں آئے، صرف 17 محدود آپریشن جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس نفسیاتی صدمے، فکری ہجوان اور جذباتی کرب کو ماپنے کا کوئی پیمانہ نہیں جس سے پوری قوم دوچار ہے۔

وفاداری کے ان مظاہر اور قومی سطح پر انتہائی بھاری قیمت ادا کرنے کے باوجود ہم کہاں کھڑے ہیں؟ ایٹمی اتانے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ کشمیر کا زمٹی میں بندریت کے ذروں کی طرح پھسلتا جا رہا ہے اور معیشت ابھی تک آکسیجن ٹینٹ میں دھری ہے۔ اگر اس سب کچھ کے باوجود امریکہ کا دل صاف ہو جاتا اور وہ ہمیں وفا شعار عاشق زار نہ سمجھی، قابل اعتبار دوست ہی سمجھ لیتا تو ہمیں کم از کم خوشنودی یار کی آسودگی تو مل جاتی۔

نصف صدی تک ہم امریکہ کی قربت کے لئے وفا کے اندوہ و غم سے گزرتے رہے۔ اب کی بار ہم نے سب کچھ لٹا دیا۔ نقد ایماں بھی اور اثاثہ جاں بھی۔ ہمارا خیال تھا کہ اب ہم اپنی غیر متزلزل وفاداری کا یقین دلانے کے کرب سے چھوٹ جائیں گے لیکن مزاج یار کی برہمی کا عالم وہی ہے۔

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

[05-11-2001]

اسلامی بھائی

چھ سال قبل جب قندھار کے ایک گرم دن کے پہلے پہر، ملا محمد عمر اخوند ہم سے ملنے ریٹ ہاؤس کے ایک کشادہ ہال میں داخل ہوئے تو میرے تصور آتی خاکوں کی ساری لکیریں معدوم ہو گئیں۔ افغانستان کے فرمانروا، شورائے عالی کے سربراہ، افواج کے سالار اعظم اور امیر المومنین، جن کی ہر جنبش لب دستور و آئین کا درجہ رکھتی ہے۔ میں اختیار و اقتدار کے اتنے بلند مقام پر فائز شخصیت کے جلال و جمال کی صورت گری کر رہا تھا جب کسی ہنگامے، کسی شور شرابے، کسی سیکورٹی چیک اور کسی سائرن کے بغیر ایک جوان رعنا ہال میں داخل ہوا۔ ساڑھے چھ فٹ سے نکلتا ہوا، قد، چست اور مستعد بدن، روشن چہرہ، گھنی سیاہ داڑھی، پلیٹیا رنگ کا لمبا کرتا، بخنوں کو چھوتی گھیرے دار شلوار، سر پر سیاہ پگڑی، گہرے سبز رنگ کی واسکٹ، کندھے پر سیاہ رنگ کی بڑی سی چادر، پاؤں میں سیاہ رنگ کی چپل، چال میں استقامت، انداز میں استغنا۔ 36 سالہ امیر المومنین کسی ہلچل کے بغیر اپنے گھر سے یوں ریٹ ہاؤس آگئے جیسے گلی کوچوں میں رہنے والا ایک عام سا آدمی کسی مہمان عزیز سے ملنے مسافر خانے پہنچ جاتا ہے۔

ملا عمر نے جو کچھ کہا، اس کا ایک ایک لفظ میری ڈائری میں درج ہے۔

”میرے اسلامی بھائیو! میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ اتنا لمبا سفر کر کے یہاں آئے ہیں۔ آپ تو جہاد کے پہلے دن سے ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ جہاد میں پاکستانی بھائیوں بالخصوص علماء کے تعاون کو ہم کیسے بھلا سکتے ہیں۔ ہم نے جو کچھ بھی حاصل کیا وہ آپ کے طفیل حاصل کیا۔ آپ ہی کی سرپرستی میں باطل روس کو شکست دی۔ آپ نے ہمیں پناہ دی، ہمیں ہتھیار دیئے، ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر لڑے۔ آپ کا یہ سلوک ہماری نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ آج آپ ہم سے ملنے ہمارے گھر آئے ہیں۔ اس بے سرد سامانی کے عالم میں آپ کی میزبانی بھی نہیں کر سکتے۔ بھائیو! آپ جانتے ہیں کہ جہاد ابھی اپنی منزل کو نہیں پہنچا۔ ہم نے جن علاقوں کا کنٹرول سنبھالا

ہے وہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دنیا کے کافر، بے دین سیاستدان اور باطل قوتیں ہمارے خلاف پراپیگنڈے میں مصروف ہیں۔ ایک زبردست مہم شروع کر دی گئی ہے۔ باطل نے پکارا ارادہ کر رکھا ہے کہ جہاں کہیں بھی اسلام نافذ کرنے کی بات ہو اس کی قوت سے مزاحمت کی جائے۔ روس کچھ کہہ رہا ہے، امریکہ کچھ کر رہا ہے۔ ہم ایک کا جواب دیں گے تو دوسرا اٹھ کھڑا ہوگا۔ ہم حسب توفیق جواب ضرور دیں گے لیکن ہمیں کسی کی پرواہ نہیں۔ باطل قوتوں کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے کسی خطے میں شریعت محمدی نافذ نہ ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ مشکل راستہ ہے۔ ہم دنیا کی سیاست میں الجھ کر اسے اور مشکل نہیں بنانا چاہتے۔ ہمارا جواب ہمارا عمل ہے۔ اس مشن میں ہمیں آپ کا وہی تعاون اور وہی سرپرستی چاہئے جو جہاد افغانستان کے دوران ہمیں حاصل رہی۔ نفاذ شریعت کے لئے جدوجہد ہر مسلمان کا فرض ہے۔ آپ کل بھی ہمارے درد کو سمجھتے تھے اور آج بھی ہمارے درد کو سمجھتے ہیں۔ ہماری مدد کیجئے، ہمارا ساتھ دیجئے، اللہ آپ کو اور تمام مسلمانوں کو جزائے خیر دے۔“

اسی شام قندھار کے مغرب میں دریائے ارغنداب کے کنارے انگوروں کے باغات کی سیر کرتے اندھیرا گہرا ہو گیا۔ اچانک ایک طرف سے گرد کا غبار سا اٹھا اور ڈرا دیر بعد تین گاڑیاں ہمارے قریب رکیں۔ درمیان والی گاڑی کا دروازہ کھلا اور ڈرائیونگ سیٹ سے ایک سیاہ پوش نوجوان اترا۔ یہ امیر المؤمنین ملا محمد عمر تھے۔ اتر کر مولانا سمیع الحق سے ملے۔ ہم سب سے معافہ کیا، کندھے سے سیاہ چادر اتار کر زمین پر ڈالی اور بیٹھ گئے۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر ہاتھ اٹھائے پاکستان اور اہل پاکستان کو ڈھیروں دعائیں دیں کہ انہوں نے افغانستان کی آزادی کے لئے افغان بھائیوں کے ساتھ اپنا خون بہایا تھا۔ ارغنداب کی وادی میں رات کے اولین لمحوں کی دعا، میں کبھی نہ بھول پاؤں گا۔ جس شیریں لہجے میں ملا عمر نے ہمیں ”اسلامی بھائیو“ کہا تھا، اس کی شیرینی آج بھی کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ اس بات کو چھ سال ہو چلے ہیں۔ آج اپنی یادداشتوں پر نظر ڈالتے، میری نظریں ان سطور پر جم کر رہ گئیں..... ”آپ کل بھی ہمارے درد کو سمجھتے تھے اور آج بھی ہمارے درد کو سمجھتے ہیں، ہماری مدد کیجئے، ہمارا ساتھ دیجئے۔ اللہ آپ کو اور تمام امت مسلمہ کو جزائے خیر دے!!“

مسلسل ان سطور پر جمی آنکھیں سلگنے لگی ہیں۔ ملا عمر تک یہ پیغام پہنچانے کا کوئی وسیلہ بھی نہیں

کہ اب ہم ان کے درد کو محسوس کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں اور اب ہمارے سمیت پوری امت مسلمہ ”جزائے خیر“ کے لئے کسی اور سمت دیکھ رہی ہے۔

قیامت جیسے بھاری یہ شب دروز گزر رہی جائیں گے۔ انشاء اللہ افغان بھی باقی رہیں گے اور ان کے کوہ سار بھی لیکن برسوں بعد تباہ حال افغانستان کے کسی ریٹ ہاؤس یا دیویائے ارغنداب کے آس پاس میرا سا ملاما عمر یا ان کے کسی جانشین سے ہو گیا تو کیا بنے گا؟ کیا وہ اب بھی مجھے ”اسلامی بھائی“ کہہ کر پکاریں گے؟ اپنے دوستوں اور دشمنوں کو کبھی نہ بھلانے والی افغان نسلیں نہ جانے مجھے کس حوالے سے یاد رکھیں گی؟

[06-11-2001]

www.KitaboSunnat.com

سلامی

آگ، فولاد اور بارود کی برسات کو ایک مہینہ مکمل ہو گیا ہے۔ انصاف کو افغانستان کی دہلیز تک پہنچانے کے لئے امریکہ اور اس کے حواریوں کی مہم دوسرے مہینے میں داخل ہو گئی ہے۔ ترقی و خوشحالی کے بام عروج پر بیٹھی، 28 کروڑ تعلیم یافتہ افراد کی قوم، سر پر سپر پاور کی کلفتی سجائے، دو کروڑ کے لگ بھگ مفلوک الحاح، قحط زدہ اور بے سرو سامان لوگوں کو مار رہی ہے۔ ساری دنیا اس کے ساتھ ہے۔ مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلی ”امت مسلمہ“ بھی اس کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑی ہے۔ اب تک برسائے گئے ہزاروں کروڑ میزائلوں میں سے ہر ایک کی قیمت دس لاکھ ڈالر ہے۔ پچھلے تین سالوں میں افغانستان کی سوکھی دھرتی پر بارش کے اتنے قطرے نہیں گرے، جتنے بم اور میزائل گزشتہ تین دنوں میں برسائے جا چکے ہیں۔ بھاری عماموں اور پیوند لگے جاموں میں ملبوس پراسرار بندے اب تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ نہ جذیوں کی آنچ مدہم ہوئی ہے، نہ لہجے کی طرحداری میں فرق آیا ہے، نہ ان کی گردن جھکی ہے نہ غرور عشق کے بانگین میں کمی آئی ہے۔ ایک نسل کا خون روسی شکست کی داستان رقم کرنے میں صرف ہو گیا۔ دوسری نسل امریکی رعونت کے سامنے سینہ تانے کھڑی ہے اور تیسری نسل آگ اور خون کے اس کھیل میں کھو جانے والی ننھی منی خوشیوں کی تلاش میں بھٹک رہی ہے۔ وہ یہ نہیں جان پارہی کہ امریکہ ہم کیوں گرا رہا ہے؟ طالبان مطمئن ہیں کہ اب انہیں اپنے بچوں کو فرعونی طاقتوں کے خلاف سینہ سپر ہونے کا درس دینے کی ضرورت نہیں رہی۔ ایک تازہ دم سپاہ امریکہ کی آغوش تربیت میں پروان چڑھ رہی ہے۔

اس سپاہ کا ایک لشکری، گیارہ سالہ سعد محمد کونڈے کے ایک سرکاری ہسپتال کے بیڈ نمبر پانچ پر پڑا چھت کو مسلسل گھور رہا ہے۔ اس کے معصوم چہرے پر تازہ گلابوں کی طرح کھلی دو بڑی بڑی آنکھوں میں کتنے ہی سوال رقم ہیں۔ اس کی ایک ٹانگ کٹ چکی ہے اور دوسری کی ہڈیاں بھی چور چور ہیں۔

کچھ دن پہلے وہ قندھار کے نواح میں اپنے گھر سے باہر، سات سالہ بہن پر مینا اور بارہ دوسرے بچوں کے ہمراہ کھیل رہا تھا کہ امریکہ کے انصاف بردار طیارے اس کے سر پر آن پہنچے۔ ایک بم ان کے قریب گرا۔ پر مینا کئی فٹ فضا میں بلند ہوئی، سعد محمد کی دونوں ٹانگوں سے خون کے فوارے پھونٹے اور وہ بے سدھ ہو کر گر پڑا۔ اب وہ بیڈ نمبر پانچ پر پڑا ہر آنے جانے والے سے ایک ہی سوال پوچھتا ہے ”امریکی ہمیں کیوں مار رہے ہیں؟“ اس کے ساتھ والے بیڈ پر اس کی بہن پر مینا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اسے ہوش آتا ہے تو وہ اپنی ہم جولیوں کے بارے میں پوچھتی ہے جو اس کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ دونوں کے سر ہانے بیٹھان کا باپ تاج محمد زخموں پر بندھی پٹیوں پر منڈلاتی کھیاں اڑا رہا ہے۔

جنگ مسلسل جاری ہے۔ جس وقت امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ کا طیارہ پاکستانی فضائی حدود میں داخل ہو رہا تھا اور ہمارے جیٹ فائزر نے اسے اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیا تھا اور اسلام آباد کی شاہراہ دستور ہرزی روح سے خالی کرائی جا چکی تھی، اس وقت امریکہ کے بی۔ 52 طیارے حالیہ جنگی مہم کی شدید ترین بمباری میں مصروف تھے۔ بی بی سی کا کہنا ہے کہ 45 منٹ میں ان طیاروں نے ایک سو سے زائد بم گرائے۔ صدر پرویز مشرف نے ایک دفعہ پھر رمز فیلڈ سے درخواست کی کہ ”رمضان المبارک میں بمباری بند کر دی جائے۔“ لیکن تین گردن والے وزیر دفاع نے جواب دیا ”اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا چاہئے کہ بمباری کا سلسلہ اہداف حاصل ہونے تک جاری رہے گا۔“ پہلو میں کھڑے پاکستانی وزیر خارجہ نے تحسین بھرے لہجے میں کہا ”تاریخ میں کبھی شہریوں کی ہلاکتوں کو کم سے کم رکھنے کے لئے اتنی احتیاط سے کام نہیں لیا گیا جتنی احتیاط سے امریکہ کام لے رہا ہے۔“ ادھر دس ملکی تنظیم ”آسیان“ نے بروٹائی میں منعقدہ اجلاس میں افغانستان پر مسلسل بمباری اور عام شہریوں کی بڑھتی ہوئی ہلاکتوں پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ انہیں جناب رمز فیلڈ کی شہادت اور جناب عبدالستار کی توشیحی گواہی کے بعد ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ عین ممکن ہے کہ ہزاروں میزائل اور بم پہاڑوں پر اُگی گھاس پر منہ مار رہے ہوں، یا پتھروں سے آنکھ چھوٹی کھیل رہے ہوں یا کوہ پامیر کی گھاٹیوں میں بیٹھے چشموں کا پانی پی کر وہیں سو گئے ہوں۔

امریکی یلغار کا ایک ماہ مکمل ہونے پر شمالی اتحاد نے ایک شاندار ریڈ کا اہتمام کیا۔ پریڈ میں

دو ہزار سو ماؤں، سترہ ٹینکوں اور بیس بکتر بند گاڑیوں نے حصہ لیا۔ ٹینکوں نے اسامہ بن لادن کے ایک فرضی موپے پر گولہ باری کی اور ”صدر افغانستان“ پروفیسر برہان الدین ربانی نے سلامی لی۔ جب سلامی لیتے ہوئے پروفیسر ربانی کا ہاتھ ماتھے پر تھا تو ان کی نگاہیں آسمان کی بلندیوں پر مرکوز تھیں جہاں بی۔52 امریکی طیارے ”ہزاروں بم اٹھائے“ پرے باندھے چلے آ رہے تھے۔ نہ معلوم پروفیسر ربانی سلامی لے رہے تھے، یا سلامی دے رہے تھے۔

[07-11-2001]

خوف کا آسیب

امریکہ نے چند گھنٹوں کے اندر اندر افغانستان کی فوجی تنصیبات کی مکمل تباہی، طالبان کی اعصابی شکست، ان کی حکومت کے خاتمے اور شمالی اتحاد کی فرمانروائی کا جو خواب دیکھا تھا، وہ تعبیر سے دور تر ہوتا جا رہا ہے۔ زور آور لوگوں کی طرح امریکہ ہر ناکامی اور ہزیمت کے بعد زیادہ مہلک ہتھیاروں کے ساتھ حملہ آور ہوتا اور اپنی خفت افغانستان سے اٹھنے والے آتشیں دھوئیں کی سیاہ چادر میں چھپا دینا چاہتا ہے۔ نوع بہ نوع میزائلوں اور بموں کے بعد اب پندرہ ہزار ٹن وزنی بموں کی بارش شروع ہو چکی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ وزنی بم کو ”منی ایٹم بم“ بھی کہا جاتا ہے۔ صرف تین مسافر بردار طیاروں نے امریکہ میں قیامت پھا کر دی تھی۔ اگر اتنا گولہ بارود دنیا کی اس سب سے بڑی عسکری قوت پر گرایا جاتا تو زیادہ سے زیادہ 32 گھنٹوں میں اس کا کچھ مر نکل جاتا۔ 32 دنوں میں افغانستان پر 15 لاکھ بم گرائے جا چکے ہیں لیکن افغانیوں کی تنصیبات ختم ہونے میں ہی نہیں آرہیں۔ جب امریکی طیارے، شمالی اتحاد کے ”مجاہدوں“ کی تالیوں کی گونج میں بم گراتے اور سرخ پوش دھوئیں کی لمبی لیکر چھوڑ جاتے ہیں تو گمان گزرتا ہے کہ طالبان کی رگ جان کٹ گئی ہے لیکن ذرا دیر بعد وہ اپنے کپڑے جھاڑتے اور پگڑیاں سنبھالتے پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ امریکہ ابھی تک اس بے مقصد اور لا حاصل جنگ کے اثرات و نتائج کا درست گوشوارہ نہیں بنا سکا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں کہ گزرنے والے ہردن کے ساتھ اس کے چہرے کی سیاہی گہری ہو رہی ہے اور اس کی بربریت، عالمی رائے عامہ تیزی سے تبدیل کر رہی ہے۔

پاکستان میں ارباب اختیار کے مطابق حکومتی پالیسی کے مخالفین کی تعداد اب 15 فیصد سے بھی کم ہو گئی ہے۔ خاص طور پر قومی سلامتی، سٹریٹجک اثاثوں، کشمیر کا ز اور قومی معیشت کی بحالی کے اہداف حاصل ہو جانے کے بعد طالبان کی حمایت اور امریکی کولیشن کی مخالفت میں زبردست کمی آئی ہے۔ تاہم دنیا کے بیشتر عوام کی ہمدردیوں کا رخ مظلوم افغانیوں کی طرف مڑ رہا ہے۔ ان میں

وہ ممالک نمایاں ہیں جو ”دہشت گردی“ کے خلاف حالیہ مہم میں امریکہ کے قریبی حلیف ہیں۔ فرانس میں امریکی حمایت 66 فیصد سے گر کر 51 فیصد پر آگئی ہے۔ جرمنی میں 65 فیصد عوام نے فی الفور بمباری بند کرنے کے حق میں رائے دی ہے۔ چین کے 69 فیصد عوام نے امریکی بمباری کی مخالفت کی ہے۔ برطانیہ میں امریکی حمایت 74 فیصد سے کم ہو کر 62 فیصد پر آگئی ہے۔ 46 فیصد روسیوں کا خیال ہے کہ امریکہ اپنے مقاصد میں ناکام رہے گا۔

اس ساری صورتحال کا ایک پہلو یہ ہے کہ 15 لاکھ بموں کے باوجود طالبان کی صفوں میں خوف و ہراس کی کوئی لہر نہیں اٹھی۔ واضح مقصد کے لئے ناقابل شکست عزم آج بھی ان کا ایسا ہتھیار ہے جس نے ہر امریکی یلغار کا منہ موڑ دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کہ لہجہ کمزور پڑا ہے نہ اسامہ بن لادن کی آنکھوں کی چمک ماند پڑی ہے۔ اسامہ کے نو عمر بیٹے غزنی میں کسی مبینہ امریکی اڈے کے آثار تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ سب سے کم عمر بیٹا 10 سالہ حمزہ گیت گار ہا ہے۔ ”کابل! تو کڑے امتحانوں میں ہمیشہ سر بلند رہا ہے“ امریکہ کو ”ہالی وڈ کی سپر پاور“ کا طعنہ دینے والے ان شاہین بچوں کے چہروں پر خوف کا ہلکا سا سایہ بھی نہیں اور ادھر خوف کی بھٹی میں سلگتے 28 کروڑ عوام کی ہڈیاں چننے لگی ہیں۔ ان کی آنکھیں بے خواب ہو چکی ہیں۔ جب کبھی نیند کا ہلکورا آتا ہے، اسامہ کا تصور، ناگہانی موت کا خوف بن کر انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خوف کا یہ آسیب سرحدوں سے باہر تک پھیل گیا ہے۔ دودن قبل اٹلی کی پولیس نے سوئٹزر لینڈ جانے والے ایک ٹرک ڈرائیور کو مسلسل دس گھنٹے تک زیر حراست رکھا۔ اس کے ٹرک کے کاغذات یا پروانہ رہداری میں کہیں ”لادن“ LADEN کا لفظ لکھا تھا۔ اس لفظ نے خوف و دہشت کی ایک لہر دوڑادی۔ ڈرائیور کو حراست میں لے کر ٹرک کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ قریبی اتر پورٹ سے دھماکہ خیز مواد کے ماہرین طلب کر لئے گئے۔ کچھ دیر بعد بوسو گھسنے والے کتوں کا ایک غول بھی آگیا۔ پشیل اینٹی مافیا اور اینٹی ٹیرازم فورس کے دستے بھی آگئے۔ ٹرک سیل کر دیا گیا۔ انگریزی زبان سے نابلد ڈرائیور چیخا رہا لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔ دس گھنٹے بعد انکشاف ہوا کہ جرمن زبان میں LADEN کا مطلب وزن یا بوجھ (LOAD) ہے۔ ڈرائیور اور ٹرک کی گلو خلاصی تو ہو گئی لیکن شاہراہ کے پاسبان دیر تک حواس باختہ رہے۔

اے ایف پی کے مطابق روڈانیہ کے حکام نے ایک خاتون کے ہاں جنم لینے والے بچے کا نام

رجسٹر کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ مسلسل کئی دنوں سے ٹیلی ویژن دیکھنے اور اخبارات پڑھنے والی خاتون ”بن لادن“ کے عزم جواں سے متاثر ہو کر اپنے بچے کا نام ”بن لادن“ رکھنا چاہتی ہے۔ رومانیہ کے حکام کو اس نام سے خوف آتا ہے اور وہ مسلسل اس ضدی خاتون کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

رائٹر نے بھارت سے خبر دی ہے کہ ازیسہ کے قہبے ”دسپلہ“ سے ایک 45 سالہ شخص کو نقل مکانی کر جانے کا حکم صادر ہوا ہے۔ اس شخص کا تصور یہ ہے کہ وہ اسامہ سے غیر معمولی مشابہت رکھتا ہے۔ وہی لمبی داڑھی، وہی دبلا پتلا جسم، وہی قد و قامت۔ وہ جدھر جاتا ہے عوام کے ہجوم اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ مقامی انتظامیہ نے اندیشہ نقص امن کے تحت اسے ضلع بدر کر دیا ہے۔

”خوف کی غلامی“ کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔ امریکہ آزاد ہے، جمہوری اقدار کا پاسبان ہے لیکن اس کے آسودہ اور خوشحال عوام، اندیشہ ہائے دور دراز اور ناگہانی افتاد کے محکوم ہو کر رہ گئے ہیں۔ آزاد پیر پاؤر ہوتے ہوئے بھی ”خوف کی محکومی“ اس کا مقدر بن چکی ہے۔ افغانی آج بھی آزاد ہیں اور اس وقت بھی آزاد ہوں گے جب امریکہ کا سارا اسلحہ خانہ ختم ہو جائے گا۔

آج علامہ اقبال کا دن ہے اور وہ آزادی و محکومی کا فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں:

آزاد کی ہر آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لمحہ پیامِ ابدیت
محلوم کا ہر لمحہ نئی مرگِ مفاجات

[09-11-2001]

تمنائیں اور التجائیں

صدر پرویز مشرف کی فرانس، برطانیہ اور امریکہ کے سربراہان حکومت کے ساتھ ملاقاتوں کی تمام تر جزئیات تو شاید کبھی سامنے نہ آسکیں لیکن عوام الناس کے علم کے لئے ضروری خبریں ایک آدھ دن میں سامنے آجائیں گی۔ اب تک کی پیش رفت سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ جس عمارت کی پہلی اینٹ نیزھی رکھ دی گئی ہو، کسی ہنرمند کاریگر کے مشاق ہاتھ بھی اسے سیدھا نہیں کر سکتے۔ وہ جتنی اونچی جائے گی اس کی ناپائیداری عیاں اور کجی نمایاں ہوتی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی کولیشن کا حصہ بننے کی ”ناگزیر برائی“ قبول کر لینے کے باوجود ہمارے سامنے کئی راستے کھلے تھے۔ ہم نے ایک ایک کر کے وہ سارے راستے بند کر دیئے اور اب ایسے گنبد میں قید ہیں جہاں اپنی ہی صدا پلٹ پلٹ کر آتی ہے اور اس ”حمام بادگرد“ کا طلسم توڑنے والا حاتم دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ تمنائیں اور التجائیں جگ ہنسائی اور رسوائی کا سامان بنتی جا رہی ہیں۔

وہ گھڑی یقیناً قیامت کی تھی جب صدر مشرف کو قومی تاریخ کا ایک انتہائی نازک اور اہم فیصلہ کرنا پڑا۔ ان کے پاس ایسی کوئی تاویل یا دلیل نہ تھی جسے کوئی جلسہ ساز سیاستدان ایسے نامطلوب لمحے کو نالنے کے لئے بہانہ بنا سکتا تھا۔ اختیار کلی کا مالک ایک ہمہ مقدر حکمران ہونے کے ناتے انہیں ایک فیصلہ کرنا تھا اور بلاتاخیر کرنا تھا۔ انہوں نے اپنی دانست میں وسیع تر ملکی مفاد کے پیش نظر ایک فیصلہ کر لیا۔ آج بھی ایک بڑا حلقہ اس بات کا قائل ہے کہ گیارہ ستمبر کے دن جب امریکہ اشتعال کے غلبے سے حواس باختہ ہو چکا تھا اور پاکستان کے بارے میں اس کی ”خوئے بد“ کسی بہانے کی تلاش میں تھی، تو مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ ہم پہلو بچا جائیں اور اپنا سینہ پھرے ہوئے جنگلی بھینسے کے نوکیلے سیٹلوں کے سامنے نہ رکھ دیں۔

عوامی سطح پر تلخی اس احساس کی وجہ سے بڑھی کہ ہم نے بھینسے کو بھینس سمجھ کر دودھ کے لالچ میں اس کی ناز برداری شروع کر دی۔ ایک نیزھی اینٹ کو نیزھا سمجھ کر جوں کا توں چھوڑ دینے اور

سازگار موسموں کا انتظار کرنے کے بجائے ہم نے اونچی دیواریں اٹھانے اور چوہارے بنانے کی ٹھان لی۔ اس آرزو اور کوشش میں ہم مسلسل لڑھکتے چلے گئے۔ ہمارے مطالبات رد ہوئے۔ ہمارے خدشات بلا جواز ٹھہرے۔ ہماری توقعات بنتی، ٹوٹی رہیں۔ عنایات اور نوازشات کی گھٹائیں گرجتی رہیں لیکن برسنے نہ پائیں۔ ہم نے اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر دربارائی کی جتنی ادائیں دکھائیں، انہیں ہماری مجبوری و بے چارگی سے تعبیر کیا گیا۔ ہم نے جو کچھ کہا، اس کا مثبت رد عمل سامنے نہ آیا بلکہ بیشتر اوقات ہمارے نقطہ نظر کے متصادم بیانات جاری ہوئے اور آج کیفیت یہ ہے کہ اس مہم کی فرنٹ لائن سٹیٹ ہونے، وازرون کی پرکار کامرکزی نقطہ بننے اور امریکہ کی رضا کارانہ وکالت کے باوجود ہماری آواز گنبد کی گونج بن چکی ہے۔

11 ستمبر سے پہلے امریکہ، برطانیہ، یورپی یونین اور دولت مشترکہ ہمارے ساتھ جو کچھ کر رہے تھے وہ کوئی بہت پرانی بات نہیں۔ آج ہماری عزت افزائی کے جو سامان ہو رہے ہیں اس کا سبب بھی واضح ہے۔ یہ بھی کوئی پہلی نہیں کہ ہمارے ہاں پانی کا ایک گھونٹ تک نہ پینے والے ہمیں پُر تکلف عشاءیں کیوں دے رہے ہیں۔ کھونے اور پانے کا کھانا تیار ہونے میں تو وقت لگے گا البتہ شمالی اتحاد کی صورت میں ایک فوری ”انعام“ ہماری دہلیز پر کھڑا دستک وے رہا ہے۔ ہم نے بڑی درد مندی کے ساتھ یہ مطالبہ امریکہ کے سامنے رکھا تھا کہ ”وسیع البہیاد“ حکومت کے لئے جو چاہے کر لو لیکن شمالی اتحاد کو ہماری سرحدوں سے دور رکھو۔ بھان منشی کے اس کتبے کا خمیر ہی پاکستانی دشمن سے اٹھا ہے۔ ہماری عرضداشت پر کچھ دیر ہمدردی کا اظہار کیا گیا، پھر شمالی اتحاد کو ”اپوزیشن فورسز“ کا نام دے کر گوارا بنایا گیا اور اب ”من تو شدم تو من شدی“ کی کیفیت ہے۔ شمالی افغانستان میں موجود سی این این کے نمائندے کا کہنا ہے کہ نادر دین الائنس کے گھوڑوں کے لئے چارہ بھی امریکی جہازوں کے ذریعے گرایا جا رہا ہے۔ بھارتی فوج کے حاضر سردس خرنیل ان کی سائیس کے لئے اس کے ساتھ ہیں۔ نام نہاد الائنس کا وزیر خارجہ ٹی وی پر امریکیوں سے کہتا ہے:

"ROUND THE CLOCK BOMBING IS NEEDED. INTENSE BOMBING, CARPET BOMBING"

”چوبیس گھنٹے مسلسل بمباری چاہئے، شدید بمباری، قالین بچھا دینے والی بمباری“

ستم ظریفی دیکھئے کہ ساری دنیا ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر افغانوں کو مار رہی ہے۔ لاکھوں ٹن بارود برسایا جا رہا ہے۔ ہزاروں بے گناہوں کا خون بہ رہا ہے۔ ایک جی جمانی حکومت کے سربراہ کو قتل کرنے کے لئے کمانڈ فورسز اتاری جا رہی ہے اور کہا جا رہا ہے کہ ”ہم بیرونی مداخلت کے بغیر افغانی عوام کو اپنے حکمران چننے کا موقع دینا چاہتے ہیں۔“ لطف کی بات یہ ہے کہ ہم بھی اس محفل موسیقی میں طلبہ بجا رہے ہیں۔ یہ طے پا چکا ہے کہ جن لوگوں کو تخت اقتدار پر بٹھایا جائے گا ان میں ”طالبان“ نام کی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ یہ وہی عناصر ہوں گے جنہوں نے ربانی کے عہد صدارت میں افغانستان کو بدترین قسم کی لاقانونیت، ہنگامہ و فساد، بد امنی اور انارکی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے خود چین سے قندھار تک تقریباً ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے میں انچاس ایسی چوکیاں دیکھی تھیں جو طالبان سے قبل ”وار لارڈز“ کے قبضے میں تھیں اور جہاں سے گزرنے والے قافلے اپنے نوخیز بچوں کو بھی بوریوں میں بند کر کے گزرتے تھے۔ قندھار میں پاکستان کے فوجیوں نے جنرل جناب عزیز الرحمن گل نے مجھے ان چوکیوں کے بارے میں ایسی لرزہ خیز داستانیں سنائی تھیں جو قلم کی زبان پر نہیں لائی جا سکتیں۔ گزشتہ ہفتے اپنی بہو، بیٹیوں کے ہمراہ کابل سے پشاور پہنچنے والے ایک بوڑھے نے اخبار نویسوں کو بتایا تھا کہ ”طالبان کے ہوتے ہوئے ہماری عزتوں کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ بیخ شیر والے آگے تو ہمارا سب کچھ لٹ جائے گا۔“

امریکی آشیر باد کے باوجود ”بیخ شیر“ والوں کو کابل تک آنے میں کچھ وقت لگے گا لیکن ہم کب تک ایک ٹیڑھی اینٹ پر ردے لگاتے رہیں گے؟ بمباری کو فوجی اہداف تک محدود رکھنے کا مطالبہ طیاروں کی گونج میں کھو گیا۔ جنگی مہم کو مختصر رکھنے کی ہماری درخواست بھی منظور نہ ہو سکی۔ شمالی اتحاد کے بارے میں ہمارے تحفظات بھی قصہ ماضی بن چکے ہیں۔ جہاد اور دہشت گردی میں تفریق کا نعرہ بھی دم توڑ چکا ہے۔ چند روز بعد رمضان میں بمباری روکنے کا مطالبہ بھی ”عید الفطر“ کے دن معافی دینے کی عرضداشت تک محدود ہو جائے گا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم بھیسے کو بیہنسا ہی رہنے دیں اور ”دودھ“ کی تمناؤں یا التجاؤں کے بجائے ساری توجہ اپنے آپ کو اس کے خونخوار سینگوں سے محفوظ رکھنے پر مرکوز کر دیں؟

[10-11-2001]

اسرائیل کی وکالت

امریکہ کو شاید اپنے ناموس کے بارے میں اتنی تشویش نہیں جتنی فکر اسرائیل کے دامن کو اجلا اور شفاف رکھنے کی ہے۔

چند دن قبل اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے نے باضابطہ طور پر مسلم لیگی رہنما برادر محمد اعجاز الحق کے بعض بیانات پر برہمی کا اظہار کیا ہے جن میں انہوں نے امریکہ سے کہا تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اسامہ بن لادن اور طالبان کو مجرم قرار دینے کے بجائے اسرائیل اور دیگر دہشت گرد تنظیموں کے بارے میں بھی تحقیق کر لیں۔ اعجاز الحق نے پہلے نوائے وقت، نیشن کے لیڈر شپ لیکچر اور بعد میں پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں کہا تھا کہ دہشت گردی کی کارروائیاں کرنے اور الزام دوسروں کے سر دھرنے کے بارے میں اسرائیل ”شاندار“ ریکارڈ رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنی بات کے حق میں ان واقعات کا حوالہ بھی دیا تھا:-

☆..... 1940ء کی دہائی میں سات لاکھ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے مار بھگایا گیا۔ اس دوران ظلم و ستم کی انہما کردی گئی۔ ماؤں کے پیٹ چاک کر کے بچوں کے گلڑے اڑا دیے گئے۔

☆..... موجودہ اسرائیلی وزیراعظم ایریل شیرون نے خود صابرہ اور شتیلہ کے کیسوں کے قتل عام میں حصہ لیا تھا۔

☆..... 1954ء میں اسرائیل نے قاہرہ اور سکندریہ میں امریکی تنصیبات پر حملوں کا منصوبہ بنایا جس کا نام اسرائیلی وزیر دفاع کے نام پر LAVON AFFAIR رکھا گیا۔ یہ منصوبہ کسی وجہ سے ناکام ہو گیا اور 1955ء میں LAVON کو مستعفی ہونا پڑا۔ منصوبے کا مقصد ان وارداتوں کے ذریعے امریکہ کو مصر سے لڑانا تھا۔

☆..... 1967ء میں اسرائیل نے ایسے جہازوں کے ذریعے جن پر کوئی شناختی نشان نہ تھا، امریکی بحری جہاز ”لبرٹی“ پر حملہ کیا۔ اس حملے میں 31 امریکی مارے گئے اور 170 زخمی

ہوئے۔ اسرائیل نے امریکی جہاز کو غرق کرنے اور تمام امریکیوں کو ہلاک کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس واردات کا مقصد امریکہ کو عربوں کے خلاف مشتعل کرنا تھا۔

☆..... 1986ء میں اسرائیل 'تجنسی' موساڈ نے لیبیا کے دارالحکومت طرابلس میں ایک جعلی ٹرانسمیٹر نصب کیا جہاں سے عربی زبان کے مخصوص کوڈ میں جعلی پیغام نشر کر کے لیبیا کا تعلق جرمنی میں ہلاک ہونے والے دو امریکیوں سے جوڑ دیا گیا۔ اسرائیلی منصوبے کے عین مطابق امریکہ لیبیا پر چڑھ دوڑا۔

☆..... 11 ستمبر کے واقعات کے فوراً بعد مسلمان نشانہ بن گئے ہیں اور عالمی "دہشت گردی" کے خلاف مہم کی آڑ میں صرف اسلامی شخصیات اور تنظیموں کو نشانہ بنایا جا رہا ہے لہذا قیاس کہتا ہے کہ یہ کارروائی بھی مسلم دشمن اسرائیل نے کی ہوگی۔

پاکستان میں اسرائیل کا سفارتخانہ موجود نہیں لیکن جس شام اعجاز الحق کا انٹرویو چلا، اس سے اگلے دن انہیں ایک بھاری بھر کم سیل بند لفافہ موصول ہوا جس پر امریکی سفارتخانے کی مہر لگی تھی۔ لفافے میں طبع شدہ میٹر میل کے علاوہ سفارت خانے کے قونصلر تعلقات عامہ مسٹر جان کن کینن (JOHN KINCANNON) کا تحریر کردہ ایک خط بھی شامل تھا۔ دو صفحات پر مشتمل اس خط میں بہت کچھ کہا گیا تھا لیکن نفس مضمون صرف اس قدر تھا کہ "اسرائیل پر الزام کیوں لگایا؟" خط کا آغاز اس طرح ہوتا ہے.....

"گزشتہ شام ٹی وی پر آپ کے ریمارکس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے خیال میں اسرائیل بھی امریکہ میں 11 ستمبر کے حملوں میں ملوث ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو ایسا مواد بھیج رہا ہوں جس سے ہمارے خیال میں، بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ان واقعات میں القاعدہ ملوث ہے۔" اپنی تفتیشی کارروائیوں پر روشنی ڈالنے کے بعد امریکی آفیسر تعلقات عامہ مزید لکھتے ہیں۔

"آپ کے بیانات، جن میں اسرائیل کو 11 ستمبر کے واقعات میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے، قطعی طور پر غلط ہیں۔ انواہوں اور ڈس انفارمیشن کے سوا ایک بھی ایسا ثبوت منظر عام پر نہیں آیا جس سے اندازہ ہو کہ پیٹھاگان اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملوں کی ذمہ داری اسامہ بن لادن اور القاعدہ کے علاوہ کسی اور پر ڈالی جاسکے۔"

برادر م اعجاز الحق آج کل ایک ایسی تنی رسی پر چل رہے ہیں جہاں سانس بھی آہستہ لینے کی

ضرورت ہے کہ کہیں توازن نہ بگڑ جائے لیکن انہوں نے ”ہم دلی“ کو ”ہم خیالی“ پر ترجیح دیتے ہوئے کھربئی کھری سنا ڈالی ہیں۔ امریکی سفارت خانے کے نام اپنے جوابی مکتوب میں انہوں نے لکھا:-

☆..... ”ہم امریکہ پر دہشت گردوں کے حملوں کی مذمت کرتے ہیں۔ ہم کشمیر اور فلسطین کے معصوم عوام پر ڈھائی جانے والی ریاستی دہشت گردی سمیت، دنیا بھر میں موجود ہر نوع کی دہشت گردی کا خاتمہ چاہتے ہیں۔

☆..... ہر انسان کی زندگی یکساں طور پر قیمتی ہے چاہے وہ افغانستان میں رہتا ہو یا فلسطین میں، کشمیر میں یا امریکہ میں۔

☆..... میں نے 50 اور 60 کی دہائیوں میں اسرائیلی کارروائیوں کا تذکرہ اس لئے کیا تھا کہ امریکی اداروں کو تفتیش کرتے وقت اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے تھا۔ علاوہ ازیں دنیا میں موجود دوسری دہشت گرد تنظیموں کے بارے میں بھی مکمل تفتیش ہونی چاہئے تھی۔

☆..... امریکہ کی جلد بازی ناقابل فہم ہے۔ امریکی صدر نے خود کہا تھا کہ ”ہم مناسب وقت کا انتخاب کریں گے۔“ اگر تمام دہشت گرد تنظیموں کی مکمل چھان بین اور حتمی نتیجے تک پہنچنے میں چھ یا آٹھ ماہ بھی لگ جاتے تو کیا ہرج تھا۔

☆..... میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ خیالات بے شمار دوسرے لوگوں کے بھی ہیں۔ ان میں یورپین امریکن یونٹی اینڈ رائٹس کمیشن کے صدر ڈیوڈ ڈیوک (DAVID DUKE) بھی شامل ہیں۔ میں ان کا ایک مضمون آپ کو بھیج رہا ہوں۔

☆..... میں نے فی وی پروگرام میں بھی کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ پائیدار اور مستحکم حل صرف اور صرف پراسن مذاکرات ہی کے ذریعے نکل سکتا ہے۔“

امریکہ اور اعجاز الحق کی یہ مراسلت ابھی تک پریس کی زینت نہیں بنی ورنہ یہ سوال اٹھایا جا چکا ہوتا کہ امریکہ، اسرائیل کے بارے میں اتنا حساس کیوں ہے؟ ملا عبد السلام ضعیف تو خاک و خون میں نہائے افغانوں کا نوحہ بھی نہیں پڑھ سکتا اور امریکی سفارتخانہ ایک ایسے ملک کی وکالت میں مصروف ہے جسے پاکستان نے تسلیم ہی نہیں کیا اور جو پاکستان دشمنی میں بھارت کا دست و بازو بنا ہوا ہے۔

[12-11-2001]

تماشا ختم ہوگا

افغانستان، طالبان کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ امریکہ کی سالاری میں بہادری کے جوہر دکھانے والا شمالی اتحاد پے در پے فتوحات کے جھنڈے گاڑتا طوفانی پیش قدمی کر رہا ہے۔ کابل سے ہرات تک اس کا پرچم لہرانے لگا ہے۔ چالیس دنوں سے محاصرے میں آئے ہوئے طالبان جنوب میں سمٹے جا رہے ہیں۔ مزار شریف میں جشن فتح کی کہانیاں عالمی ذرائع ابلاغ کے ذریعے منظر عام پر آرہی ہیں۔ داڑھیاں نوچی جا رہی ہیں۔ فاتح سپاہ خواتین کے برقعوں سے کھیل رہی ہے۔ نو عمر بچے اور عورتیں گھروں کے اندر چھپی بیٹھی ہیں۔ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم ہے۔ امریکی کولیشن، کامرانی کے نشے میں سرشار ہے اور گہرے دکھ کی اس گھڑی میں کچھ پاکستانی دانشوروں کے قلم کی زہرناکی اہل پاکستان کے دلوں پر نشتر چلا رہی ہے۔ ان کا کہنا ہے ”ہم نہ کہتے تھے کہ مادی قوت کے سامنے جذبات کی دیواریں کھڑی نہیں کی جاسکتیں اور ہوا کے رخ کے مخالف چلنے والے سفینوں کو ڈوبنا ہی ہوتا ہے۔“ افغانوں اور ان کے کوساروں پر ٹوٹنے والی قیامت سے اپنے افکار کو حرارت بخشنے اور امریکی بربریت کی شکار قوم کے زخموں سے دلائل کا عرق کشید کرنے والے پاکستانی دانشور، طالبان اور ان کے ہمنواؤں کی بے حکمتی اور کم دانشی کا ماتم کر رہے ہیں۔ چالیس دنوں سے اداس رہنے والی ان کی شامیں یکا یک رنگین ہو گئی ہیں۔

کسے معلوم نہیں کہ جذبے، میزائلوں اور بموں کی ہلاکت آفرینی نہیں روک سکتے.....؟ کون نہیں جانتا کہ دعاؤں سے توپوں میں کیڑے نہیں پڑا کرتے؟ کس کو خبر نہیں کہ محض حق پر ہونا، تیز دھارتلواریں کو کند نہیں کر سکتا؟ اگر ایسا ہوتا تو تاریخ کی آستین پر کسی کر بلا کا لہو نہ ہوتا اور سلسلہ روز و شب کی آغوش میں کوئی شام غریباں نہ ہوتی۔

سامنے کی بات ہے کہ اپنے لامحدود مفادات کے ایجنڈے پر عمل پیرا امریکہ، دھونس،

دھاندلی اور ترغیب کے ہتھیاروں کے ساتھ، ساری دنیا کو ہمراہ لے ایک ایسی قوم پر چڑھ دوڑا جس نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ جب طالبان وجود میں آئے تو اسامہ، مجاہد تھا۔ اس وقت تک اس کے دامن پر کسی دہشت گردی کا کوئی داغ نہ تھا۔ وہ کسی ”سب سے بڑے مشتبہ“ کے میزبان بھی نہ تھے۔ تب بھی امریکہ سمیت دنیا کے ایک سو نوے سے زائد ملکوں نے ان کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ شمالی اتحاد دس فیصد افغانستان میں سکر اسٹنا بیٹھا تھا تب بھی عزیز جاں تھا اور آج بھی اس کی ہر ادا مغرب کے لئے تو بہ شکن ہے۔ اخلاق کی ادنیٰ ترین صفات سے عاری جس گروہ نے افغانستان کو مکروہ اور گھناؤنے جرائم کی آماجگاہ بنا دیا تھا اور جس کی فرمانروائی میں ہر دس قدم پر عزتوں اور عصمتوں کی قتل گاہیں قائم تھیں، آج وہ انسانی حقوق کے امریکی بیڑے میں بیٹھ کر کابل کے ساحل پر اترا ہے اور دانشور کو سنے دے رہے ہیں کہ ”ہم نہ کہتے تھے۔“

امریکہ افغانستان میں کئی لیکریں ڈال کر اپنے طویل المیعاد مقاصد کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ شمال مشرقی افغانستان سے طالبان کی بے دخلی، نیو ورلڈ آرڈر کے ایک اہم مرحلے کی تکمیل ہے۔ کولن پاول کا بیان آ گیا ہے کہ امریکہ وہاں ایک ایسا اڈہ تعمیر کرے گا جو فوجی اور دیگر مقاصد کے لئے استعمال ہوگا۔ امریکہ کی خوشی قابل فہم ہے کہ خلیج کے بعد اب وسط ایشیا کے معدنی وسائل بھی اس کی مٹھی میں آگئے ہیں۔ ترکی خوش ہے کہ ازبک رشید و ستم کی بن آئی ہے۔ ایران خوش ہے کہ اسماعیل خان اور کریم خلیلی ہرات اور وسط افغانستان پر قابض ہو گئے ہیں۔ تاجکستان مطمئن ہے کہ احمد شاہ مسعود کے جانشین قاسم نہیم کے قدم کابل تک آ پہنچے ہیں۔ بھارت خوش ہے کہ اس کا پروردہ قبیلہ پاکستان کے سر پر سوار ہو گیا ہے۔ روس آسودہ ہے کہ اس نے مجاہدین افغانستان سے انتقام لے لیا ہے اور اس جنگ میں اپنا سب کچھ جھونک دینے والا پاکستان لٹی بستیوں اور جلتے خیموں کو دیکھ کر یہ فیصلہ بھی نہیں کر پارہا کہ یہ کسی کی خانماں بربادی کا منظر ہے اور کون سا لشکر طبل بجاتا، علم لہراتا، فیصل شہر میں داخل ہو رہا ہے۔ فاتح گروہ کٹری کا نشان بنائے اپنے اپنے دوستوں کی طرف دیکھ رہے ہیں اور طالبان حیران ہیں کہ ان کے چاہنے والے، دشمن کی کمین گاہ میں بیٹھے تیر بر سار ہے ہیں۔

طالبان کو ایک کونے میں دھکیل دینے کا مطلب افغانستان کی مرکزیت اور یکجہتی پر ضرب لگانا ہے۔ اب شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک کوئی شخصیت باقی نہیں رہی جس کا سکہ ہر کہیں

چلتا ہو۔ کلڑیوں میں بنا ہوا افغانستان مختلف جنگی سوراخوں کی چراگاہ بن گیا ہے۔ اپنا اپنا جنگل اپنی اپنی بادشاہت۔

طالبان کی جنگ لڑنے والے کسی طبقے یا گروہ یا قبیلے کی نہیں، ایک فلسفہ حیات کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ وقت کی منہ زور قوتوں کی نا انصافی کے مقابلے میں حق و صداقت کی جنگ۔ اس جنگ میں شہر اور قصبے کوئی مستحق نہیں رکھتے۔ ازل سے ابد تک جاری اس جنگ میں ”شرار ابولہسی“ کے بھڑک اٹھنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ چراغ مصطفویٰ کی لوکا تحفظ کرنے والے ہار گئے ہیں۔ اس جنگ کا جاری رہنا ہی اس کی فتح ہے۔ اس کے زمانے اور مقام بدلتے رہتے ہیں لیکن کشمکش ختم نہیں ہوتی۔ دانشور نہ بھولیں کہ یہ ڈرامے کا آخری سین نہیں۔ اس کے مصنف، ہدایت کار اور کرداروں کو کچھ معلوم نہیں کہ آگے کا منظر کیا ہوگا۔ دیوانگی اور رومانویت کا شکار قبیلہ جانتا ہے کہ ابھی بہت سے مرحلہ ہائے شوق باقی ہیں۔ ابھی کئی نامہربان موسم آنے ہیں۔ اگر عمر، عثمان اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے پر نور سینے کسی خنجر کا منہ نہیں موڑ سکتے تو اسامہ بن لادن اور ملا عمر کس باغ کی مولیٰ ہیں؟ لیکن اس دیوانہ خوقبیلے کو یقین ہے کہ نہ کوہسار فنا ہوں گے نہ افغان اور نہ وہ روح کائنات جو مر مر کے زندہ ہوتی چلی آئی ہے۔ البتہ حکمت و دانش کا درس دینے والے قلم کار، صورتحال کا صحیح ادراک حاصل کرنے کے لئے تماشا ختم ہونے کا انتظار کریں۔

کہانی آپ ابھی ہے کہ الجھائی گئی ہے.....
یہ عقدہ تب کھلے گا جب تماشا ختم ہوگا.....
یہ سب کچھ پتلیاں رقصاں رہیں گی رات کی رات
سحر سے پہلے پہلے سب تماشا ختم ہوگا.....

[14-11-2001]

میں کون ہوں؟

بیٹھے بٹھائے یکا یک میں اپنی پہچان کھو بیٹھا ہوں اور مسلسل سوچ رہا ہوں کہ میں کون ہوں؟ انسان کے لئے سب سے بڑا آشوب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی شناخت بھول جائے۔ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے چہرے پر نظریں گاڑے اس الجھن میں ہو کہ یہ جانا پہچانا شخص کون ہے؟ لوگ اس کا نام لے کر پکاریں اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا ہو کہ یہ کسے بلا رہے ہیں؟ اپنے قدموں پر پورے قدم کے ساتھ کھڑا کھڑا بیٹھ میں گم ہو جائے، اپنے گھر کی دہلیز پر بیٹھا اس سوچ میں کھو جائے کہ مجھے کہاں جانا ہے؟ میرے دوست کون ہیں؟ میرے دشمن کون ہیں؟ میں خود کون ہوں؟ جو لوگ سامنے کی تلخ حقیقتوں کو دیکھتے ہوئے جذبات کی رو میں بہ رہے تھے اور امریکہ کی بے پایاں عسکری قوت کا پورا پورا احترام ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے طالبان کی آشفٹ سری کا ساتھ دے رہے تھے، انہیں آنے والے موسموں کی چاپ پہلے سے سنائی دے رہی تھی۔ امریکہ کے ماضی پر نظر رکھنے اور اس کے عزائم کا حدود اربعہ جاننے والوں کو یہی ڈر تھا کہ منزل ملی تو ہم قافلے کی دھول بن کر رہ جائیں گے۔ دوسوں اور واہموں میں جتنا لوگوں کو یہی خوف کھائے جا رہا تھا کہ ہم بڑی محنت کے ساتھ افغانستان کے کوساروں اور وادیوں میں جو جنت تعمیر کر رہے ہیں وہ کسی ”شداد“ کے حصے میں آئے گی اور ہمیں معمار بننے کا معاوضہ بھی نہیں ملے گا۔

ہم نے عالمی کولیشن کے رحم میں بٹھا کر رشید دو ستم کو مزار شریف تک پہنچایا۔ اس نے اور اس کے سپاہ نے پاکستان اور پاکستانی قیادت کے خلاف غلیظ زبان استعمال کرتے ہوئے ظلم و بربریت کا ایسا بازار گرم کیا جس سے انسانیت پناہ مانگتی ہے۔ جنرل حمید گل کا کہنا ہے کہ ”دو ستم زانی، شرابی اور لئیرا ہے۔ اس کی بدکرداری کے لئے کوئی بھی لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔“ امریکی رسالے ”ٹائم“ نے اسے ”پیٹھ میں چھرا گھونپنے والا شخص“ کہا ہے۔ دو ستم کی سپاہ عصمت شعار خواتین اور خوبرو لڑکوں کے تعاقب میں ہے۔ اس نے چھ سو سے زائد پاکستانیوں اور عربوں کی لاشوں کے

سرہانے جشنِ طرب منایا ہے۔ رقصِ ابلیس مسلسل جاری ہے۔

جنرل قاسم فیہم کی فاتح سپاہِ کابل میں داخل ہو چکی ہے۔ ہم اس امر کی مہم کا ہر اول دستہ تھے جس نے طالبان کو بے دست و پا کیا اور لاکھوں ٹن بارود برسا کر جنرل فیہم کی فتح کا راستہ ہموار کیا۔ وہ کابل میں گھسا ہے تو اس کے فوجی احمد شاہ مسعود کی تصویریں اٹھائے ”پاکستان مردہ باد“ کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اس کے وزیر خارجہ عبداللہ کا کہنا ہے کہ ”پاکستان کابل میں ہمارے داخلے پر معترض کیوں ہے؟ وہ تو اس کو لیشن کا حصہ ہے جس نے ہماری مدد کی اور طالبان کا تختہ الٹا۔“ پروفیسر برہان الدین ربانی نے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے اپنی سپاہ کو حکم دیا ہے ”کسی کو کچھ نہ کہو لیکن کسی پاکستانی اور عرب کو معاف نہ کرنا“ فاتح لشکر کی بھوکے بھڑیوں کی طرح کابل کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ کوئی مشکوک فرد نظر آئے تو ”پاکستانی“ یا ”طالبان“ کا نعرہ لگا کر اس کا سینہ چھلنی کر دیتے ہیں۔

اقوام متحدہ کے ذرائع نے بتایا ہے کہ ایک سکول میں پناہ لینے والے ایک سو پاکستانیوں کو بھون ڈالا گیا۔ نیویارک ٹائمز کی خبر ہے کہ ایک 65 سالہ پاکستانی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس پر گولیوں کی مشق کی گئی اور پھر اس کے منہ میں مارٹر کا ایک گولہ ٹھوس کر سڑک کے کنارے پھینک دیا گیا۔ چھ پاکستانیوں کو ذبح کر کے ان کی نعشیں درختوں سے لٹکا دی گئیں۔ ہزاروں لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنی بہو بیٹیوں کا ناموس بچانے کے لئے فرار ہو رہے ہیں۔ ایسی تصاویر چھپی ہیں کہ ناردرن الانس کے سپاہی پاکستانیوں کی نعشوں کو ٹھنڈے مار رہے ہیں، کئی ایک لاشیں ٹیکوں کے ساتھ باندھ کر گھسیٹی جا رہی ہیں۔ شاہراہ شہزادہ منی آپکھنچ کے صدر امین جان خوست نے بتایا ہے کہ فاتحین کی پہلی دستک کے ساتھ ہی لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپکھنچ کے 80 دفاتر میں سے لاکھوں ڈالر، کروڑوں پاکستانی روپے اور اربوں افغانی لوٹ لئے گئے۔ دفاتروں کے قالین، کمپوٹر اور دیگر ساز و سامان بھی لوٹ لیا گیا۔ پاکستانی سفارتخانہ خصوصی نشانہ بنا۔ بے لگام گروہ، پکھے، ایئر کنڈیشنرز، کبل اور فرنیچر گاڑیوں میں بھر کے لے گئے۔ کابل کی سڑکوں پر بکھری لاشوں کے گرد بدست فوجی رقص کر رہے ہیں۔ شراب پانی کی طرح بہ رہی ہے، مسجدوں کے لاؤڈ سپیکر بھی بھارتی فحش گانوں کے لئے استعمال ہو رہے ہیں۔ ڈاڑھیاں تیز دھار استروں کی زد میں ہیں اور کابل کے بے رنگ درود یوارا چانک بھارتی اداکاروں کی تصویروں سے سج گئے ہیں۔

11 ستمبر سے ہم امریکی کولیشن کا حصہ ہیں اور 11 ستمبر کے بعد سے ہم مسلسل اپنے ٹوٹتے خوابوں کی کرچیاں چن رہے ہیں۔ ہماری کوئی بھی آرزو بر نہیں آئی۔ 37 ارب قرضوں کا پہاڑ جوں کا توں ہے۔ معیشت بدستور جاں بہ لب ہے۔ ایٹمی پروگرام مغربی محفلوں کی تفریح طبع کا سامان بن چکا ہے۔ کشمیر کا زامریکی خوشنودی کے کچے دھاگے سے بندھا ہے۔ رہی قومی سلامتی، تو بی بی سی کا یہ تبصرہ کافی ہے کہ ”اب پاکستان مغرب کی طرف پیٹھ کر کے بھارت کا سامنا نہیں کر سکے گا۔“

بصروں، حکمت کاروں اور دانشوروں کی باتوں سے مجھے کچھ واسطہ نہیں، میرا مسئلہ تو صرف اپنی شناخت ہے جو نہ جانے کہاں کھو گئی ہے۔ میں مسلسل اپنے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ سر بازار کھڑا ہر آنے جانے والے سے پوچھ رہا ہوں کہ ”میں کون ہوں؟“

میں نے ”سب سے پہلے پاکستان“ کا نعرہ لگا کر جس کولیشن کا ساتھ دیا تھا اس کے پہلے فتح مند دستے نے کابل میں داخل ہوتے ہی ”پاکستان مردہ باد“ کا مکروہ نعرہ کیوں لگایا ہے؟

اگر میں بھی اس فاتح سپاہ کا ایک لشکری ہوں تو میرا سینہ چھلٹی کیوں ہے اور میرے منہ میں مارٹر کا گولہ کیوں ٹھنسا ہوا ہے؟

اگر میرا نام امریکی قیادت میں لڑی جانے والی جنگ کی ”فرنٹ لائن ٹیٹ“ ہے تو میری گردن کئی لاش درخت سے کیوں جھول رہی ہے؟

اگر میں فاتح بھی نہیں، مفتوح بھی نہیں تو پھر میں کون ہوں؟

[15-11-2001]

انقلابِ نو..... 1

ابھی ہوئی سوچ کا المیہ یہ ہے کہ وہ معاملات کو خلط ملط کر دیتی اور اپنی اپنی جگہ موجود حقیقتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر فکری انتشار پیدا کر دیتی ہے۔ انسان کو مخلوقات کا سردار بنانے اور خلافت کی قیام پیمانے کا مقصد اگر صرف ”علم ایشیا کی جہانگیری“ اور مادی ترقی کی معراج کمال تک پہنچانا ہوتا تو سیرت و کردار کو مخصوص سانچوں میں ڈھالنے اور نفسِ جذبوں کو پر دان چڑھانے والی الہامی تعلیمات کی ضرورت نہ ہوتی۔ انسان کی تہذیبِ نفس کے لئے پیغمبروں کے بجائے سائنسدان نازل ہوتے اور انسان کو کمالِ انسانیت کا درس دینے والی کتابوں کے بجائے فزکس اور کیمسٹری کے فارمولے لھیفوں کی شکل میں اتارے جاتے۔ یہ بحث ہی بیکار ہے کہ جذبوں کی آج کی زندگی کے فارمولے یا خالص مادی علوم سے استفادہ کر کے ترقی و خوشحالی سے لولگانا چاہئے۔ ہمارے مسلک کے مطابق عشق و جنون اور علم و حکمت میں کوئی تضاد نہیں۔ کسی ایک کی جستجو میں دوسرے سے دستبردار ہونے کا تصور ہی بے معنی ہے۔ نبی آخر الزمان ﷺ کا کوئی امتی علم کا منکر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ہر مرد اور ہر عورت پر نماز، روزے کی طرح لازم قرار دیا جانے والا فریضہ ہے۔ جہالتِ اسلام کی ضد ہے۔ حکمت کے سوتے خشک ہو جائیں اور تحقیق و جستجو کی لگن مر جائے تو قوموں کا سفر کٹھن ہو جاتا ہے۔ کوئی ذی ہوش پاکستانی اس حقیقت سے منکر نہیں کہ ہماری درس گاہیں آباد اور ہمارے دانش کدے شاداب رہنے چاہئیں۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں بھولنا چاہتا کہ۔

علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

مسئلہ یہ ہے کہ محض مادی علم، آسودگی اور ایسی خوشحالی تو ضرور عطا کر دیتا ہے جو زندگی کو پر آسائش بنا دیتی اور بہت سی پریشانیوں سے نجات دلا دیتی ہے لیکن اس مادیت کی کوکھ سے ایک ایسی بے مہارت تہذیب اور بے لگام معاشرت جنم لیتی ہے جو براہِ راست انسانیت کی ان قدروں

سے نگرانی ہے جن کا درس نہ صرف اسلام بلکہ تمام الہامی مذاہب دیتے ہیں۔ یہی وہ نازک مقام ہے جہاں علم و حکمت کے ساتھ ساتھ روحانی دانش اور اخلاقی تربیت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو آدمی کو ایک مشین کے بجائے انسان بناتی ہے۔ یہی انسان بیک وقت دنیا کے علوم اور دولت ایمان و یقین سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ایمان کی حرارت کسی کمپیوٹر کی ”ویب سائٹ“ سے نہیں، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنے نظریے اور اپنے عقیدے کی پختگی سے ملتی ہے اور یہ سارے اجزا ان ماؤں کی آغوش سے حاصل ہوتے ہیں جو صدیوں کی میراث آنے والی نسلوں کو منتقل کرتی رہتی ہیں۔ عصر حاضر کے علوم پر دسترس حاصل کرنے والے شاعر مشرق نے اپنے روحانی مرشد پیر رومی سے پوچھا تھا۔

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

تو پیر رومی نے جواب دیا تھا۔

دست ہر نااہل بیمار کند
سوئے مادر آکہ تمارت کند

(ہر نااہل کا ہاتھ تجھے صرف بیمار ہی کرے گا۔ اپنی ماں کی آغوش کی طرف واپس آ کر وہی تیری تیمارداری کر سکتی ہے۔)

ایک مخصوص لمحہ، ہر فرد اور قوم کی ترجیحات کا تعین کرتا ہے۔ جب ایک مفلس گھرانہ فاقہ کشی کے ہاتھوں موت کی دہلیز پر کھڑا ہوتا ہے تو وہ ”چائلڈ لیبر“ کے ضابطوں کو خاطر میں لائے بغیر اپنے نوخیز بچوں کو مزدوری کے لئے بھیج دیتا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم کی کیا اہمیت ہے اور پڑھ لکھ کر بابو بننے کی کیا برکتیں ہیں۔ جب کوئی قوم دنیا کی سپر پاور کے قہر و غضب کا شکار ہو اور حیات و موت کی فیصلہ کن جنگ لڑی جا رہی ہو تو مدرسوں کے گھن میں ”لب پہ آتی ہے دعا بن کے.....“ نہیں گایا جاسکتا۔ شب تاریک گہری ہو جائے تو سورج تراشنے کے لئے قربانیوں کی تاریخ رقم کرنا ہوتی ہے۔ ابھی کل کی بات ہے۔ ماؤزے تنگ کے لاگت مارچ کی آغوش سے ایک زندہ، بیدار اور متحرک چین نے جنم لیا۔ اس حیات نو کے پورے ایک عشرے میں درس گاہوں کو تالے لگانا پڑے۔ جب ہوچی منہ ویت نام میں امریکی عفریت کے ساتھ آزادی کا معرکہ لڑا رہا

تھا تو کتابیں الماریوں میں بند کر دی گئی تھیں۔ قائد اعظم کی قیادت میں لڑی جانے والی جنگ آزادی کا ہر اول دستہ وہ نوجوان تھے جو علم کی گھڑیاں گھروں میں چھوڑ کر میدان میں نکل آئے تھے۔ ایران میں امام خمینی عہد نو کی لکار بن کر نمودار ہو رہے تھے تو عصر حاضر کے علوم سے آراستہ ایران، سرخ قالین کی طرح ان کے قدموں میں بچھا جا رہا تھا۔

ہمارے کچھ اور مسئلے بھی ہیں۔ علم کا تمنائی ہونے کے باوجود ہماری تہذیب کنواری ماؤں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ سائنس کا شیدائی ہونے کے باوجود ہم نامعلوم باپوں والے بچوں کی یلغار کا تحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم برہنگی اور جنسی بے راہروی کو اپنی منزل نہیں بنا سکتے۔ ہم زمانے بھر کے علوم پر دسترس حاصل کرنے کے باوجود اپنے جذبوں، اپنے احساسات، اپنے ضمیر، اپنے یقین، اپنے ایمان، اپنے نظریے اور اپنی تاریخ سے دستکش نہیں ہو سکتے۔ ہم محمد عربی ﷺ کے اس فرمان کو پس پشت نہیں ڈال سکتے کہ ”جنت تلواروں کی چھاؤں تلے ہے“ سائنس اور ٹیکنالوجی کے باوجود ہم بدرو حنین کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔

طالبان، کابل کے چوراہوں میں سنگسار ہو رہے ہیں۔ اوباشوں کے غلیظ ہاتھ سنت رسول نوج رہے ہیں۔ ظلم کی اندھی آندھی چلی آرہی ہے اور کچھ لوگ سکولوں کی گھنٹیاں بجا رہے ہیں۔ اٹلتے نقابوں، خون آلود عماموں، کترتی ڈاڑھیوں، موسیقی کی تانوں اور ناگلوں سے لپٹی جینز کو انقلاب نو کا دیباچہ سمجھ رہے ہیں۔

انہیں کیا خبر کہ تاریخ کس طرح بنتی اور زمانے کی لوح پر نقش ہو جانے والے انسان کس بھی میں تیار ہوتے ہیں۔

[16-11-2001]

انقلابِ نو..... (2)

مسئلہ نہ طالبان اور امریکہ کا ہے، نہ تشددانہ قانون لاگو کرنے والے ”آسیب“ اور انسانی حقوق کی علمبردار سپر پاور کا۔ مسئلہ تو صرف اس قدر ہے کہ اپنے ڈھب سے جینے کی خواہش رکھنے والی ایک قوم کو ایک ایسی سپر پاور نے دیوبچ لیا ہے جو شرق و غرب کو اپنی جاگیر سمجھتی ہے۔ وجہ یہ نہیں کہ علم سے محرومی کے باعث طالبان کسی سفاک کاتر نوالہ بن گئے ہیں۔ دنیا کے کئی دوسرے خطوں میں جابرانہ ضابطے بھی ہیں اور بنیادی انسانی حقوق کی شرمناک پامالی بھی۔ وجہ یہ بھی نہیں کہ طالبان نے کسی معقول شہادت اور ثبوت کے بغیر ایک مہمان عزیز کو گھر سے نکال کر ایک فرعونی قوت کے قدموں میں نہیں ڈالا۔ وجہ صرف یہ ہے کہ کمیونزم کی شکست کے بعد اسلام کو سب سے بڑا خطرہ قرار دینے اور تہذیبوں کے فیصلہ کن تصادم کی تیوری پیش کرنے والوں نے تازہ کروسیڈ کا آغاز ایک ایسی قوم سے کیا ہے جو فاقہ کش ہونے کے باوجود موت سے نہیں ڈرتی اور جس نے ہزار کوتا ہیوں کے باوجود ”روح محمد“ کو سینوں میں بسا رکھا ہے۔ ابلیس نے اپنے پیر و کاروں سے کہا تھا۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
مٹا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو

آج مغرب، ابلیس کی اس تلقین کو عملی جامہ پہنا رہا ہے جس کی نشاندہی علامہ اقبال نے پونہ صدی پہلے کی تھی۔

سوال یہ بھی ہے کہ کیا علم کی ساری منزلیں سر کر لینے کے باوجود کوئی قوم ایسا فولادی قلعہ تعمیر کر سکتی ہے جو اسے ہر خطرے سے محفوظ کر دے اور جس کے باعث اس کی ہوائیں سارے ناسازگار

موسموں کا راستہ روک لیں؟

پاکستان نے انتہائی کٹھن حالات میں ایک دفاعی قلعہ تعمیر کیا اور اپنا ایٹمی پروگرام پروان چڑھایا۔ آج اس کا شمار دنیا کے دوسو کے لگ بھگ ملکوں میں سے ان سات ملکوں میں ہوتا ہے جو ایٹمی قوت بن چکے ہیں لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کی اس معراج کو پالینے کے باوجود اس کی خانہ ویرانی کا عالم سب کے سامنے ہے۔ کولن پاول کی ایک دھمکی علم سے محروم خاک نشینوں کے حوصلے تو پست نہ کر سکی لیکن ایک ایٹمی قوت کے اعصاب مفلوج کر گئی۔ اگر آسودگی، سکون، اطمینان، احساس تحفظ اور عزت و عظمت کا سورج ”علم“ کے افق سے طلوع ہوتا ہے تو پھر وقت کا ”جید ترین عالم“ اور ٹیکنالوجی کا ”شہنشاہ معظم“ ان ساری نعمتوں سے کیوں محروم ہے؟ اس کے عوام خوف کی صلیب پر کیوں لٹکے ہوئے ہیں؟ امریکہ کتنا ہی معتبر کیوں نہ بنے، دنیا بھر کے لوگوں سے پوچھا جائے تو سب سے زیادہ نفرتیں اسی کے حصے میں آئیں گی۔ ہواؤں کو مٹھی میں لینے اور فضاؤں میں تیرتے میزائلوں کا گلا گھونٹ دینے کی صلاحیت حاصل کر لینے کے باوجود وہ اپنے دفاعی اور عسکری مراکز میں مسافر بردار طیاروں کی ضرب سے کیوں نہیں بچا سکا؟ کیا یہ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں کہ ”مجرور جذبے“ ٹیکنالوجی سے کہیں زیادہ قوی ہوتے اور ایسی قوتوں کی کلفتی بھی جھکا دیتے ہیں جن کے گودام ایٹمی اسلحوں سے لہلہا بھرے ہوں۔ علم کی فراوانی تو کوفہ و بغداد جیسے علمی مراکز کو بھی اجڑاتا ریوں کی دستبرد سے نہیں بچا سکتی تھی۔ افغانستان کی جنگ بھی علم اور جہالت کی کشمکش نہیں۔ ایسا سوچنا بہت بڑا فکری مغالطہ ہے۔ یہ اپنی غیرت کے تحفظ کی جنگ ہے۔ جب ایک مسلح ڈاکو کسی گھر میں گھس آئے، گھر کے مالک کے پاس بندوق تو موجود ہو لیکن وہ کم علمی، کے باعث بندوق چلاتا نہ جانتا ہو، ڈاکو اس کے مال و اسباب کے بعد اس کی جواں سال بیٹی کی طرف بھی ہاتھ بڑھائے تو گھر کا مالک یہ سوچ کر نہیں بیٹھ جائے گا کہ اگلے سال وہ بندوق چلانے کی تربیت حاصل کر کے ڈاکو سے نمٹ لے گا۔ وہ کند چھری یا پھرا اپنے ناخنوں کے ساتھ ڈاکو پر جھپٹے گا چاہے اس کا سینہ چھلنی ہو جائے۔ ایسی گھڑی میں اس کا مر جانا ہی اس کی زندگی ہے۔ جس طرح دنیا کا بڑا حصہ امریکی پالیسیوں کا نفاذ ہے اسی طرح طالبان کے فہم اسلام اور ان کے حکمت عملی سے اختلاف رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن اس کا کیا جواز ہے کہ ایک سامراجی قوت سات سمندر پار سے آ کر افغانستان کو راکھ کا ڈھیر بنا دے۔ یہ کسی بھی محبت وطن قوم کی غیرت کا سوال

ہے اور غیرت ڈپلوموں اور ڈگریوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ جب ظلم اور جبر کی قوتوں کا ہاتھ گریبان تک آپہنچے تو پھر صرف ایک ہی سند کام آتی ہے ”عزت کی موت۔“

اگر ”وقتِ قیام“ سجدوں میں گر جانے کی تلقین کرنے والوں کی منطق مان لی جائے تو ساری تاریخ نئے سرے سے لکھنا پڑے گی۔ نیچو سلطان کی جراتِ رندانہ کو حماقت کا نام دینا پڑے گا۔ تاجِ برطانیہ سے پنجہ آزمائی کرنے والے ان مجاہدینِ آزادی کے ماتھوں پر سیاہی پھیرنا ہوگی جو 1857ء میں درس گا ہوں میں سبق پڑھنے یا درس دینے کے بجائے پھانسیوں پر جھول گئے۔ بالا کوٹ کے شہیدوں کی کم حکمتی کا ماتم کرنا ہوگا اور ان تمام افراد کے سینوں پر سچے تمنغے واپس لینا ہوں گے جو برطانوی سامراج کے جاہ و جلال کی پرواہ کئے بغیر اس سے ٹکرا گئے۔ بظاہر یہ ساری قربانیاں بے ثمر گئیں لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ 14 اگست 1947ء کو طلوع ہونے والی سحر کے چہرے میں ان لاکھوں ستاروں کا خون بھی دمک رہا تھا جو ایک سورج کی جستجو میں اندھیروں کا رزق بن گئے۔ افغان جہاد ”بے ثمر“ ہونے کے باوجود وسط ایشیا اور مشرقی یورپ کی زنجیریں کاٹ گیا اور سامراج کے خلاف سینہ سپرہ تحریکوں کو دلولہ تازہ دے گیا۔

سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کی قوتِ تسخیر کا محض ایک پہلو ہے۔ اس کی حقیقی عظمت و سربلندی اس کی غیرت و حمیت، اس کے عزمِ راسخ، اس کے نظریے، اس کے ایمان اور اس کے یقین میں ہے۔ اگر اس کا سینہ بے سوز ہے اور وہ محض زندہ رہنے کی خاطر اپنی غیرت کا سودا کر لیتا ہے تو باقی ساری عمر اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرنا اس کا مقدر بن جاتا ہے۔

طالبان کو سفاک، دہشت گرد، آسیب یا کسی بھی نام سے پکار لیں، کوئی سی من پسند گالی دے لیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ قافلہ حجاز کی تاریخ کا تسلسل ہیں۔ ان کے خون کی لیکر کا سرا صدیوں پیچھے تک چلا جاتا ہے۔ ایسے مقتل تجتے رہتے ہیں۔ تجتے رہنے چاہئیں کہ ان کے بغیر کائنات درندوں کی شکار گاہ بن جاتی ہے۔ شکار گاہ تو وہ دوسری صورت میں بھی بن جاتی ہے لیکن سرفروشوں کا لہو، درندگی کو معتبر اور محترم نہیں ہونے دیتا۔ انڈس سے سرنگا پٹم اور کربلا سے قندھار تک پھیلی قتل گاہوں کی ریت اور سلگتے خیموں کی راکھ ہی تاریخ کی مانگ کا سینہ درد اور انقلاب نو کی پیشانی کا نور بنتی ہے۔

انقلاب: حیا باختہ آنکھوں، تیز دھارا ستروں اور جینز چھمی ٹانگوں سے نہیں پھوٹا کرتے۔

[17-11-2001]

ملا عمر کا 'آسیب'

اگر یہ تہذیبوں کا تصادم نہیں تو چھ ہفتوں سے جاری بموں کی برسات کے بعد "نئی صبح" طلوع ہوتے ہی سارے کیمرے، سارے ٹی وی لینز، سارے مغربی رپورٹر اور سارے مبصر بے نقاب عورتوں اور بے ریش مردوں کی تلاش میں کیوں نکل کھڑے ہوئے ہیں؟ امریکہ نے تو کبھی نہیں کہا کہ اس کی قیادت میں قائم ہونے والی کولیشن کا مقصد افغان عورتوں کو بے حجاب اور مردوں کو بے ریش کرنا ہے۔ تو پھر سارا عالمی میڈیا موسیقی کی دکانوں اور بار برشاپس کے باہر کیوں جمع ہو گیا ہے؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اصل معرکہ دو تہذیبوں ہی کا ہے؟ عریاں، حیا سے عاری جنس زدہ اور بے مہار تہذیب کی اصل فتح کابل، مزار شریف، ہرات اور قندھار کے شہر نہیں، گنتی کے چند نقاب اور تھوڑی سی ڈاڑھیاں ہیں۔ مٹھی بھر خوفزدہ لوگوں یا خود شمالی اتحاد کے سوراؤں نے ڈاڑھیاں منڈوا ڈالیں اور لاکھوں کی آبادی میں سے درجن بھر عورتیں برقعوں کے بوجھ سے آزاد ہو گئیں تو ایک طوفان اٹھایا گیا کہ افغانستان کے عوام کو آزادی مل گئی۔ جو کھنڈرے بچے ٹیلی ویژن کیمروں اور بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کا تماشا دیکھنے جمع ہو گئے، ان کے منچلے پن اور اچھل کود کو، اظہار مسرت کرتے استقبالیہ جوموں کا نام دے دیا گیا۔ ادھر ہمارے دانشوروں نے مغرب کی لے میں اپنی آواز شامل کرتے ہوئے کہا کہ "افغانستان کو بربریت کے آسیب سے نجات مل گئی ہے۔"

افغانستان میں کام کرنے والی ایک این جی او کی رکن خواتین کو بھی "بربریت کے آسیب" سے نجات مل گئی ہے۔ امریکہ نے اسے اپنے کمانڈوز کی ڈرامائی کارروائی قرار دیا ہے لیکن واقفان حال جانتے ہیں کہ سارا معاملہ صدر معمر قذافی کے بیٹے سیف القذافی نے طے کر لیا۔ طالبان نے ایک معاہدے کے تحت زیر حراست ورکرز کو محفوظ ہاتھوں میں منتقل کیا۔ شلٹر ناؤ نامی تنظیم کی رکن خاتون لقر مرمر نے دوسری ساتھی خاتون (جس کا تعلق امریکہ سے ہے) ڈایانا کورے کے ہمراہ

اسلام آباد میں ایک پریس کانفرنس کے دوران صحافیوں کو بتایا کہ ”طالبان نے ہمارے ساتھ بہترین سلوک کیا۔ وہ ہمیں نہیں کہہ کر بلاتے تھے اور ان کا رویہ بھی بالکل بھائیوں جیسا تھا۔ پورے عرصے میں ہمارے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی۔ ہمیں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کی مکمل آزادی تھی۔ ہمیں بہت زیادہ عزت دی گئی اور ہمارا احترام کیا گیا۔ ہمیں ٹھیک وقت پر کھانا ملتا تھا۔ ہمارے کپڑے دھونے اور ہمارے لئے کھانا تیار کرنے کے لئے ہمیں ملازم فراہم کئے گئے تھے۔ ہم چاہیں تو خود بھی کھانا بنا لیتے تھے۔“

یہ ہے اس ’آسیب‘ کا طرز عمل جس نے پچھلے چھ سالوں سے افغانستان کو امن کا مثالی گہوارہ بنا رکھا تھا۔ جرائم کی بیخ کنی کر دی تھی اور بڑی محنت کے ساتھ افغانستان کو وحدت و مرکزیت سے آشنا کیا تھا۔ طالبان کے بارے میں کئی کہانیاں تراشی گئیں۔ اور آج بھی پراپیگنڈے کا ایک طوفان برپا ہے لیکن طالبان کے نظم و نسق کو قریب سے دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان کے افغانستان میں نا انسانی کا تصور بھی محال تھا۔ کوئی شخص کسی بھی نوع کا اثر و رسوخ استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ دن یارات کے کسی لمحے میں راہ چلتی خاتون کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ آج ان طالبان کا نام ”آسیب“ ہے۔ وہ دنیا بھر کے روشن خیالوں کی ملامت کا نشانہ ہیں اور ان کی جگہ اقتدار کی مسند پر بٹھائے جانے والے اوباش ٹولے کے بارے میں عالمی میڈیا خاموش ہے۔

مزار شریف پر قبضے کے بعد جنرل رشید دو ستم کی ضیافت طبع کے لئے سینکڑوں افراد کو ٹینکوں تلے روند گیا۔ وہ چھٹی ہڈیوں اور انسانی چیخوں کی موسیقی سے لطف اندوز ہوتا اور فلک شکاف قہقہے لگا تا رہا۔ سڑکوں پر انسانی قیمہ اور درو دیوار سے چپکے لو تھڑے دیکھنا اس کا دل پسند مشغلہ ہے۔ شہرہ آفاق کتاب ”طالبان“ کے مصنف احمد رشید کا کہنا ہے کہ ”وہ بلا کا ظالم اور جفا جو ہے۔ اسے اکیسویں صدی کا ”روہیلہ“ بھی کہا جاسکتا ہے۔“ بے پناہ دولت کی ہوس، شراب کے جام لہنڈھانا، عمریاں رقص اور جنسی درندگی اس کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔ ایک ظالم نگار دوست نے معروف اخبار نویس رپرٹ ایڈس کا حوالہ دیا ہے جو دو ستم کا قریبی دوست رہا۔ رپرٹ ایڈس برطانوی اخبار ”ڈیلی ٹیلی گراف“ میں لکھتا ہے کہ ”میں 1997ء میں پہلی مرتبہ رشید دو ستم سے اس وقت ملا جب باقی افغانستان پر طالبان قابض ہو چکے تھے لیکن دو ستم نے مزار شریف کو اپنی مرضی کی

جنت بنا رکھا تھا۔ اس کی خوبصورت رہائش گاہ فرانس سے درآمد کئے گئے کھانے کے برتنوں اور سکاٹ لینڈ سے منگوائی گئی بڑھیا شراب سے تھی تھی۔ اس کے خوبصورت باغوں میں مورنا چتے تھے اور اس کی راتیں خوبصورت رقاصاؤں سے آباد ہوتی تھیں۔ اس کے زیر انتظام علاقے میں روس کی بنی واڈ کا شراب بکثرت اور ہمہ وقت دستیاب رہتی تھی۔“

اور جب ہم لوگ ملا عمر سے ملے قذحار گئے تھے تو گورنر رحمانی نے، عشاء کی نماز پڑھانے کے بعد، خود اپنے ہاتھوں موٹے چاولوں کا تھال ہمارے سامنے رکھتے ہوئے بڑی عاجزی سے کہا تھا۔ ”آپ لوگ اتنی دور سے آئے ہیں۔ ہم اپنا سب کچھ آپ کے سامنے ڈھیر کر دینا چاہتے ہیں لیکن کیسی بے سرو سامانی ہے کہ آپ کی خدمت میں ڈھنگ کا کھانا بھی پیش نہیں کر سکتے۔“ میں نے پلٹ کر ملا رحمانی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔

آج طالبان کا افغانستان، شمالی اتحاد کا افغانستان بن چکا ہے۔ کچھ لوگ خوش ہیں کہ افغانی آزاد ہو گئے۔ اب برقعے اٹھیں گے۔ ڈاڑھیاں ناپود ہوں گی۔ کابل اور ہرات کے بازاروں میں میکڈے آباد ہوں گے۔ کھلے گھیز والی بھاری شلواروں کی جگہ جینز کی چست پتلونوں کا چلن عام ہوگا۔ ایک تہذیب مرجائے گی۔ دوسری تہذیب کا جادو سرچڑھ کر بولے گا۔ فاقہ مست ملا عمر کا دورِ خصت ہو گیا اور بد مست دو ستم کا ”عہدِ نو بہار“ شروع ہو چکا ہے۔

اپنی عارضی کامیابی پر پھولے نہ سمانے والوں کو خبر نہیں کہ جب کسی شہنشاہ عالی مقام کا ”ایران“ تہذیب نو کی شرمناک تماشا گاہ بن جائے تو تہران کے افق پر ایک خمینی نمودار ہوا کرتا ہے جو آن واحد میں من زور درہاروں کا رخ مغرب سے مشرق کی طرف پھیر دیتا ہے۔ سخت جاں آسب مرانہیں کرتے، پھیس اور ٹھکانے بدل لیتے ہیں۔

[18-11-2001]

مفلس کی قبا

افغانستان کے عوام کو ”بیرونی مداخلت کے بغیر آزادانہ مرضی سے“ اپنی حکومت قائم کرنے کا موقع فراہم کرنے کیلئے پوری دنیا سرگرم عمل ہے۔ اس عظیم مقصد کیلئے ایک طویل عرصے سے جدوجہد کی جا رہی تھی۔ بیرونی مداخلت سے آزادی یقینی بنانے کے لئے 17 اکتوبر سے شروع ہونے والی شدید ترین بمباری کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اس مقصد جلیلہ کیلئے ایک سو برطانوی فوجی اس طرح بگرام کے ہوائی اڈے پر قابض ہو گئے کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ امریکی ٹروپس بھی افغانستان میں موجود ہیں تاکہ کسی جمہوریت کش گروہ کو بیرونی مداخلت سے آزادی کے مشن پر ضرب لگانے کی جرات نہ ہو۔ اقوام متحدہ بھی پوری طرح فعال ہے اور اس کا نمائندہ فرانس وینڈرل بیرونی مداخلت کا راستہ روکنے کا بل پہنچ چکا ہے۔ امریکی صدر جارج بش اور روسی صدر پیوٹن شطرنج کی بساط بچھائے مسلسل اس سوچ میں غرق ہیں کہ آزاد افغانوں کی آزادانہ مرضی پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ ایران اور روس میں بھی اس مقدس مقصد کے لئے مسلسل رابطہ قائم ہے۔ بھارت بھی اس امر کو یقینی بنانے کے لئے سرگرم عمل ہے کہ افغانیوں کے آزادانہ حق خود ارادیت پر کوئی ہلکی سی خراش بھی نہ آنے پائے۔ پشاور میں بھی اس کا رخیر کے لئے پیہم مشورے جاری ہیں اور جن کیلئے مہذب دنیا یہ سارے پاڑ پٹیل رہی ہے وہ آگ اور بارود کے سیل بے پناہ کی زد میں ہیں۔ ان کے کئے چٹھے اعضا چیل کوئے نوج رہے ہیں۔ بے گور و کفن لاشیں ہر طرف بکھری ہیں۔ معصوم بچے تک امریکی بموں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ بستیاں پیوند زمین ہو رہی ہیں۔ لاکھوں افراد اپنا گھر بار چھوڑ کر پناہ گاہوں کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں تاہم انہیں بیرونی مداخلت سے آزاد کرنے کی کوششوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔

ایک طبقہ مطمئن ہے کہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہلاکت آفرینی اور افغانستان میں غیر ملکی فوجوں کی موجودگی نے اب ہر قسم کی بیرونی مداخلت کا راستہ روک دیا ہے اور آزادانہ مرضی

کے جمہوری منظر دیکھنے میں آرہے ہیں۔ طالبان کے دور میں 90 فیصد سے زائد افغانستان پر ایک مضبوط اور مستحکم حکومت قائم تھی لیکن آزادانہ مرضی کی کارفرمائی کے ساتھ ہی مرکزیت کے تختے ادھڑنا شروع ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے افغانستان ٹکڑوں میں تقسیم ہونے لگا۔ دو ترم مزار شریف کا مختار گل، کریم خلیلی بامیان اور ہزارہ جات کا فرمانروا حاجی عبدالقدیر ننگر ہار کا تاجدار اسماعیل ہرات کا بادشاہ اور فہیم کابل کا شہنشاہ گل آغا اور حامد کرزی قندھار پر نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔ ان سلطنتوں کے اندر بھی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو رہی ہیں۔ ہر سطح کے کمانڈر اپنی حیثیت اور توفیق کے مطابق اپنا حصہ مانگ یا چھین رہے ہیں اور برہان الدین ربانی اپنے سر پر صدارت کی دستار سجائے کابل میں براجمان ہیں۔

امریکی کولیشن کالے پالک فرزند شمالی اتحاد پر پزے نکال رہا ہے۔ قرآن بتاتے ہیں کہ کابل میں داخل ہوتے ہوئے اسے امریکہ اور روس کی بھرپور سرپرستی حاصل تھی۔ امریکی اخبار ورلڈ نیٹ ڈیلی نے لکھا ہے کہ ”امریکی صدر کو شمالی اتحاد کی ہر حرکت کا پہلے سے علم تھا اور وہ جارج بش کی اجازت سے کابل میں داخل ہوا۔ امریکی منصوبہ سازوں کے پلان کے مطابق شمالی اتحاد کو اکتوبر 2002ء میں کابل کا قبضہ ملنا تھا لیکن 7 نومبر کو صدر پیوٹن نے فون پر صدر بش سے بات کی اور انہیں بتایا کہ شمالی اتحاد اس وقت مزار شریف پر قبضے کی پوزیشن میں ہے۔ مزار شریف پر قبضے کے بعد کابل دو دنوں کی مار ہوگا۔ صدر بش نے فوری منظوری دے دی۔ امریکی اخبار کی اس رپورٹ کے یہ معنی ہیں کہ جس وقت جارج بش صدر مشرف کو یقین دہانی کر رہے تھے کہ شمالی اتحاد کو کابل میں واک اور نہیں دیا جائے گا اس وقت سب کچھ طے پاچکا تھا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ 1996ء میں کابل سے بے دخل ہونے والی احمد شاہ مسعود کی سپاہ، ایک بار پھر کابل پر قبضہ جمالینے کے بعد کسی دوسرے دھڑے کو معقول حصہ دینے پر آمادہ نہیں۔ جنرل فہیم کی خود سری کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اس کی رگوں میں کے جی بی کی زہر ناک اور خاد کا فساد بھرا ہے۔ مسعود کی زندگی میں بھی وہ اہم ترین کمانڈر تھا اور آج وہ جائز وارث کے طور پر جمعیت اسلامی کا بازوئے شمشیر زن ہے۔ دو ترم اور فہیم کے درمیان فاصلے صرف ازبک اور تاجک ہونے کے ناطے نہیں، یہ دو مختار کمانڈروں اور متضاد مفادات رکھنے والی شخصیات کا تصادم ہے۔ دو ترم جمعیت کی حکومت کو ماننے پر آمادہ نہیں۔ کریم خلیلی کی حزب وحدت نے طالبان کے

خلاف موثر جدوجہد کی۔ وہ صرف بامیان اور ہزارہ جات پر قیامت کرنے پر تیار نہیں۔ اس کی فوج کا بل کی دہلیز تک آن پہنچی ہے۔ کریم خلیل کا کہنا ہے کہ میں اپنی سپاہ باہر چھوڑ کر بیدل کا بل کے اندر جاؤں گا اور ربانی سے دو ٹوک بات کروں گا کہ ہمارا جائز حصہ ہمیں ملنا چاہیے۔ ادھر بگرام کے ہوئی اڈے پر برطانوی قبضہ کسی کو پسند نہیں آ رہا۔ شمالی اتحاد نے وارننگ دی ہے کہ چدرہ کے سوا سب برطانوی فوجی فوراً واپس چلے جائیں۔ عبداللہ کا کہنا ہے کہ ”کا بل آزاد ہو چکا“ وہاں ایک انتظامیہ موجود ہے۔ کسی بیرونی فوج کی موجودگی بہت بڑی غلطی ہوگی۔ اقوام متحدہ اور جمعیت اسلامی ایک دوسرے پر تاخیری ہتھکنڈوں کا الزام لگا رہے ہیں۔ فتح مند لوگوں کو ڈور کا کوئی سرا نہیں مل رہا۔ طالبان کا سینہ چھلنی کرنے والی توپوں کے دھانوں سے نکلنے والا دھواں ابھی ختم نہیں ہوا کہ ان کے رخ ایک دوسرے کی طرف پھر گئے ہیں۔

جان لیجئے کہ کسی نمائندہ مرکزی حکومت کے تحت متحدہ مضبوط، مستحکم اور پرامن افغانستان اتنا ہی دور چلا گیا ہے جتنا دس سال قبل روسی فوجوں کی رخصتی کے وقت تھا۔ اس وقت امریکہ نے جنرل ضیاء الحق کے عزائم کی پیٹھ میں جینووا معاہدے کا فخر گھونپ دیا تھا اور آج جنرل مشرف کی توقعات کو سبوتاژ کرنے کے لئے اس دوشنبے، پلان پر عمل ہو رہا ہے۔ جو بیرونی مداخلت کاروں نے تیار کر رکھا ہے۔

افغانستان ”بیرونی مداخلت کے خاتمے“ کی آڑ میں آنے والے کئی سالوں تک ہمہ جہت اور ہمہ رنگ بیرونی مداخلت کا اکھاڑہ بنا رہے گا۔ مفلس کی قبا میں درد کے پیوند لگتے رہیں گے اور ہم بے چارگی کے زخم چاٹتے، رنگارنگ تاویلوں کے ذریعے اپنے آپ کو فریب دیتے رہیں گے۔

[19-11-2001]

عروج

وزیر خارجہ عبدالستار نے بتایا ہے کہ افغانستان پر طالبان کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔ طالبان کی حکومت کے خاتمے کی خبر اٹلی کے وزیر خارجہ نے بھی دی ہے جنہوں نے دنیا کو بتایا ہے کہ پاکستان سے کابل کے لئے روانہ ہونے والے چار صحافی جلال آباد سے کوئی ستر کلومیٹر دور، سروبی کے نواح میں قتل کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں اٹلی، فرانس اور آسٹریلیا کے تین صحافیوں کے علاوہ ایک پشتون فوٹو گرافر عزیز اللہ حیدری بھی شامل ہیں۔ یہ صحافی دو گاڑیوں میں جلال آباد سے کابل کے لیے روانہ ہوئے۔ جب ان کا مختصر سا قافلہ سروبی کے قریب پہنچا تو اچانک مسلح افراد کا ایک غول برآمد ہوا۔ اس نے چاروں صحافیوں کا سامان لوٹا۔ ان کی جیبیں خالی کیں اور پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی خفیہ مقام پر لے گئے جہاں ہر ایک کو باری باری گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔

اس خبر سے دنیا کو یقین ہو جانا چاہئے کہ اب واقعی طالبان کی حکومت ختم ہو چکی ہے اور انصاف بھرموں کی دہلیز تک پہنچانے کی جس امر کی مہم کا آغاز ہوا تھا، اس کے مظاہرے افغانستان میں ہر طرف دکھائی دینے لگے ہیں۔ اقوام متحدہ نے بتایا ہے کہ کابل اور مزار شریف بدترین غنڈہ گردی کی زد میں ہیں۔ دکانیں، بنک، خوراک کے ذخائر، گیسٹ ہاؤس، دفاتر، گاڑیاں اور لوگوں کی ذاتی املاک لوٹی جا رہی ہیں۔ جنگی قیدیوں کے کان، ناک، زبانیں اور دیگر اعضا کاٹے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں سلانیاں پھیری جا رہی ہیں۔ ان کے منہ میں کلاشکوفوں کی نالیاں رکھ کر برسٹ مارے جا رہے ہیں۔ چاروں طرف قیامت کا سماں ہے۔ بی بی سی کے برادر مراد لیس۔ بختیار نے جلال آباد سے واپس آ کر بتایا ہے کہ ”اب سڑکوں اور گلی محلوں میں مسلح افراد کی حکمرانی ہے۔“ جگہ جگہ چوکیاں بن گئی ہیں اور زنجیریں ڈال دی گئی ہیں۔ لوٹ مار کرنے والے اوباش لوگوں کے مسلح گروہ دندناتے پھر رہے ہیں۔ خوست کے علاقے میں بد امنی کا یہ عالم ہے کہ ہزاروں لوگ اپنی جانیں اور عزتیں بچانے کے لئے نقل مکانی کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ

اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے کافی ہے کہ طالبان کی حکومت ختم ہو چکی ہے۔

1995ء میں پانچ صوبوں غزنی، زابل، قندھار اور زارگان اور ہلمند کے والی، سابق گورنر شورائے عالی کے رکن اور سپیکر ملا محمد حسن نے مجھ سے باتیں کرتے ہوئے جب امن و امان کی صورتحال کا تذکرہ کیا تو ان کی روشن آنکھوں میں کتنے ہی دیئے جل اٹھے تھے۔ انہوں نے احساس تشکر سے لبریز لہجے میں کہا تھا۔ ”تم یہاں جب تک چاہو رہو۔ خوب گھوم پھر کر دیکھو۔ عام لوگوں سے ملو۔ تمہیں پتہ چلے گا کہ طالبان نے کس طرح اپنی ماتحت دلاستوں کو امن کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ اب تک (اگست 95ء) پندرہ ولایتیں ہمارے کنٹرول میں ہیں۔ ایک سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود ان پندرہ صوبوں میں پندرہ افراد بھی قتل نہیں ہوئے۔ ڈکیتی، چوری، اغوا اور لوٹ مار کی وارداتیں ختم ہو چکی ہیں۔ کوئی شخص رات کے کسی لمحے سونا اچھالتا ہوا میلوں چلا جائے، کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ کچھ دن قبل میرا گزر ضلع ارغندہ میں واقع ”تیز جاگیر“ کے جنگلات سے ہوا۔ ان میں کئی چھوٹی بڑی بستیاں ہیں۔ یہ عشاء کے بعد کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ پانچ خواتین کسی مرد کے بغیر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا رہی ہیں۔ میں نے وہیں سجدہ کیا اور اللہ کے حضور شکرانے کے نوافل پڑھے۔ میں ایسے مقام کا ذکر کر رہا ہوں جہاں، طالبان سے قبل، لوگ دن کے وقت بھی پچاس ساٹھ کا قافلہ بنا کر چلتے تھے۔ یہ سب اللہ کے قانون کی برکت ہے۔ آج ہماری مائیں، بیٹیاں اور بہنیں ہمیں دعاؤں کی سوغات بھیجتی ہیں کہ تم نے ہماری نیندیں لوٹا دی ہیں۔ ہم نے انسان کی بستیوں کو بھیڑیوں اور درندوں سے نجات دلا دی ہے۔ کوئی شخص اسلحہ نہیں رکھ سکتا۔ شادی بیاہ ہو، کسی کا استقبال ہو یا کوئی اور تقریب، بندوق کی ایک گولی بھی فائر نہیں کی جاسکتی۔ تم لوگ آئے ہو تو ضرور ان بستیوں کو دیکھو۔ لوگوں سے ملو۔ وہ جو کچھ کہیں اپنے وطن جا کر بتاؤ“

جب تک طالبان کی حکومت رہی، ارغندہ میں ”تیز جاگیر“ کے جنگل بھی محفوظ تھے اور اب جلال آباد سے کابل جانے والی مصروف ترین شاہراہ بھی لٹیروں، اچکوں اور قاتلوں کی دستبرد میں ہے۔ ”ٹیلر ناؤ“ کے آٹھ ورکرز کی کہانی سامنے آ چکی ہے۔ جو امریکہ شب دروز افغانستان پر تباہ کن میزائل اور ”ڈیزی کز“ بم گرا رہا تھا، اس امریکہ کی اسیر خواتین کو طالبان بہنیں اور بیٹیاں کہہ کر بلاتے اور اس وقت تک بھوکے رہتے تھے جب تک انہیں کھانا نہ مل جائے۔ اور آج اپنے پیشہ

ورانہ فرانس کی بجا آوری کے لئے کابل جانے والے صحافیوں کی چھلنی لاشیں امریکی کولیشن سے پوچھ رہی ہیں کہ کیا ہشت گردی کے خاتمے کا مطلب بھیڑیوں اور درندوں کی حکمرانی ہے؟ طالبان کی حکومت کے خاتمے کی تصدیق اس خبر سے بھی ہوتی ہے کہ کابل کا سب سے بڑا سینما گھر کھل گیا ہے۔ ساڑھے آٹھ سو افراد نے پہلی فلم ”عروج“ دیکھی ہے۔ ایک فلم سینما گھر کے باہر بھی بن رہی ہے۔ امریکی سکرپٹ شمالی اتحاد کی ہدایت کاری اور رنگارنگ وار لارڈز کی اداکاری کا شاہکار اس فلم کا مرکزی موضوع ہے، ”انصاف کی بالادستی، انسانیت کی سرفرازی اور انسانی حقوق کی سر بلندی“۔ بتایا جاتا ہے کہ کابل کے سینما گھر میں دکھائی جانے والی فلم، افغانستان میں بننے والی آخری فلم تھی۔ سینما گھر کے باہر مزار شریف، کابل، قندوز، جلال آباد اور قندھار تک ہر شہر، ہر قصبے، ہر کوچہ و بازار، ہر درو دیوانہ اور ہر واوی دکھار میں فلمائی جانے والی اس فلم کا نام بھی ”عروج“ ہے یہ اس صدی کی پہلی پیشکش ہے۔ اس کی عکس بندی کا آغاز افغانستان سے ہوا ہے۔ اگلے مناظر پاکستان، ایران، عراق، شام اور لیبیا وغیرہ میں فلمائے جائیں گے۔ کئی مرحلوں میں عکس بندی کی جانے والی یہ فلم کئی قسطوں میں دکھائی جائے گی اور اس وقت تک دکھائی جاتی رہے گی جب تک ساری دنیا کو معلوم نہیں ہو جاتا کہ ”عروج“ کسے کہتے ہیں؟

[21-11-2001]

”عالمی لوئی جرگہ“

بے یقینی کے موسم میں حساس اور علم سے عاری لوگوں کی نیندیں بے سبب اڑ جاتی اور دلوں میں دوسوں کا ایسا گھنا جنگل اگ آتا ہے کہ کوئی راستہ بھائی نہیں دیتا۔ زمینی حقیقتوں پر گہری نظر رکھنے والے عالم فاضل لوگوں کی فہرست اور سوانیزے پر کھڑے سورج سے شبنم کشید کرنے والے دانشوروں کی حکمت بھی امید و یقین کی جوت نہیں جگا سکتی۔ آج کل جہاں جائیں، جس محفل میں بیٹھیں، جس موضوع پر گفتگو کریں، بات گھوم پھر کر افغانستان اور پھر ڈیورنڈ لائن کی کڑی نگرانی کے باوجود پاکستان میں داخل ہو جاتی ہے۔ سوچنے والے ذہنوں میں عجیب طرح کی بے کلی ہے۔ ایک دوسرے سے جڑے کئی سوال ہیں۔ کیا گھنٹی داڑھیوں اور بھاری عماموں والی مخلوق نابود ہوگی تو ہندو کش سے دودھ اور شہد کے جھرنے پھوٹنے لگیں گے؟ کیا دودھ اور شہد کے جھرنوں سے اپنے مشکیزے بھرتی نمایاں ہماری سوکھی دھرتی کا رخ بھی کریں گی؟ کیا امریکی کولیشن کا ہر اول دستہ بننے کے ثمرات ہماری جھولی میں بھی پڑیں گے؟ کیا کشمیر کا دیرینہ مسئلہ کشمیری عوام کی خواہشات اور ہماری توقعات کے مطابق حل ہو جائے گا؟

دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کی حمایت کے جواز کے لئے جو چار عناصر ترتیب دیئے گئے ان میں کشمیر کا زون نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اب تک کی پیش رفت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ امریکہ نہ صرف دو ٹوک موقف اختیار کرنے سے گریزاں ہے بلکہ بھارتی خوشنودی کے خیال سے پاکستان کے موافق کوئی موثر کردار ادا کرنے پر بھی آمادہ نہیں۔ 11 ستمبر کے بعد سے پاکستان شعوری طور پر جہادی تحریکوں سے فاصلہ بڑھانے لگا ہے۔ جمیش محمد، الرشید ٹرسٹ، لشکر طیبہ اور رابطہ ٹرسٹ کے اکاؤنٹس منجمد کرنے میں ضرورت سے زیادہ عجلت کا مظاہرہ کیا گیا۔ امریکہ کے مطالبے کے باوجود لبنان، شام اور ایران سمیت متعدد اسلامی ممالک نے ”حزب اللہ“ کے کھاتے منجمد کرنے یا اس کے خلاف کسی بھی طرح کی کارروائی سے

انکار کر دیا ہے۔ ہم ایسا اس لئے نہیں کر سکتے کہ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم کا ایک مخلص اور سرگرم رکن کھلوانے کے لئے ہر حکم کی رضا کارانہ تعمیل ضروری ہے۔ یہ بات توجہ طلب ہے کہ موجودہ حالات کے تناظر میں کل جماعتی حریت کانفرنس بھی تھکی تھکی سی نظر آنے لگی ہے۔ طالبان کے خلاف ہماری پرجوش کارکردگی نے بھی مجاہدین کشمیر پر نفسیاتی اثرات ڈالے ہیں۔ بھارت اپنے آپ کو زیادہ مطمئن اور آسودہ خیال کرنے لگا ہے۔ وزیراعظم و اچپائی نے خود کہا ہے کہ ”سرحد پار سے مداخلت میں کمی آئی ہے۔“ گذشتہ دنوں بھارتی وزیر خارجہ جسونت سنگھ نے بھی ایک اخباری انٹرویو میں اپنے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:-

☆ ”دو ہفتوں سے کنٹرول لائن پر پاکستانی فوج کی سرگرمی میں کمی آئی ہے۔

☆ اس دوران فریقین کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ بھی کم ہوا ہے۔

☆ پاکستان کی طرف سے مجاہدین کو سرحد پار بھیجنے کے واقعات میں نمایاں کمی آئی ہے۔

☆ ان حالات میں ہم، کسی جارحانہ کارروائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔“

صدر پرویز مشرف کے دورہ نیویارک کے دوران بھی امریکی قیادت نے کشمیر کے بارے میں کسی حوصلہ افزا رد عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مشترکہ پریس کانفرنس میں صدر بٹش سے کشمیر کے بارے میں متعین سوالات پوچھے گئے۔ ایک سوال تھا کہ ”جناب صدر! امریکی حکومت ماضی اور حال میں متنازعہ مسائل کے حل کے لئے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کو استعمال کرتی رہی ہے۔ آپ جنوبی ایشیا کو درپیش ایک اہم مسئلے یعنی مسئلہ کشمیر کے لئے سلامتی کونسل سے کب رجوع کریں گے؟“ صدر بٹش نے جواب دیا ”ہم نے اس موضوع پر بڑی اچھی بات چیت کی ہے۔ میں نے صدر مشرف کو یقین دلایا ہے کہ اس مسئلے کے حل کی خاطر مفید اور با مقصد مذاکرات کے لئے متعلقہ فریقوں کو آمادہ کرنے کے لئے جو بھی کر سکتے ہیں کریں گے۔“ صحافی نے پھر پوچھا کہ ”لیکن جناب صدر اقوام متحدہ کی مداخلت؟“ صدر بٹش نے کہا ”میرے خیال میں امریکہ کی مداخلت بالکل وہی ہوگی جو میں صدر مشرف کو بتا چکا ہوں“ پھر سوال کیا گیا ”امریکہ بار بار کہتا ہے کہ وہ دہشت گردی کا خاتمہ چاہتا ہے۔ آپ کشمیر میں جاری ریاستی دہشت گردی پر کب توجہ دیں گے؟“ صدر بٹش کا جواب تھا ”میری حکومت یکم اکتوبر کے واقعہ (سری گرا سبلی پر حملہ) کی مذمت کرتی ہے جیسا کہ صدر مشرف خود بھی کر چکے ہیں۔ انہوں نے بھی اس واقعہ کی مذمت

کی ہے۔ ہمارا نقطہ نظر واضح ہے کہ دنیا میں کسی بھی جگہ دہشت گردی نہیں ہونی چاہئے۔ صدر مشرف پاکستان کو مضبوط بنانے کیلئے بڑی محنت کر رہے ہیں۔ انہوں نے تعلیم کے لئے ایک روشن خیال پلان بنایا ہے۔ انہیں اس سلسلے میں ایک عمدہ خاتون کی خدمات حاصل ہیں جو تعلیم کا محکمہ چلا رہی ہیں۔“

صدر بٹش کی اس انتہائی مبہم، غیر واضح اور ابھی ہوئی گفتگو سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ کشمیر کی اہمیت سے آگاہ ہیں، نہ اس کے بارے میں پاکستانی موقف سے کوئی ہمدردی رکھتے ہیں جس دن یہ پریس کانفرنس ہوئی، غالباً اسی دن امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے ایک بیان میں کہا کہ ”پاکستان اور بھارت کو کشمیر کا تنازعہ مذاکرات کے ذریعے خود طے کرنا چاہئے۔ امریکہ اس معاملے میں کوئی کردار ادا نہیں کرے گا“ اور آج پاکستان میں امریکی سفیر وینڈی جیمبر لین نے ”نوائے وقت“ کے ساتھ ایک انٹرویو میں اس سوال کے جواب میں کہ ”امریکہ مسئلہ کشمیر کے حل میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟ کہا کہ ”یہ ایک بڑا جذباتی مسئلہ ہے جسے کوئی باہر کا کھلاڑی نہیں مسئلے سے متعلق تین بنیادی فریق یعنی پاکستان، بھارت اور کشمیر کے عوام ہی حل کر سکتے ہیں۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے اس کے کچھ اصول ہیں۔ یہ اصول ہیں انسانی حقوق کا احترام اور دہشت گردی کا خاتمہ۔ ہم چاہتے ہیں کہ کشمیر کے عوام، بھارت اور پاکستان باہمی مذاکرات کے ذریعے اس دیرینہ مسئلے کا حل نکالیں۔“ جب ان سے پوچھا گیا کہ ”کشمیری عوام کے حق خود ارادیت اور اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کے حق کا کیا ہے؟“ تو محترمہ نے تفصیلات میں جانے سے انکار کر دیا اور کہا ”امریکہ تینوں فریقوں کے درمیان مذاکرات کا حامی ہے۔“

”عالمی لوٹی جرمہ“ کا نہایت ہی فعال حصہ بن جانے کے بعد ہم رضا کارانہ پابندیوں کے ایک ایسے جال میں آچکے ہیں جس سے نکلنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ کثیر کار کردار ادا کرنے والی ”اقوام متحدہ“ کی طرح یہ لوٹی جرمہ امریکی حرم کا ”خواجہ سرا“ بن چکا ہے۔ خدشہ ہے کہ آنے والے دنوں میں کوئی ایسا فرمان جاری نہ ہو جائے جو کشمیر کیلئے ہماری عمر بھر کی محنت کو عارت کر دے۔ آج اس ”لوٹی جرمہ“ کا ہر اول دستہ اور ترجمان بن جانے کے بعد کل ہم اس کی حیثیت اور جواز کو چیلنج نہیں کر سکیں گے۔

[22-11-2001]

طالبان.....مسئلہ کیا ہے؟ (1)

افغانستان کے بڑے حصے سے طالبان کی بے دخلی کے بعد بحث و نظر کے درپچوں کے ساتھ ساتھ کج بحشی کے پھانک بھی کھل گئے ہیں۔ کچھ مکان کی دیوار گرتے ہی ساری دنیا نے افغانوں کے مہن سے رستے بنائے ہیں اور لہو کی برسات میں بلوں سے نکل آنے والے حشرات الارض ایک نئی صبح بہار کی خبر لائے ہیں۔ انصاف کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ معاملات کو الجھائے بغیر، ہر حقیقت کو اپنی اپنی جگہ رکھ کر دیا نندار اندہ رائے قائم کی جائے اور کسی نتیجے پر پہنچا جائے۔ یہ رائے اور یہ نتیجہ بہت سی دوسری آراء اور نتیجوں سے مختلف بھی ہو سکتا ہے۔ یہ کام قاری کا ہے کہ وہ کس دلیل کو محکم اور کس کو بے وزن خیال کرتا ہے۔

طالبان کے فہم اسلام، انداز حکمرانی، نظریہ ریاست اور اسلوب سیاست سے کئی لوگوں کو اختلاف ہے۔ وہ اس اختلاف کی ٹھوس وجوہات بھی رکھتے ہیں۔ ان کی رائے کا احترام واجب ہے لیکن ایک قبیلہ ایسا بھی ہے جس کے لئے طالبان کی ڈاڑھیاں، ان کے عمائے اور ان کے طور اطوار ہی انہیں مردود قرار دینے اور ان کا حق حکمرانی چھین لینے کے لئے کافی ہیں۔ ظاہر امر یکہ اور مغرب پر تند و تیز تنقید کے باوجود ان کی سوچ مرعوبیت کی بھاری سلوں تلے دبی ہوئی ہے۔ وہ ہوا کے کسی آوارہ جھونکے کو بھی نئے موسموں کا سفیر سمجھ کر پتنگیں اڑانا اور پیچے لڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ برقعوں، داڑھیوں، جینز کی پتلونوں اور سینما گھروں کو طالبان کے خلاف دلائل کے طور پر استعمال کرنا دراصل معاملے کو الجھانا ہے اور ایسا کرنا دانستہ یا نادانستہ طور پر اس صدی کی سب سے بھیا نک دہشت گردی اور سب سے مکروہ فرعونیت کو بیساکھیاں فراہم کرنا ہے۔

میں نے طالبان کی نمو کے ابتدائی دنوں میں جب قندھار اور ہرات کا دورہ کیا تھا تو بہت سی باتوں نے میرا دل بوجھل کر دیا تھا۔ مجھے قندھار کی وہ صبح ابھی تک نہیں بھولی جو پہاڑوں کی کشادہ وادیوں میں آباد بستیوں کی طرح اجلی روشن اور بے داغ تھی۔ میں قندھار میں پاکستانی قونصل

خانے کے گیٹ ہاؤس کی چھت پر جا کھڑا ہوا اور زخمی منڈیوں پر اترتی اگست کی زرتاب دھوپ کا نظارہ کرنے لگا۔ سڑک کے اس پار ”قدھار ہوٹل“ کی جنگ زدہ آٹھ منزلیں اپنا چھلنی بدن سنبھالے کھڑی تھیں۔ میں رات کو اس ہوٹل کے تاریک کمرے میں مقفل ریڈیو اور ٹی وی شیڈن بھی دیکھ آیا تھا۔ میں چھت پر کھڑا دیر تک سوچتا رہا کہ ابھی میرے سامنے والی سڑک پر نیلی پیلی دردیاں پہنے ننھے منے بچے اپنے بستے سنبھالے روشن چہرے لئے اپنی درس گاہوں کو رواں دواں دکھائی دیں گے۔ بچوں سے لدی چھوٹی بڑی گاڑیوں کا تانتا بندھ جائے گا لیکن یہاں سے وہاں تک پھیلی سڑک بیوہ کی کلائی کی طرح دیران رہی۔ مایوس ہو کر میں نیچے اتر آیا اور پہروں اداں رہا۔ یہ اور بہت سی دوسری باتیں، بہت سے دوسرے لوگوں کے لئے بھی تکلیف دہ ہیں اور وہ بجا طور پر طالبان کے بارے میں تحفظات رکھتے ہیں۔ لیکن دنیا کی کون سی حکومت اور کون سے حکمران ایسے ہیں جن کے بارے میں سو فیصد مثبت رائے پائی جائے اور دنیا کا کون سا نظام ایسا ہے جو ہر عیب سے پاک ہو۔ ہر ملک کی اپنی تہذیبی پہچان، اپنے معاشرتی رنگ ڈھنگ، اپنے سیاسی تقاضے اور اپنے مخصوص مسائل ہوتے ہیں۔ وہاں کی حکومتیں انہی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے انداز و اطوار میں تھوڑی بہت تبدیلیاں لاتی رہتی ہیں۔ لیکن صدیوں سے موجود ذہنی رویوں اور معاشرتی ڈھانچوں کو یکسر بدل ڈالنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ طالبان کا نظام، دنیا کی نگاہوں میں جیسا بھی ہو، بڑی حد تک افغانستان کی روایتی ساخت کا مظہر ہے۔ بیسیوں کمزوریوں کے باوجود طالبان کے پانچ سالہ دور کو افغانستان کی تاریخ کا سب سے منفرد، سب سے بہتر دور کہا جاسکتا ہے۔

انہوں نے کم و بیش پانچ آزاد اور خود مختار اکائیوں میں بٹے افغانستان کو متحد کیا، سیاسی وحدت قائم کی، طویل عرصے بعد افغانستان کو ایک مستحکم مرکزی حکومت اور نظام دیا۔ ضلع، صوبہ ولایت اور مرکز کی سطح پر شورائی نظام جاری کیا۔ 1992ء میں اقوام متحدہ نے مہلک اسلحہ عام افراد سے واپس لینے کے لیے تین بلین ڈالر کی گرانٹ کا اعلان کیا لیکن ربانی حکومت کچھ بھی نہ کر سکی۔ طالبان نے دیکھتے دیکھتے ہتھیاروں سے عشق کرنے والے معاشرے کو غیر مسلح کر دیا۔ انصاف کی بالادستی کو یقینی بنایا۔ مقدمہ کسی بھی نوعیت کا ہو، مدعی کو ایک چیمہ بھی ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ انصاف میں تاخیر کو انصاف سے انکار سمجھنے کا تصور صرف طالبان کے ہاں تھا جہاں مقدمات کے فیصلے دنوں

میں ہو جاتے تھے۔ چیف جسٹس یا قاضی القضاہ مولانا ظلیل اللہ فیروزی نے عدل کی کارفرمائی میں قرون اولیٰ کی مثالیں قائم کیں۔ ”قوماندان امیہ“ یعنی پولیس کا نظام اتنا موثر تھا کہ طالبان کا افغانستان امن و امان کا مثالی گوارہ بن گیا۔ جرائم کی موثر بیخ کنی کی کوئی دوسری مثال موجودہ دور میں تلاش نہیں کی جاسکتی۔ نسلی اور لسانی بنیادوں کے بجائے خالص نظریاتی اساس پر قائم رہنے والی یہ پہلی حکومت تھی جو اپنے آپ کو تحریک کا نام دیتی تھی۔ تحریک پر پشتون غلبے کے باوجود ازبک، تاجک اور دیگر اقلیتی گروہوں پر دروازے بند نہیں کیے گئے بلکہ انہیں مرکزی کابینہ میں شامل کیا گیا۔ اقوام متحدہ اور دیگر ادارے منشیات کے خاتمے کے لیے اربوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں۔ افغانستان میں دنیا کی مجموعی پیداوار کی 75 فیصد افیون کاشت ہوتی تھی لیکن ملا عمر کے ایک حکم نامے نے ملک کو افیون کی کاشت سے پاک کر دیا۔ اس کی تصدیق یونائیٹڈ نیشن ڈرگ کنٹرول پروگرام (UNDCP) کے سربراہ برنارڈ ایف نے بھی کی۔ طالبان نے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی ضمانت دی۔ یہ افغانستان کی پہلی حکومت تھی جو شاہی خانوادوں، بڑے بڑے خانوں، ڈرگ مافیا کے لارڈز اور خود سر جنگی سوراؤں سے پاک تھی۔ عام لوگوں میں، عام لوگوں کی طرح رہنے بسنے والے غریب غریبا، اس تحریک کے قائد اور پاسبان تھے۔ یہ وہ فلنڈر اور درویش لوگ ہیں جو اقتدار کی چکا چوند اور حکمرانی سے وابستہ عشقوں کا کوئی تصور نہیں رکھتے۔ ان پر ادنیٰ ترین کرپشن کا الزام بھی نہیں۔ وہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی تصویر لگتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ طالبان کے منفی یا مثبت پہلوؤں کا امریکی بربریت اور وحشیانہ بمباری سے کیا تعلق ہے؟ ایک عفریت کی درندگی پر ملامت کے بجائے کچھ لوگ طالبان پر کیوں سنگ باری کر رہے ہیں؟ فرعونی قوت کے انسانیت سوز مظاہرے کو ایک حکومت کی کمزوریوں کے ساتھ کیوں خلط ملط کیا جا رہا ہے؟

[23-11-2001]

طالبان..... مسئلہ کیا ہے؟ (2)

انسانی حقوق کے بارے میں بھی طالبان کا ریکارڈ کئی نام نہاد مہذب ملکوں سے بہتر ہے۔ عورتوں کی عزت و ناموس کو انہوں نے زبردست اہمیت دی۔ طالبان سے قبل عورتوں کی خرید و فروخت کوئی خلاف معمولی بات نہ تھی۔ عورتیں تختے کے طور پر پیش کی جاتی تھیں۔ لڑائی جھگڑے کے تاوان یا سودا بازی کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ شادی بیاہ کے لئے ان کی مرضی معلوم کرنے کا کوئی تصور نہ تھا۔ طالبان نے تمام جاہلانہ رسومات پر کڑی پابندیاں لگا دیں۔ شرعی احکام کے مطابق لازم قرار دیا کہ شادی سے قبل عورتوں کی مرضی معلوم کی جائے اور قاضی اس کی تصدیق کرے۔ وراثت میں ان کے شرعی حقوق کو تحفظ دیا گیا۔ انہیں صحت، تعلیم اور سماجی بہبود کے شعبوں میں کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ مخلوط تعلیم ختم کر کے الگ مدارس میں ان کی تعلیم کا بند بست کیا گیا۔ کوئی سال بھر قبل قدمہا رسمیت تمام بڑے شہروں میں میڈیکل سائنسز کی تعلیم کا اجرا کیا گیا جہاں خواتین کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے البتہ ان کے لئے الگ کلاسوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔

سادہ دل طالبان، بین الاقوامی مصلحتوں، سفارت کاری کی نزاکتوں، تعلقات عامہ کی پارکیوں اور ذرائع ابلاغ کی حشر سامانیوں کا واضح شعور نہیں رکھتے۔ صاف گو اور نیک چلن لوگوں کا تعلیمی پس منظر دینی ہے۔ عصری علوم سے ان کی آگاہی محدود ہے۔ ان کی تحریک نے دس سالہ افغان جہاد کی کوکھ سے جنم لیا جس کا ایک مقصد سامراجی اثرات سے آزاد افغانستان میں اسلامی نظام کا نفاذ تھا۔ جہادی رہنماؤں کی باہمی جنگ اقتدار اور آوارہ مزاج وار لارڈز کی انسانیت سوز حرکات سے تنگ آ کر وہ یکجا ہوئے اور پھر عوام کے تعاون سے چھاتے چلے گئے۔ عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ایک جامع اور روشن خیال شرعی نظام کا کوئی متعین خاکہ نہ ہونے اور وسائل کی شدید کمی کے باعث انہوں نے مدرسے کے محدود مفہوم پر مبنی شرعی نظام تعزیرات اور عمومی

احکام کے تحت گیر نفاذ پر ضرورت سے زیادہ توجہ دی۔ یہی وہ وقت تھا جب عالمی برادری ان کے ساتھ ربط ضبط بڑھا کر ان کے ذہنی افق کو وسیع، ان کے رویوں کو چلکدار اور ان کے طرز حکمرانی کو زیادہ حقیقت پسندانہ بنا سکتی تھی۔ اسلامی امہ ان جوانوں کو اپنی آغوشِ محبت میں لے کر ان کے توانا جذبوں کی تراش خراش کر سکتی تھی لیکن نہ جانے کیوں پہلے دن سے ہی ساری دنیا نے انہیں اپنا حریف جانا۔ پروفیسر برہان الدین ربانی اور موجودہ شمالی اتحاد 1992ء سے 1996ء تک کا بل پر قابض رہے۔ اس دوران کا بل کھنڈر بن گیا اور ساٹھ ہزار شہری لقمہ اجل بن گئے لیکن امریکہ اور یورپ بدستور ربانی کو صدر تسلیم کرتے رہے۔ جب طالبان کا بل سمیت افغانستان کے نوے فیصد سے زائد حصے پر قابض ہو گئے اور ایک مستحکم حکومت قائم کر لی تو بھی وادی پنج شیر میں روپوش ربانی ہی کو صدر تسلیم کیا جاتا رہا اور اقوام متحدہ میں وہی افغانستان کی نمائندگی کرتے رہے۔ پاکستان کی تحریک پر سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات نے طالبان کی حکومت کو تسلیم تو کر لیا لیکن کسی نے ان کی ٹھوس مدد اور رہنمائی نہ کی۔ طالبان ایک جنگ زدہ ملک کو درپیش قیامت خیز چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہو گئے۔ تباہ حال انفراسٹرکچر، مفلوک الحال معیشت، کھنڈر بستیاں، غربت زدہ عوام، نہ کوئی ادارہ نہ انتظامی ڈھانچہ، ساری دنیا نے انہیں کوڑھ کے مریض کی طرح دور پھینک دیا۔ اس اذیت ناک تباہی اور مقاطعے کے دوران طالبان کا نظام اپنے ماحول اور اپنی آب و ہوا کے مطابق خود رو انداز میں تشکیل پاتا رہا۔ جب قحط سالی اور آفات کے مارے ہوئے سخت جان لوگ پھر بھی زندہ رہے تو ان پر طرخ طرح کی پابندیوں کے کوڑے برسائے جانے لگے۔ اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو نوبت کروڑوں کمروں اور ڈیزی کڑیوں تک آن پہنچی۔

طالبان پر تنقید کے نشتر چلانے والے بتا سکتے ہیں کہ امریکہ، برطانیہ، یورپ اور نام نہاد مہذب دنیا نے طالبان کو کیوں تسلیم نہیں کیا؟ کیوں ان کے قریب جا کر ان کے مسائل جاننے کی کوشش نہیں کی گئی؟ کیوں پاکستان، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب سمیت دنیا کے کسی ملک نے ملا عمر کو قذہار کے حجرے سے نکل کر باقی دنیا دیکھنے، عالمی رہنماؤں سے ملنے اور بین الاقوامی جاسیت کا شعور حاصل کرنے کا موقع نہیں دیا؟ کیوں پروفیسر ربانی کو صدر تسلیم کر کے طالبان کو مشتعل کیا گیا؟ یونیسکو اور سویڈن کی ایک این جی او عین ان دنوں لاکھوں ڈالرز کا پراجیکٹ لئے بامیان کے مجسموں کے عارض و رخسار سنوارنے کیوں آ پہنچی جب مقامی لوگ شدید قحط سالی کا

شکار تھے اور ہزاروں بچے بھوک سے مر رہے تھے؟ دنیا کو معلوم نہیں کہ بامیان کے بڑوں نے ان بین الاقوامی ایجنسیوں کے نمائندوں کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے..... ”خدا کے لئے تھوڑی سی رقم ہمارے مرتے ہوئے بچوں کے لئے بھی وقف کر دو“ جب انکار ہوا تو آخری ہچکیاں لیتے بچوں کے والدین نے دیوانگی اور اشتعال کے عالم میں وہی کچھ کیا جو دیوانے اور مشتعل لوگ کیا کرتے ہیں۔

اسامہ بن لادن کے بارے میں بھی طالبان نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ ہرگز نہیں کیا لیکن وہ اس دنیا کا موڈ تبدیل نہیں کر سکتے تھے جو عالمی کولیشن کے ٹینکوں پر سوار طورخم پر آکھڑی ہوئی تھی اور جس کولیشن کا سرپرست طالبان کو نابود کرنے کا حتمی فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ سوچی سمجھی سلیم کے تحت ہانکا لگا کر طالبان کو اس قتل گاہ کی طرف لا رہا تھا۔

اور آج جب ان سادہ معصوم لوگوں کے پر نچے اڑ رہے ہیں تو سفاک قاتلوں کی بدقماش اور بربریت کو نشانہ بنانے کے بجائے دانشوروں کے ہر سنگ الزام اور ہر تیر دشنام کا رخ برقعوں، ڈاڑھیوں اور عماموں کی طرف کیوں مڑ گیا ہے؟
کیا یہ انتہائی عامیانه سطح کی کج بخشی نہیں ہے؟

[24-11-2001]

طالبان..... مسئلہ کیا ہے؟ (3)

عمومی حالات میں طالبان پر سنگ زنی شاید کوئی اور معنی رکھتی ہو لیکن قیامت کی کڑی دھوم میں ان کے سلگتے جسوں اور چٹختی ہڈیوں پر ان کی بے حکمتی، سخت گیری، قدامت پسندی اور بنیاد پرستی کے تازیانے برسانے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ امریکی بربریت کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جائیں۔ آج جو بھی قلم کسی بھی بات کو بہانہ بنا کر طالبان پر نشتر چلاتا اور جو بھی زبان کسی بھی دلیل کی بنیاد پر ان کے خلاف زہرا لگتی ہے وہ دراصل ظلم کی ایک اندھی قوت کی پیڑھ تھپتھپاتی اور اس کے مکروہ عمل کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ آج طالبان کی ہر جھوٹا، لامحالہ امریکہ کی شان میں کہا جانے والا قصیدہ ہے۔ جو لوگ طالبان میں کیڑے نکالنے کے بعد امریکہ کی رسمی سرزنش بھی کر رہے ہیں وہ بھی درحقیقت ظالم اور مظلوم کی تمیز بنا کر اپنی دانشورانہ غیر جانبداری کی دھاک بٹھا چاہتے ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

مغرب نے اپنے میڈیا کے زور پر طالبان کی پوشاک پر اتنے داغ لگائے ہیں کہ اس کا حتیٰ رنگ کسی کو دکھائی ہی نہیں دے رہا۔ نتیجہ یہ کہ سارے حقائق مسخ ہو گئے ہیں اور خود ہمارے دانشور اس طرح کا تاثر دے رہے ہیں جیسے جنگ کی آگ طالبان نے بھڑکائی ہے اور امریکہ انتہائی بے چارگی کے عالم میں ڈیزی کٹریم گرا رہا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ جب طالبان قندھار کے افق سے طلوع ہوئے تو انہیں بے لگام اور مند زور جہادی کمانڈروں کا توڑ سمجھا گیا۔ انہیں جھکی دی گئی۔ تیل کی اکانومی میں جکڑی امریکی سیاست و قیادت کی نظر وسط ایشیا کے معدنی وسائل پر تھی۔ امریکہ افغانستان میں ایک مستحکم لیکن فرمانبردار حکومت چاہتا تھا جس کی موجودگی میں امریکہ تیل کمپنیاں افغانستان سے مطلوبہ پائپ لائن گزار سکیں اور خود امریکہ کو پاؤں پارانے کا موقع مل جائے۔ طالبان نے استحکام تو فراہم کر دیا لیکن فرمانبرداری پر آمادہ نہ ہوئے۔ امریکی شرائط سے انہیں سامراجی عزائم کی بو آنے لگی۔ امریکہ اور طالبان کے درمیان خفیہ مذاکرات کا

سلسلہ طویل عرصے جاری رہا۔ اسلام آباد، برلن اور واشنگٹن میں ہونے والے اجلاسوں میں طالبان اور امریکہ سمیت کئی دیگر ممالک نے بھی شرکت کی۔ طالبان کے کچھ اپنے خدشات تھے اور بعض دیگر ذرائع بھی انہیں چوکنا رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ایک فرانسیسی مصنف کے بقول طالبان سے کہا گیا کہ ”یا تو وہ سونے کا قالین بچھانے پر راضی ہو جائیں یا پھر تباہ کن نتائج کے لئے تیار رہیں۔“ یہ سلسلہ 11 ستمبر سے ایک ماہ پہلے تک جاری رہا جب اگست میں کرسٹینارو کا اور ملا عبدالسلام ضعیف کے درمیان اسلام آباد میں مذاکرات کا آخری دور ہوا۔ ایسے ہی ایک اجلاس میں امریکی نمائندے ٹام سیمسن (TOM SIMSON) نے کہا کہ ”پاکستان طالبان کو اپنا رویہ درست کرنے کے لئے کہے ورنہ ان کے خلاف فوجی کارروائی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔“ امریکہ کی موجودہ قیادت اور تیل کے بزنس کا باہمی تعلق کئی سال پرانا ہے۔ اس ضمن میں بش خاندان پر بن لادن خاندان کی نوازشات کی داستانیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

جب امریکہ نے حتمی طور پر جان لیا کہ طالبان ”نا قابل اصلاح“ ہیں تو اس نے اپنے مفادات کی خاطر پہلے تو وسیع الہیاد حکومت کی گردان میں شدت پیدا کی۔ پھر طالبان کے غیر انسانی نظام کے خلاف پراپیگنڈہ تیز کیا اور بالآخر گیارہ ستمبر کو پینٹا گان اور ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی آگ سرد ہونے سے کئی گھنٹے قبل طالبان کو اسامہ بن لادن کا میزبان قرار دے کر فوجی کارروائی کی شان لی۔

امریکہ کے پاس اس بات کا کوئی ادنیٰ سا ثبوت بھی نہیں کہ طالبان کا گیارہ ستمبر کے واقعات سے ذرہ برابر تعلق بھی بنتا ہے۔ سلامتی کونسل کی 28 ستمبر کی قرارداد نمبر 1373 میں دہشت گردی کے خلاف کارروائی کی عمومی منظوری تو دی گئی ہے لیکن بین الاقوامی قانون کے ماہرین کا خیال ہے کہ یہ قرارداد کسی بھی آزاد ملک کے خلاف جنگ یا وسیع تر فوجی کارروائی کا مختار نامہ ہرگز نہیں۔ اس پر اقوام متحدہ کے چارٹر کی شق 51 کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔ ہیک میں قائم عالمی عدالت انصاف نے نکاراگوا کیس کی سماعت کرتے ہوئے 1986ء میں فیصلہ دیا تھا کہ

"THE UNITED STATES HAD ACTED ILLEGALLY BY ENGAGING IN MILITARY ACTION-AGAINST NICARAGA."

(امریکہ نے نکاراگوا کے خلاف آپریشن میں شامل ہو کر خلاف قانون کارروائی کی تھی)

عالمی عدالت انصاف نے ایک لحاظ سے امریکی کارروائی کو ”دہشت گردی“ قرار دیتے ہوئے اس پر ہر جانہ بھی عائد کیا تھا۔ اب امریکہ ایک بار پھر وہی کچھ کر رہا ہے۔ آج بھی اقوام متحدہ کے زیر اہتمام نکاراگوا اور روانڈا کے بارے میں دو کیمینٹریوں کا کام کر رہے ہیں جو انسان کشی کے مرتکب کئی مجرموں کو سزا دے چکے ہیں اور یوگوسلاویہ کے صدر ملازویچ ابھی تک مقدمہ بھگت رہے ہیں۔ کیا اسامہ بن لادن اور طالبان کے لئے اقوام متحدہ ایک ایسا ہی ٹریبونل نہیں بنا سکتی تھی؟ اقوام متحدہ ایک انٹرنیشنل کریمنل کورٹ کے قیام کا فیصلہ بھی کر چکی ہے جس پر عمل درآمد کے لئے ساٹھ ممالک کی توثیق چاہئے۔ اب تک روس، برطانیہ اور فرانس سمیت چوالیس ملک اس کی توثیق کر چکے ہیں لیکن امریکہ رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ ویت نام، لاطینی امریکہ اور کئی دیگر ممالک میں انسانیت سوز کارناموں کے باعث وہ کبھی وہ کبھی میں کھڑا کیا جانے والا پہلا ملک ہوگا۔ مقصد انصاف کا حصول اور دہشت گردی کا خاتمہ ہوتا تو امریکہ بلا تاخیر اس عدالت کو بروئے عمل لا کر اپنا مقدمہ پیش کر سکتا تھا۔ لیکن مقصد حق و صداقت کی بالادستی اور حقیقی مجرموں کی سرکوبی نہیں، نافرمانی کی جسارت کرنے والوں کو نشانہ عبرت بنانا ہے۔

اور سب کچھ جانتے سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی ہمارے دانشوروں کا ہاتھ طالبان کے گریبان پر ہے۔ وہ مزے لے لے کر ان کی ”غلط کاریوں“ کے افسانے لکھ رہے ہیں اور ظلم کی تنگی تلوار کی ملامت کرنے کے بجائے طالبان کی گردن کی سخت جانی کو کوسنے دے رہے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ فرعونوں کے سامنے تپتی رہنے والی گردنوں کی ہڈی بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ کتنے کتنے بھی ظلم کی تلواروں کی دھار موڑ دیتی ہے۔ جھک جانے والے سر کسی گنتی میں نہیں آتے۔ کروڑوں ڈالروں کی قیمت انہی سردوں کی گنتی ہے جو جھکنے سے انکار کر دیں۔

[25-11-2001]

طالبان..... مسئلہ کیا ہے؟ (4)

کیا امریکہ کی سفاکی سے منہ پھیر کر طالبان کا گوشت نوچنے اور ہڈیاں چھوڑنے والے دانشور، دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ اس غارتگری کا مقصد فقط اسامہ کو پکڑنا ہے؟ کیا یہ واقعی افغان عوام کی رہائی عورتوں کے حقوق کی بحالی اور خستہ حال افغانیوں کو جدید زور کی نعمتوں سے مالا مال کرنے کا مشن ہے؟ کیا یہ قیامت کوتاہ اندیش طالبان کی ڈاڑھیوں، عماسوں اور نقابوں کی وجہ سے ٹوٹی ہے؟

اگر ایسا ہی ہے تو دوسری جنگ عظیم سے لے کر اب تک امریکہ دو درجن ممالک میں آگ اور خون کی ہولی کیوں کھیلتا رہا؟ چین، کوریا، گوئٹے مالا، انڈونیشیا، کیوبا، کنگو، پیرو، لاؤس ویتنام، کمبوڈیا، گریینڈا، لیبیا، صومالیہ، لبنان، السلوواڈور، نکاراگوا، پانامہ، عراق، سوڈان اور یوگوسلاویہ میں طالبان تو نہیں بستے تھے۔ طالبان کی ملائیت، خواتین کے نقابوں، ٹیلی ویژن کی گنگ سکرینوں اور شرعی ضابطوں کو امریکی یلغار کا جواز سمجھنے والے اتنا تو بتادیں کہ ویتنام کا پوجی منہ کس دیوبند کا سند یافتہ تھا؟ کنگو کے لومبانی نے کون سا درس نظامی کیا تھا؟ انڈونیشیا کے سویکارنوں نے کس جامعہ اشرفیہ سے سند فضیلت پائی تھی؟ یوگنڈا کا عیدی امین کس دارالعلوم کافارغ تحصیل تھا؟ عراق کے صدام حسین نے کون سے نقاب پہنائے تھے؟ زمبابوے کے رابرٹ موگابے نے کس اسامہ کو پناہ دی تھی؟ ایران کا ڈاکٹر مصدق، لیبیا کا کرنل قذافی، الجزائر کا بن بیلہ، مصر کا جمال عبدالناصر، شام کا حافظ الاسد، سوڈان کا حسن ترابی، کمبوڈیا کا پرنس سہانوک، سعودی عرب کا شاہ فیصل، کیوبا کا کاسترو، کس کس کا نام لیں؟ روس کی ٹھکست کے بعد ضیاء الحق نے اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھانا چاہا تو اسے جہاد افغانستان کے معماروں سمیت بہاولپور کے آتشکدے میں جھونک دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایٹمی پروگرام کی بنیاد ڈالی تو صلیبیں گاڑ دی گئیں۔ شاہ فیصل نے امت مسلمہ کی بات کی تو اس کا سینہ چھلنی کر دیا گیا۔ امریکی سی آئی اے اب تک نصف درجن عالمی رہنماؤں کو

قتل کراچکی ہے۔ کلنٹن نے فخریہ انداز میں کہا کہ ”میں نے اسامہ کو قتل کرنے کا فرمان جاری کیا ہے۔“ جارج بوش سی آئی اے کو انسانی قتل کا اختیار واپس دے چکے ہیں۔ طالبان کے پاس تو ایسی کوئی الجھنی ہے ہی نہیں جو دنیا بھر میں قتل و غارتگری کی وارداتیں کرتی پھرے۔

معروف امریکی دانشور پروفیسر نوم چومسکی نے خود تاریخ کی عدالت میں گواہی دیتے ہوئے کہا ہے کہ ”بی۔52 طیاروں سے افغانستان پر کارپٹ بمباری 11 ستمبر کی دہشت گردی سے بھی بدتر دہشت گردی ہے۔ امریکہ نے اقوام متحدہ کے فیصلے سے بھی پہلے جنگ کا اعلان کر دیا اور ایسا کیوں نہ ہوتا کہ طاقتور مافیا کا سرغنہ کسی سے وصولی نہ ہونے پر عدالت کے احکامات کا انتظار نہیں کرتا بلکہ خود ایکشن لیتا ہے۔ امریکہ نے مافیا چیف کی طرح افغانستان پر حملہ کیا اور وہ ہر اس ملک میں جائے گا جہاں اس کا مفاد خطرے میں ہوگا۔“

ایک امریکی دانشور کی یہ گواہی ہمارے بعض دانشوروں کے منہ پر زنائے کا طمانچہ ہے۔ مان لیجئے کہ امریکہ اخلاقی اقدار سے عاری، انصاف کے معنی و مفہوم سے نا آشنا اور اپنی انا کے گنبد میں بند ایک خود سر اور خدا فراموش قوت ہے۔ وہ جب چاہے، جہاں چاہے اپنا اسامہ اور اپنے طالبان تخلیق کر لیتا ہے۔ اصولوں کی پاسداری کا عالم یہ ہے کہ اس کی محبوباؤں میں جمہوری، آمرانہ، شاہانہ، شخصی، فوجی، وسیع البنیاد اور بے بنیاد سبھی طرح کی حکومتیں شامل ہیں۔ فرق صرف اطاعت گزار اور غیرت شعار کا ہے۔

مسئلہ بس اس قدر ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کی تمیز کے بغیر ہر وہ شخص اور ہر وہ قوم امریکہ کے نزدیک گردن زدنی ہے جس کے دل و دماغ میں انا، خودی، غیرت، عزت نفس یا قومی آزادی و خود مختاری کا خناس سایا ہوا ہے۔ طالبان کا قصور صرف یہ ہے کہ انہوں نے دنیا کے سب سے بڑے خرابکار کے بیگار کیمپ کا حصہ بننے سے انکار کر دیا ہے۔ دانشوروں کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ انسانی تاریخ کی اپنی ہی قسم کی واحد اور منفرد جنگ ہے۔ امریکی مافیا کی دہشت نے ساری دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ ہر ایک نے ”سب سے پہلے پاکستان“ کے انداز میں اپنی اپنی عافیت گاہیں بنالی ہیں۔ ایسے کٹھن وقت میں دنیا کے اجتماعی ضمیر اور تہذیبی اقدار کی ترجمانی کا کام اہل دانش ہی کر سکتے ہیں کہ یہ جنگ، اسامہ یا طالبان نہیں، انسانیت کی خلاف ہے۔ افغانستان تو کیسویں صدی کے چنگیزی لشکر کا چھوٹا سا پڑاؤ ہے۔ علم، سائنس، نیکیانولوجی، مادیت اور مفادات

کی اس دنیا میں ایسے اہل جنوں موجود رہنے چاہئیں جو ظلم کے قلعے پر مسلسل ضربیں لگاتے رہیں۔ ہمارے دانشور بس اتنا کرم کریں کہ دو جمع دو چار جیسی حقیقتوں کو موٹا گائیوں میں نہ الجھائیں۔ طالبان پر چر کے لگا کر امریکہ کا کام آسان نہ بنائیں۔ انہوں نے کہاں جانا ہے؟ وہ تو ایک سوچ، ایک انداز فکر، ایک طرز عمل اور ایک نظریاتی تشخص کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ کوئی سیاسی گروہ، لسانی دھڑا، حکمران ٹولہ یا دار لارڈز کا جتھہ نہیں، ایک تحریک ہیں۔ حکومتیں گرائی اور ہٹائی جاسکتی ہیں۔ تحریکوں کے تختے نہیں اٹے جاسکتے۔ تازہ لہوان کے مرجھائے چہروں کوئی شگفتگی دے جاتا ہے۔ ایسی تحریکیں مٹ جایا کرتیں تو چودہ سو سال بعد کابل و قندھار میں شہادتوں کا نیا چمنستان نہ کھلا ہوتا۔

[26-11-2001]

پٹاری کھل رہی ہے

مذاری کا تماشا جاری ہے۔

افغانستان کے عوام کو ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے پاک آزادانہ مرضی سے اپنی حکومت منتخب کرنے کا موقع فراہم کرنے کیلئے امریکی قیادت میں لڑی جانے والی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ اس مقصد کیلئے کم و بیش 20 لاکھ پاؤنڈ بارود اور فولاد برسانا پڑا۔ اب شمال مشرق اور مغرب میں عوام کی حکمرانی کا ناقوس بج رہا ہے اور جنوب میں قندھار کے اندر پناہ گزین آخری ”آمریت“ پر آخری ضرب لگانے کیلئے امریکی سپاہ تیار کھڑی ہے۔ امریکہ کے علاوہ برطانوی دستے بھی وارد ہو چکے ہیں۔ 1988ء میں دریائے آمو سے اس پار جانے والے آخری روسی سپاہی نے کہا تھا کہ ”افغانستان ایک بھیانک خواب کی طرح ہمارا پیچھا کرتا رہے گا“ آج تیرہ سال بعد ایک بار پھر روسی فوج کے دستے افغانستان میں اتر چکے ہیں۔ بیک وقت تین سامراجوں کی چکی میں پستے ہوئے افغانیوں کو ”بیرونی مداخلت سے پاک“ حکومت فراہم کرنے کیلئے بون میں ایک خصوصی میلے کا اہتمام کیا گیا ہے جہاں نئے حکمرانوں کا ناک نقشہ تیار ہو رہا ہے۔ جرمنی میں تیار کی جانے والی یہ حکومت ”سیل بند پیکنگ“ کے ساتھ کابل ارسال کی جائے گی اور یوں افغانستان کے عوام کو ایک طویل عرصے بعد اپنی منشاء و پسند کے حکمران میسر آجائیں گے۔ اس وقت بھی خاصی حد تک عوامی خواہشات کی تکمیل ہو چکی ہے۔ طالبان کا افغانستان اب ربانی، دوستم، فہیم، داؤد، کریم، ظلیلی، اسماعیل خان، حاجی قدیر، ملا نقیب اور دوسرے دارلارڈز کے کئی افغانستانوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔

سائنس، ٹیکنالوجی اور علم کی معراج کمال تک پہنچے ہوئے امریکہ کی انسان دوستی، بنیادی حقوق سے محبت اور انسانی اقدار سے لازوال وابستگی ایک نئی تاریخ رقم کر رہی ہے۔ مزار شریف کے قلعہ جنگلی میں بند ساڑھے سات سو جنگلی قیدیوں پر پہلے دوستم کے لشکریوں نے اپنا ہنر آزمایا۔

پھر امریکن طیاروں نے ”ڈک شوٹنگ“ کا تجربہ کیا۔ یہ سفاکی اور بربریت کا ایسا مظاہرہ ہے جس پر اکیسویں صدی کا ایک ایک لمحہ شرمسار رہے گا۔ اقوام متحدہ کے نمائندے دہائی دے رہے ہیں کہ مزار شریف کے نواح میں قائم کیمپوں پر وحشیوں کی حکمرانی ہے جو بیدردی سے خواتین کی عصمتیں لوٹ رہے ہیں۔ امریکی کولیشن منتظر ہے کہ برقعوں سے آزادی کا جشن منانے والے دانشور انقلاب کی اس تازہ کر وٹ کا قصیدہ کب لکھیں گے۔

کھیل جاری ہے۔ پاکستانی دانشوروں کا کہنا ہے کہ ”طالبان دینا کو فتح کرنے نکلے تھے اس لئے ان کا یہ حشر ہوا“ ادھر صدر امریکہ نے کہا کہ افغانستان تو محض نقطہ آغاز ہے، دہشت گردی کے خلاف جنگ ساری دنیا میں پھیلے گی۔ ”دہشت گردی“ کو ایک نیا مفہوم دیتے ہوئے انہوں نے مہلک ایٹمی ہتھیار تیار کرنے والوں کو بھی سخت وارننگ جاری کی ہے۔ عراق سے کہا گیا ہے کہ وہ فوراً اپنی تخصیبات اقوام متحدہ کے انسپکٹروں کیلئے کھول دے۔ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے تین مزید ملکوں کا نام لیا ہے جو افغانستان ہی کی طرح دنیا فتح کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان ممالک میں عراق، شام اور ایران شامل ہیں۔ انہوں نے خاص طور پر شام اور ایران کو دھمکی دی ہے کہ وہ باز آجائیں ورنہ سنگین نتائج کیلئے تیار رہیں۔ صومالیہ، سوڈان اور یمن میں بھی کارروائیوں کو آخری شکل دی جارہی ہے اور کمرس کے فوراً بعد پہلا معرکہ صومالیہ میں پاپوا گوا۔ سنڈے ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق ٹونی بلیر اور جارج بش فتح افغانستان سے حاصل ہونے والے جوش و جذبہ کو برقرار رکھتے ہوئے نئی منزلیں سر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بچے جمورے ہاں میں ہاں ملتا رہے ہیں اور 156 اسلامی ملکوں میں سے صرف ملائیشیا کے مہاتیر محمد کو یہ کہنے کی جسارت ہوئی کہ ”امریکہ کی مہم دراصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ ہے“ کبوتر آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ بلی صرف اس کے پڑوسی کو نگل کر مطمئن ہو جائے گی۔ آنے والے منظر کے واضح نقش دیکھتے ہوئے بھی خوش فہمیوں کی جھنسیں تعمیر ہو رہی ہیں اور اس نیو ورلڈ آرڈر کے عزائم سے چشم پوشی کی جارہی ہے جو اسلام کی روح جہاد اور نظریاتی توانائی کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہے۔ اب تک جن 66 تنظیموں، ممالک اور افراد پر پابندیاں لگائی گئی ہیں وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ صومالیہ میں ”عدن اسلامک فرنٹ“ نامی تنظیم کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جس پر الزام ہے کہ کسی زمانے میں اس نے 17 امریکیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ سوڈان میں

”دنیا کو فتح کرنے کا عزم رکھنے والا“ حسن ترابی قید میں ہے۔ اس کی ایک بھانجی اسامہ کی بیوی ہے اس لئے ترابی اور اس کی تنظیم پر قہر ٹوٹنے والا ہے۔ امریکہ میں زیر تفتیش اور زیر حراست ملزموں میں واحد قدر مشترک ان کا مسلمان ہونا ہے۔

عاطل اور معمول کا کھیل جاری ہے۔ امریکہ کے عزائم پر پڑا ہوا پردہ ہولے ہولے سرک رہا ہے لیکن آنکھوں پر بندھی پٹیاں جوں کی توں ہیں۔ چاروں طرف خدشوں کی آہٹوں کے باوجود ہم مطمئن ہیں کہ تکمیل آرزو کی صبح طلوع ہونیوالی ہے اور پاکستان نے عالمی کولیشن کا حصہ بننے وقت جن اہداف کا تعین کیا تھا وہ ایک ایک کر کے پورے ہو رہے ہیں۔

پناری کھل رہی ہے۔ کچھ دنوں بعد شیش ناگ باہر نکل آئے گا اور اپنا پھن پھیلا کر پھنکارنے لگے گا۔ تب ہمارے دانشور حیرت سے پوچھیں گے ”افغانستان نے تو دنیا کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی یہ شیش ناگ ہمیں کیوں گھور رہا ہے؟“

[28-11-2001]

تھینک یو پرو فیسر چومسکی

جتنا علم کمپیوٹر کے پاس ہوتا ہے، دنیا کا کوئی شخص اس کے ہزارویں حصے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ علم اسے انسان ہی عطا کرتا ہے لیکن دنیا بھر کے علوم و فنون اس کی کھٹی میں ڈال دینے کے باوجود وہ کمپیوٹر کو انسانیت کی اقدار اور اخلاقیات سے بہرہ مند نہیں کر سکتا جو انسان کے جوہر تخلیق میں شامل ہیں اور جن کی پاسداری ہی انسان کو فضیلت عطا کرتی ہے۔ یہ بحث دوبارہ چھیڑنے کی ضرورت نامور امریکی دانشور پرو فیسر نوم چومسکی کی عالمانہ گفتگو کی وجہ سے محسوس ہوئی۔ شاید ہمارے کچھ دانشور، سائنس اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے دنیا کی سب سے ترقی یافتہ قوم کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد کی سوچ کو اہمیت دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

اسلام آباد میں اپنے لیکچر کے دوران پرو فیسر چومسکی نے کہا:

”ہماری دنیا، علم کی دنیا ہے لیکن دانش سے محروم ہے۔ یہ زندہ ضمیر سے عاری قوت کی دنیا ہے۔ ہم زندہ رہنے کے علم سے کہیں زیادہ ہلاک کرنے کا علم جانتے ہیں۔ ہم امن سے زیادہ جنگوں کا علم رکھتے ہیں۔ ہم جوہری ہتھیاروں کے اعتبار سے جن بن گئے ہیں لیکن اخلاقی اعتبار سے بونے ہیں۔“

یہ ہے وہ الیہ جو مجرد علم کے حصول کو انسانی زندگی کا کمال اور قوموں کی ترقی کا نقطہ عروج قرار دینے والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا۔ علم کو اخلاقیات سے الگ کر دیا جائے اور ٹیکنالوجی کی چمکا چوند روشن ضمیری سے عاری ہو جائے تو پھر امریکہ، برطانیہ اور روس جیسے ایٹمی جن اور اخلاقی بونے وجود میں آتے ہیں۔ انسان کی بڑائی اور برتری یہی ہے کہ وہ علم کو اخلاقیات کے ضابطوں کے تابع رکھے اور جب علم، انسان کشی، ہلاکت آفرینی، درندگی اور فرعونیت پر اتر آئے اور غریب لوگ ٹیکنالوجی سے محرومی کے باعث اس کا مقابلہ نہ کر سکیں تو پھر دنیا بھر کے دانشوروں پر لازم آتا ہے کہ وہ صاحب علم اور ترقی یافتہ معفریت کے چہرے کو بے نقاب کریں اور گوریلہ جنگ کے انداز

میں اس کو مسلسل زخم لگاتے رہیں۔

افغانستان میں جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری طالبان پر نہیں، اس علم، سائنس اور ٹیکنالوجی پر آتی ہے جو زندہ ضمیر اور دانش انسانی سے محروم ہے۔ پروفیسر چومسکی نے مزید کہا ہے کہ ”انسان نہ صرف دوسری زندہ مخلوق کے لئے خطرہ بنا ہوا ہے بلکہ اس نے اپنی سنگ دلائی اور ظالمانہ کارروائیوں سے بنی نوع انسان کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔“ امریکہ کی بیمار سوچ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے انہوں نے کہا ”11 ستمبر کے واقعات اس لئے تاریخی اہمیت اختیار نہیں کر گئے کہ ان کی تباہ کاری کا حجم بہت زیادہ تھا بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا نشانہ کون بنا ہے۔ 1814ء میں واشنگٹن پر برطانوی بمباری کے بعد امریکہ پر پہلی دفعہ حملہ ہوا ہے۔ دو صدیوں میں امریکہ ہی دنیا بھر پر حملے کرتا اور مقامی آبادیوں کی ہلاکت میں ملوث رہا ہے۔ پہلی مرتبہ توپوں کا رخ اس کی طرف مڑا ہے۔ اب دنیا کو خود ان سوالوں کا جواب تلاش کرنا چاہیے کہ دہشت گردی کیا ہے؟ دہشت گردی کے خلاف جنگ کی نوعیت کیا ہے؟ اور انسانی بقاء کو کون سے خطرات لاحق ہیں؟“

پروفیسر چومسکی کی باتیں ایک ایسے شخص کی گواہی کا درجہ رکھتی ہیں جس نے امریکی تہذیب و سیاست کو بہت قریب سے دیکھا۔ اس کی علمی فضیلت اور اس کی ٹیکنالوجی کے معجزات کا مشاہدہ کیا اور پھر دو صدیوں پر محیط تاریخ میں اس کے کارناموں کو سامنے رکھتے ہوئے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ انہیں اپنی حق گوئی کی سزا بھی بھگتنا پڑی لیکن وہ اس رائے پر قائم رہے کہ اصل مسئلہ امریکہ کی سوچ کی کجی اور اس کی رعونت ہے۔ یہ بیماریاں ہر اس علم کا مقدر ہوتی ہیں جو دانش اور روشن ضمیری سے محروم ہوتا ہے۔ پروفیسر چومسکی نے پاکستانی دانشوروں کی اس بلند پایہ تحقیق سے اتفاق نہیں کیا کہ جو قوم سائنس اور ٹیکنالوجی کی بلندیوں کو نہیں چھوتی، اسے قومی غیرت و حمیت سے دستکش ہو کر امریکہ کے سیاسی حرم کی کنیریں بن جانا چاہیے۔ امریکی دانشور کا کہنا ہے کہ ”یہ کام بڑا آسان ہے کہ کچھ ملکوں کو چن لیا جائے اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر ان کا بھرکس نکال دیا جائے۔ عالمی پریس پر نظر ڈالے بغیر اس بات کا یقین کر لینا چاہیے کہ کوئی ان معاملات کو زیر بحث نہیں لائے گا۔“

آج بالکل یکساں ہو رہا ہے۔ امریکہ جس ملک کو چاہے دہشت گرد قرار دے ڈالے۔ جس کو

چاہے بھر کس نکال دے۔ کوئی اس سے سوال کرنے والا نہیں۔ افغانستان میں جو کچھ وہ کر رہا ہے اور مزار شریف کے قلعہ جنگلی میں اس کی رہنمائی میں انسانی خون سے جو ہولی کھیلی گئی وہ بربریت کا بدترین مظاہرہ ہے لیکن دنیا گنگ ہے۔ اقوام متحدہ گہری نیند سو رہی ہے۔ وہ ذرائع ابلاغ جو طالبان کے ”مظالم“ کی عکاسی پر کروڑوں ڈالر خرچ کر رہے تھے، مگر وہ امریکی چہرے کی پلاسٹک سرجری میں مصروف ہیں۔ عالمی برادری مطمئن ہے کہ مسلمان نشانہ بن رہے ہیں اور مسلمانوں کے فرمان روا اپنی اپنی مصلحتوں کی بکلی مارے بیٹھے ہیں۔

اس سناٹے میں دانشوروں کو ہی تاریخ کا قرض چکانا ہوگا۔ اگر وہ مظلوم کے خون ناحق سے نقش و نگار بنانے کی بجائے خدا کے لہجے میں بولنے والے ظالموں کی رعونت پر پیہم ضربیں لگاتے رہیں تو شاید ظلم اتنا معتبر نہ رہے۔

تھینک یو پروفیسر چومسکی! ممکن ہے آپ کا پیغام علم کے علمبردار کچھ انقلابیوں کی سوچ بدل ڈالے۔ اگرچہ پاکستان کی حد تک امکان کم ہی نظر آتا ہے۔ ختم اللہ علی قلوبہم۔

[29-11-2001]

خوں بہا

نہ جانے ہماری آنکھوں کو ابھی کیسے کیسے منظر دیکھنے ہیں؟

دوستم کے قلعہ جنگلی کامیدان لاشوں سے انا پڑا ہے۔ بے ڈھب، بے ڈھنگی، مزی تزی بے گورد کفن لاشیں، دور دور تک بکھرے انسانی اعضاء اور ان کے پتھوں بیچ قاتمانہ چال چلتا ہوا ایک دیو قاتمت شخص کہ جس کے چہرے پر سفاکی، بربریت اور درندگی خیمے گاڑے بیٹھی ہیں۔ اسے ایف پی کا نمائندہ لکھتا ہے۔ ”اس نے کمال غرور سے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ ایک قیدی نے میرے کمانڈر کو گر پینڈ مار کر ہلاک کر دیا جس کے بعد ہمیں انہیں قتل کرنا پڑا۔“ پر لے درجے کا دروغ گو دوستم نامی شخص کہ انسانیت کے ماتھے پر بد نما داغ جیسی شہرت کا حامل ہے، جو لوگوں کو اپنے سامنے ٹینکوں تلے روندنا اور زندہ لوگوں کی کھالیں اتارنے کے منظر سے لطف اٹھاتا ہے، بہت پہلے سے طے کر چکا تھا کہ طالبان یا ان کا ساتھ دینے والوں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑنا۔ نام نہاد صدر ربانی فتح کابل سے بھی پہلے فرمان جاری کر چکا تھا کہ ”سب کو معاف کر دو لیکن کسی پاکستانی اور عرب کو زندہ نہ چھوڑو۔“

”فاتح اعظم“ ڈونلڈ رمز فیلڈ اعلان کر چکا تھا کہ ”طالبان کا ساتھ دینے والے غیر ملکیوں کے لئے کوئی معافی نہیں۔ انہیں گرفتار کیا جائے گا یا وہ مار دیئے جائیں گے۔“ اور وہ مار دیئے گئے جبکہ امریکی فوجی موقعہ پر موجود گمرانی کر رہے تھے۔

قتدوڑ میں کئی دنوں تک آہنی عزم کے ساتھ امریکی بمباری اور شمالی اتحاد کی شدید گولہ باری کا مقابلہ کرنے والے یہ سخت جان لوگ بہر حال گوشت پوست کے انسان تھے۔ ان کی خوراک ختم ہو گئی۔ گولہ بارود ختم ہو گیا۔ ان کی بندوقیں لکڑی کی لاشیاں بن کر رہ گئیں۔ تب ان کے ساتھ رابطے ہوئے۔ معاہدے ہوئے۔ ضمانتیں دی گئیں۔ ان کے ہتھیار جمع کئے گئے۔ انہیں ٹرکوں میں بھر کر مزار شریف سے دس کلومیٹر دور مشہور قلعہ جنگلی لایا گیا۔ سینکڑوں ”خطرناک“ قیدیوں کے

ہاتھ اُن کی پشت کے پیچھے باندھ دیئے گئے۔ سینکڑوں مسلح محافظوں کا پہرہ لگایا گیا۔ قلعے کو چاروں طرف سے ٹینکوں اور بھاری توپوں سے گھیر لیا گیا۔ ایک ایک قیدی کی تلاشی لے کر انہیں قلعے کے تہہ خانے اور دوسرے حصوں میں ڈال دیا گیا۔ تب شمالی اتحاد کے سپاہیوں کے جلو میں سی آئی اے کے دو اہلکار نمودار ہوئے۔ اُن میں سے ایک جان مائیکل اپنی انگشت شہادت کے گرد پستول گھماتا آگے بڑھا۔ اس نے لمبی ڈاڑھی والے ایک غیر افغانی مجاہد سے تسخیر بھرے انداز میں سوال کیا۔

”تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟“

مجاہد نے شعلہ بار آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا اور بولا ”میں تمہیں ہلاک کرنے یہاں آیا تھا۔“

فاتح امریکی آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس نے پستول تانا اور مجاہد کا سینہ چھلنی کر دیا۔ قریب کھڑے دو اور طالبان بھی اس کا نشانہ بنے۔ باقی قیدی جھپٹے، اُسے دبوچ لیا اور اُس وقت چھوڑا جب اُس کی جان نکل گئی۔ دوسرا امریکی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اُس نے فوراً اپنی کمان کو خیر دی۔ قیدی مارٹر گنوں، کلاشنکوفوں اور مشین گنوں کا نشانہ بننے لگے۔ ”جنگ“ شروع ہو گئی۔ آنا فانا امریکی جیٹ طیارے فضا میں نمودار ہوئے۔ AG-130 غول در غول اُڑے۔ لیزر گائیڈڈ میزائلوں اور بموں کی بارش ہونے لگی۔ دقنوں دقنوں کے ساتھ 30 فضائی حملے ہوئے۔ اس دوران ٹینکوں اور توپوں کے دہانے بھی کھل گئے۔ قیدیوں کے اعضاء کٹ کٹ کر گرنے لگے اور قلعہ جنگی کا وسیع میدان اُن کے لہو سے رنگین ہو گیا۔ تین دن اور تین راتیں دو ستم کی سپاہ قتل و غارتگری میں مصروف رہی۔ جان مائیکل کے قتل کا انتقام لے لیا گیا۔

وہ 500 سو تھے یا 700 یا 1000 سب کے سب مارے گئے۔ آخری دو قیدیوں کے لئے ٹینکوں کے دو گولے خرچ کرنا پڑے۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندے نے کہا ہے کہ ”ہمیں قلعے کے مخصوص حصوں میں جانے کی اجازت نہیں۔ شمالی اتحاد کے سپاہی خود ہی طالبان کی لاشیں اور اُن کے اعضاء ٹرایوں میں ڈال کر باہر لا رہے ہیں۔ اب تک 150 ایسی لاشیں ملی ہیں جن کے ہاتھ مضبوطی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ اُن کی کوئی نہ کوئی شناخت کوئی نہ کوئی پہچان ہو جو ان کی قبروں پر لگا دی جائے۔ آخر ان کے ماں باپ ہیں بھائی بہنیں ہیں بیوی بچے ہیں۔“

قدحار کے نواح میں اترنے والے امریکی فوجی اپنے ساتھ امریکہ کا ایک بڑا سا پرچم لائے ہیں۔ اس پرچم پر ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حادثے میں ہلاک ہو جانے والوں کے عزیزوں کے دستخط ہیں۔ امریکیوں کا کہنا ہے کہ ”وہ افغانستان میں جہاں جہاں اپنے خیمے گاڑیں گے اُن پر ”بدلے“ کا نشان یہ پرچم لہرا کر مر جانے والے پیاروں کو خراج عقیدت پیش کریں گے۔ 11 ستمبر والے واقعہ کے بعد آج 30 نومبر آ گیا ہے لیکن یہ انصاف پسند ابھی تک نہ کوئی اس بارے میں رپورٹ پیش کر سکے ہیں اور نہ ہی ثبوت کہ ملزم یا مجرم افغانستان میں چھپے ہوئے ہیں یا پورا افغانستان مجرم ہے۔ قلعہ جنگلی میں اپنی جانوں سے گزر جانے والوں کے عزیزوں کو ہڈ سادینے والا بھی کوئی نہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ”مرنے والوں نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ آخر وہ ایک دوسرے ملک میں کیا لینے گئے تھے؟“ یہی سوالی جان مائیکل نے پوچھا تھا لیکن ان مائیکلوں اور ڈیوڈوں سے کون پوچھے کہ ”تم سات سمندر پار سے یہاں کیا لینے آئے ہو؟“

وہ 500 تھے یا 700 یا 1000 وہ پاکستانی تھے یا کشمیری، پنجابین تھے یا عرب۔ اُن کا خون انسانیت کا خون ہے۔ امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی سے بھی دو قدم آگے کی بربریت کا مظاہرہ کیا ہے۔ انسان کی معلوم تاریخ میں کسی قید خانے میں بند جنگی قیدیوں کو اس طرح کی برہنہ اور بے رحمانہ عارت گری کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ تختہ پل میں 160 طالبان کو قطار میں کھڑا کر کے سفاکانہ انداز میں قتل کر دیا گیا۔ 8 امریکیوں نے فلم ڈائریکٹر کی طرح ہدایات دیں اور سارے منظر کی عکس بندی کی۔ وہ یہ فلمیں اپنے بچوں کو دکھا کر اپنی شجاعت و بہادری کی داد وصول کریں گے۔ نہتے انسانوں کے قتل عام اور امریکہ کی درندگی سے بھی بڑا الیہ یہ ہے کہ دنیا خاموش ہے۔ دو ستم کے گھوڑوں کا ماتم کرنے والے بھی ہوں گے لیکن ایک مقصد کی لگن میں جان دینے والوں کے لئے دست دعا اٹھانا بھی لائق تعزیر ٹھہرا ہے۔

امریکہ سے آئے ہوئے جان مائیکل کا آہنسی تابوت بنے گا۔ یہ تابوت ستاروں والے رنگین امریکی پرچم میں لپٹا خصوصی طیارے میں امریکہ جائے گا۔ ہوائی اڈے پر اعلیٰ امریکی قیادت اس کا استقبال کرے گی۔ اُسے گارڈ آف آنر پیش کیا جائے گا۔ اس کے قہیدے کہے جائیں گے وہ ایک قومی ہیرو قرار پائے گا۔ لیکن سربریدہ بے گورڈ کنف لاشوں میں سے کسی کا نہ کوئی وطن ہے، نہ قوم، نہ پرچم نہ شناخت نہ پہچان، نہ کوئی دعویٰ نہ کوئی خون بہا۔

تمام شہر بکرم بس ایک مجرم میں
سو میرے بعد مرا خون بہا نہ مانگے کوئی

لیکن قلعہ جنگی کی زمین اتنی سنگلاخ بھی نہیں کہ معصوم لہو کی لاکھوں بوندوں میں سے ایک
اسامہ بھی جنم نہ لے سکے۔ وہ ضرور جنم لے گا اور اپنے یاروں کا خون بہا طلب کرے گا۔ نہ ملا تو
11 ستمبر جیسی ایک کاری ضرب لگائے گا اور جان مائیکل کا جواں سال بیٹا اپنی ماں سے پوچھے گا
”لوگ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟“

[29-11-2001]

کمزوری اور شہ زوری

امریکہ کی خود سری تو کوئی نئی بات نہیں۔ اس دن انتہاؤں کی چھوٹی ہوئی رعونت کا مزید اندازہ ہو گیا تھا جس دن جارج بوش نے زہر میں بچھے ہوئے لہجے میں کہا تھا کہ ”دنیا فیصلہ کر لے وہ ہمارے ساتھ ہے یا دہشت گردوں کے ساتھ“ تیسرا راستہ بند کر دینے کا مطلب یہی تھا کہ اپنی آزادی و خود مختاری امریکہ کی جھولی میں ڈال کر اس کے احکامات کی پیروی کی جائے یا پھر افغانستان بننے کیلئے تیار رہا جائے۔

پاکستان نے جن حالات میں جو فیصلہ کیا، اس کے منفی اور مثبت پہلوؤں پر دیر تک رائے زنی ہوتی رہے گی۔ اس فیصلے کے نتائج و اثرات سامنے آنے کے ساتھ ساتھ یہ اندازہ بھی ہوتا چلا جائے گا کہ ہم نے کس حد تک قوم و ملک کے مفادات کا تحفظ کیا ہے لیکن سردست یوں لگ رہا ہے جیسے امریکہ ہماری مصلحت آمیزی اور ”دوراندیشی“ سے شہ پاکر ناروا حرکتوں پر اتر آیا ہے۔ پے در پے ایسی خبریں آرہی ہیں جو ہماری کمزوری اور امریکہ کی شہ زوری کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کوئی تفصیل سامنے نہیں آرہی کہ ہمارے دو جوہری سائنس دانوں سلطان بشیر الدین محمود اور عبد المجید کا حقیقی جرم کیا ہے؟ وہ کیوں اور کس کے کہنے پر گرفتار ہوئے؟ کس ادارے کے زیر تفتیش ہیں اور ان پر کیا گزر رہی ہے؟ معروف امریکی اخبار ”نیویارک ٹائمز“ کی تازہ سٹوری کے مطابق پاکستان کے ان مایہ ناز فرزندوں کا تعلق ”انٹراکس“ سے جوڑا جا رہا ہے۔ ”امہ تعمیر نو“ نامی ادارے کے پلیٹ فارم سے تباہ حال افغانستان کی تعمیر نو کے لئے مقدر بھر کام کرنے والے ان افراد کے بارے میں امریکی اخبار بتاتا ہے کہ کابل میں ان کے دفتر سے ایسی دستاویزات ملی ہیں جن میں انٹراکس کے بطور ہتھیار استعمال کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ ایک برطانوی اخبار ”ایونگ سٹار“ میں بھی ایسی ہی خبر آئی ہے کاغذ کے ایک پرزے پر بنے ڈایا گرام سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ غباروں کے ذریعے کس طرح انٹراکس پھیلا یا جاسکتا ہے۔ آنے والے دنوں میں ہمیں

اپنے سینوں پر تمغہ امتیاز سجانے والے ان سائنس دانوں کے بارے میں کوئی سی خبر مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر کے دورہ ایران کا شوشہ بھی چھوڑا گیا ہے۔ نیویارک ٹائمز میں ہی جیمز وولز نے اور منصور اعجاز کا ایک آرٹیکل شائع ہوا ہے جس میں پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے بارے میں کئی خدشات کا اظہار کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ امریکہ کلوڈ سیرکٹ کیمروں اور دوسرے آلات کے ذریعے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر نظر رکھے اور ان کی موثر نگہداشت کا انتظام کرے۔ مضمون میں زیر حراست پاکستانی سائنس دانوں کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت القاعدہ اور دوسرے دہشت گردوں کے ہاتھ لگ سکتی ہے۔

ایک خبر یہ آئی ہے کہ بدھ کے روز شام ڈھلے 6 بجتر بند گاڑیوں پر سوار 20 برطانوی کمانڈوز افغان سرحد عبور کر کے ضلع چاغی کے گاؤں کلی صدیق میں گھس آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ سیٹلائٹ تصاویر کے ذریعے القاعدہ کے کچھ ارکان کو گاؤں میں داخل ہوتے دیکھا گیا ہے۔ کئی گھروں اور گردنواح کی تلاشی لینے کے بعد وہ واپس چلے گئے۔

ایک امریکن خاتون صحافی اس خیال سے دہلی سے اسلام آباد ایئر پورٹ آن اتری کہ اب کسی امریکی کو پاکستان کا ویزا لینے کی ضرورت نہیں۔ آج ہی ایک قومی اخبار نے خبر دی ہے کہ امریکی ادارے ایف بی آئی نے کراچی کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر ایک پوسٹ قائم کر لی ہے جس کا مقصد ملک سے باہر جانے والے پاکستانیوں پر نظر رکھنا ہے تاکہ امریکہ کو مطلوب کوئی دہشت گرد بیرون ملک نہ چلا جائے خبر کے مطابق ایف بی آئی کے اہلکار ایف آئی اے کے ساتھ مل کر پاسپورٹوں، تصاویر اور دیگر دستاویزات کا مشینی جائزہ لے رہے ہیں۔ ان کا سیٹلائٹ کے ذریعے امریکہ کے مرکزی ڈیٹا بیس کے ساتھ رابطہ ہے جس کی مدد سے طیارے میں سوار ہونے سے پہلے ہی ہر مسافر کا مکمل جائزہ لے لیا جاتا ہے۔ کئی دوسری انٹرنلٹز کی طرح پی آئی اے پر بھی پابندی لگائی جا چکی ہے کہ وہ اپنے مسافروں کی فہرست، جہاز فضا میں بلند ہوتے ہی الیکٹرانک ذرائع سے امریکہ روانہ کر دے۔ یہ خبر پہلے ہی اخبارات میں آچکی ہے کہ بحیرہ ہند میں موجود امریکی بحریہ پاکستان کی بندرگاہ سے جانے یا آنے والے ہر جہاز کی نگرانی کر رہی ہے اور تلاشی لے رہی ہے۔

ڈیورنڈ لائن پر باڑ لگانے کا منصوبہ اور دینی جماعتوں کے خلاف مجوزہ کارروائی بھی امریکی

ذہن کی اختراعات لگتی ہیں۔ قبل ازیں کئی تنظیمیں اور ٹرسٹ بھی امریکی دباؤ کے باعث نشانہ بن چکے ہیں جبکہ سعودی عرب، لبنان، شام، ایران اور عراق سمیت کئی ممالک حزب اللہ کے بارے میں امریکی مطالبہ مسترد کر چکے ہیں۔ ممکن ہے اسلام آباد میں افغانستان کا سفارتخانہ بند کرنے کا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہو لیکن ایک امریکی اہلکار کے الٹی میٹم کے بعد ہمیں اس فیصلے کا اعلان کچھ دن مؤخر کر دینا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں ہوا۔ پاکستان کی سر زمین پر کبھی اتنے امریکی اور برطانوی فوجی ان کے پیارے، ان کے بیٹی کا پیڑ، ان کے جاسوسی آلات اور دیگر متعلقات جمع نہیں رہے جتنے آج ہیں۔ فضاؤں میں گردش کرتے جاسوسی سیارے جو غاروں میں چھپے افراد اور کلائی پر بندھی گھڑی کا وقت بھی بتا سکتے ہیں اتنے باحیا اور پاکباز نہیں کہ ہماری عصمت شعار حساس تنصیبات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔

امریکی کولیشن میں شرکت کا فیصلہ ناگزیر تھا تو بھی ہمیں تھوڑی سی توانائی، تھوڑی سی آزادی اور تھوڑی سی خود مختاری کا تاثر ضرور دینا چاہیے ورنہ کچھ بھی نہیں بچے گا۔

[01-12-2001]

کشمیر کا ز

افغانستان میں دہشت گردی اور اس آگ کا ایندھن بننے والے طالبان کی راہ سے ہماری کیا کیلئے روشنی کی کوئی کرن پھوٹ نکلتی تو شاید دل کی بے گلی کو کچھ قرار آ جاتا، لیکن ایسا نظر نہیں آ رہا۔ ہم نے اپنے اہداف اور مفادات کی تخیلاتی جنت بسا رکھی ہے۔ افغانستان پر اترتی رات گہری ہوتی جا رہی ہے اور ہماری آنکھیں کسی ستارے کی جگنو کی تلاش میں بھٹک رہی ہیں۔ ہزار کوشش کے باوجود اندیشوں کی دھند چھٹنے میں نہیں آ رہی اور کشمیریوں کا لہو بے توقیر ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ بھارت میں امریکہ کے سفیر رابرٹ بلیک ول نے کہا ہے کہ ”جموں و کشمیر میں سرگرم دہشت گردوں کا تعلق القاعدہ اور طالبان سے ہے۔“ سعودی عرب کے ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ”دہشت گردی کے خلاف جنگ میں بھارت کے مفادات کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اٹلی جنس ایجنسیاں پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکی ہیں کہ کشمیر میں سرگرم دہشت گردوں کے تار القاعدہ اور طالبان سے جڑے ہیں۔ چونکہ ہم اس نیٹ ورک کو تباہ کرنے کے پابند ہیں اس لئے اس کا براہ راست فائدہ بھارت کو پہنچے گا“ دوسری طرف صدر بٹش کی مشیر کنڈولیز راٹس نے ہمیں صبر و تحمل کی تلقین کی ہے۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پیٹا گان کی پراسرار وارداتوں کے نامعلوم مجرموں کے تعاقب میں افغانستان کو کھنڈر بنانے اور ہزاروں انسانوں کو قلعوں میں بند کر کے وحشیانہ بمباری کرنے والے امریکہ کا کہنا ہے کہ پاکستان کشمیر کے 80 ہزار بیٹوں کی شہادت اور ہزاروں بیٹیوں کی عصمتوں کو بھول کر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے کیونکہ ”پاکستان اور بھارت کے درمیان دوستانہ تعلقات ہی سے خطے میں استحکام آئے گا“ صبح شام آدم بو، آدم بو پکارنے اور انسانی لہو سے اپنی رعوبت کا پیٹ بھرنے والے عرفیت کا خیال ہے کہ کشمیر کا مسئلہ صبر و تحمل اور پرامن مذاکرات ہی کے ذریعے حل ہوگا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی قانونی کمیٹی نے سال کے

آغاز میں ایک نیا قانون سامنے لانے والی ہے۔ جس میں دہشت گردی کا مفہوم اور حدود اور جرم طے کر دیا جائے گا۔ سامراج کے خلاف لڑی جانے والی تحریکوں اور دہشت گردی کے درمیان تمیز کے تصور کو زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہو رہی۔ کیونکہ لفظ ومعنی کے سارے اسلوب امریکہ میں تشکیل پا رہے ہیں اور کسی بھی عبارت کی وہی تعبیر معتبر ٹھہرے گی جس پر امریکہ کی مہر توثیق ثبت ہوگی۔ ایک دفعہ پہلے بھی اس نوع کی ایک قرارداد کو امریکہ نے ویٹو کر دیا تھا کیونکہ وہ اس وقت نیلسن منڈیلا کو حریت پسند ماننے کی بجائے دہشت گرد قرار دیتا تھا۔ آج کردار و عمل کا کوئی سا انداز رکھنے والا شخص، گروہ یا ملک اگر امریکہ کی نظر میں دہشت گرد ہے تو اس کو نیکو کاری کی سند دینے والا بھی دہشت گرد ٹھہرے گا۔ اسی لئے اقوام متحدہ کا مجوزہ قانون ان ممالک کو تکمیل ڈالنے کی کارسی اجازت نامہ ہوگا جو امریکہ کے نیورلڈ آرڈر کو اچھے نہیں لگتے۔ بھارت نے 11 ستمبر کے بعد سب سے بڑی سفارتی کامیابی یہی حاصل کی ہے کہ بارہ سال سے جاری تحریک حریت کشمیر کو عالمی کئبرے میں لاکھڑا کیا ہے۔ دو دن قبل اس نے ممبئی میں ایک مسلمان کو گرفتار کر کے اطلاع دی کہ یہ شخص طیارہ اغوا کر کے برطانوی دارالعوام کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی وزیر داخلہ ایڈوانی نے اعلان کیا کہ ”طالبان کی حکومت ختم ہونے کے باعث بھاری تعداد میں دہشت گرد پاکستان میں داخل ہو چکے ہیں“۔ روس کا پرانا نمک خوار رشید دوستم کہتا ہے کہ ”11 ستمبر سے بہت پہلے امریکہ، برطانیہ، روس، بھارت اور اسرائیل افغانستان پر حملہ کرنے کا پلان بنا چکے تھے۔“ یہ گٹھ جوڑ واضح طور پر اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کے مشترکہ مقاصد سے عبارت ہے۔ اسی ہفتے امریکی وزارت خارجہ کے ایک سینئر مشیر کے دورہ روس کے بارے میں شائع ہونے والی رپورٹ میں کہا گیا کہ ”انہوں نے دیگر امور کے علاوہ روسی حکام سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام اور کشمیر کے بارے میں تبادلہ خیال کیا“ یہ مژدہ پہلے ہی سنایا جا چکا ہے کہ 2002ء مسئلہ کشمیر کے حل کا سال ہوگا۔ دوستم نے اس بات کو تھوڑا اور آگے بڑھاتے ہوئے خبر دی ہے کہ ”افغانستان کا بحران حل ہو گیا ہے۔ اب مسئلہ کشمیر بھی حل ہو جائے گا لیکن آنے والا وقت پاکستان کے لئے نہایت ہی سنگین ہوگا کیونکہ پاکستان چاروں طرف گھیرے میں آچکا ہوگا“۔

بھارت کی تازہ کارروائیاں اندیشوں کی حدت اور شدت میں مزید اضافہ کر رہی ہیں۔ ظلم و

جبر کا کون سا ہتھیار تھا جو مقبوضہ کشمیر کے عوام پر نہیں آزمایا جا رہا تھا لیکن اب امریکی سپرین پرائیوٹ

کا ایک نیا ظالمانہ قانون نافذ ہوا ہے اور امریکہ ہی کے انداز انصاف سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے پہاڑی علاقوں، جنگلوں اور مشتبہ ٹھکانوں پر بمباری کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ گن شب بمبلی کا پٹر مسلسل فضاؤں میں رہتے ہیں اور آزادی کا نام لینے والوں کیلئے زمین و آسمان کی وسعتیں تنگ کر دی گئی ہیں۔ کشمیر کی تحریک آزادی کی ہموائی کا دم بھرنے والی تنظیموں کو پہلے ہی زنجیریں ڈالی جا چکی ہیں۔

حالات کے تیور اچھے نہیں لگتے۔ بھارت امریکی بربریت کی چھتری تلے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ روس کیلئے چیچنیا اور اسرائیل کے لئے فلسطین میں یہی طلسماتی چھتری بڑی مفید ثابت ہو رہی ہے۔ ہمارا ”کشمیر کا ز“ جلتی بلتی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ اس کے سر پر نہ کوئی چھتری ہے نہ چھاتہ۔ ہمارے تو اپنے گھروں کی چھتوں میں جانے کتنے چھید پڑ چکے ہیں۔ بے شرمی کی رت طویل ہوتی نظر آتی ہے اور کولیشن کا ہراول دستہ بن جانے کے باوجود لا حاصلی کے سوا ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوا۔

[03-12-2001]

نیاسورج

حامد کرزئی کا بل کا حکمران بن گیا ہے۔ یوٹس قانونی کی پولیس اور قاسم فیہم کی فوج سے خوفزدہ کرزئی نے کا بل داخل ہونے سے پہلے اس امر کو یقینی بنایا کہ برطانوی فوج کے کمانڈوز اس کی سکیورٹی کیلئے موجود ہوں۔ افغانستان کے امن کو غارتگری کا نشانہ بنانے والے احمد شاہ مسعود کی دیو قامت تصویر تلے حلف اٹھانے کے بعد کرزئی نے ایک آفتاب تازہ کے طلوع کی خبر دی۔

الاحضر ابراہیمی نے کہا کہ ”یہ افغانستان میں پرامن انتقال اقتدار کی واحد مثال ہے۔“ اس پرامن انتقال اقتدار کیلئے امریکی افواج کو اپنے بارود خانے میں موجود ہر نام اور ہر نسل کا بم استعمال کرنا پڑا۔ قدم قدم پر قتل سجانا پڑے۔ قلعہ جنگلی جیسی قتل گاہوں کا اہتمام کرنا پڑا۔ معصوم عورتوں اور بچوں کے پرچے اڑانا پڑے۔ افغانستان کی بنجر زمین میں لاکھوں بسوں کی پیڑی بونا پڑی۔ تیس لاکھ انسانوں کو گھروں سے نکالنا پڑا اور عین اس وقت جب جشن طرب کی تیاریاں ہو رہی تھیں، خوست کے نواح میں عمائدین کے پورے کارواں کو بھسم کرنا پڑا کہ ان میں کوئی ”القاعدہ“ نہ ہو۔ بلاشبہ ”پرامن انتقال اقتدار“ کی اس سے بہتر مثال پوری تاریخ کے دامن میں نہیں۔

اور وہ جنہوں نے افغانستان میں برسوں بعد ایک مرکزی نظم قائم کیا۔ ایک قانون اور ضابطہ جاری کیا۔ امن و عافیت کی ضمانت دی۔ شرافت اور انسانیت کی قدروں کا شعور دیا۔ جان و مال کے احترام کی رسم ڈالی، خواتین کی عفت و حرمت کے تصور کو عملی شکل دی، حکمران اور عام آدمی کے درمیان فاصلے معدوم کئے، منشیات کا قلع قمع کیا، محدود وسائل کے باوجود کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، وہ بے دخل کر دیئے گئے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ششہ انگریزی نہیں بولتے تھے۔ سروں پر بھاری عمامے رکھتے، لمبے کرتے اور کھلے گھیر والی شلواریں پہنتے، کندھوں پر چادریں ڈالتے لمبی ڈاڑھیاں رکھتے اور بات بات پر الحمد للہ کہتے تھے۔ وہ ایسے خود سر قبیلے کے

لوگ تھے کہ امریکہ کی قاہری کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ دنیا کی واحد سپر پاور کے اسلحہ خانے لبالب بھرے ہیں۔ ان کے میزائل صرف ہلاک نہیں کرتے، الاؤ میں ڈالی گئی خشک لکڑی کی طرح راکھ کر دیتے ہیں۔ ان کے جہازوں کی تیز نگاہی زمین پر ریگتے کیڑوں کوڑوں کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ دنیا کی کوئی شے ان کی قوت خرید سے باہر نہیں۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ پونے تین ماہ پر پھیلے طویل عرصے کا ہردن قیامت آفریں تھا۔ ہر لمحہ آتش بداماں تھا۔ دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ، اسلام آباد، کونستہ اور نیشاور کی اونچی مچانوں پر دور بینیں گاڑے بیٹھے رہے لیکن پورے افغانستان میں طالبان کی طرف سے باضابطہ طور پر ہتھیار ڈالنے کی ایک بھی رسمی تقریب کا ”روح پرور“ منظر عکس بند نہ کر سکے۔ نہتے اور بے سرو سامان طالبان نے اکیسویں صدی میں ایک ایسی تاریخ رقم کی ہے جو آنے والے ہر فرعون کے منہ کا ڈاکٹھ تلخ کرتی رہے گی۔ درندگی کے شرمناک مظاہروں نے امریکہ کے چہرے کی ایک ایک شکن نمایاں کر دی ہے۔ تو راہورا کے کوساروں کو بھی سرمہ بنا دینے والے امریکہ کی اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ عذاب اور کرب کی سولی پر لٹکا ہے۔ اب اس کے مسافر ننگے پاؤں ہوائی اڈوں میں داخل ہوتے ہیں اور ان کی خوابگا ہوں کے ریٹھی پردوں کی سرسراہٹ بھی اسامہ کی سرگوشی بن کر ان کی نیندیں حرام کر دیتی ہے۔ ذلت و رسوائی اور وحشت و بربریت کا ایک نیا عہد رقم کرنے کے باوجود امریکہ ساری مہذب دنیا کی نظروں میں ایک بے توقیر ملک ہے جس کی کتاب حیات روشن اصولوں، ارفع نظریات اور اعلیٰ انسانی اقدار سے محروم ہے۔

اور اسامہ بن لادن..... جانے وہ کہاں ہے؟ کس پہاڑ کی کونسی کھوہ میں حیات و زیت کی گھتیاں سلجھا رہا ہے۔ معلوم نہیں زندہ بھی ہے یا تو راہورا کی خاک کا حصہ بن چکا ہے۔ لیکن اخبارات نے بتایا ہے کہ اب وہ خوشبو بن کر ششے کی خوبصورت بوتلوں میں آن بسا ہے جو ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہیں۔ ملا عمر، کرزی کی کابینہ کارکن نہیں بن سکا لیکن بے ڈھنگے پہاڑوں کی بے ڈھب دادیوں میں گم ہو جانے والا یہ شخص کوہ قاف کا شہزادہ بن کر نہ جانے کتنے دلوں کی دھڑکنوں میں جا بسا ہے۔ کوہ قاف کی پراسرار مخلوق اور خوشبوؤں کو کون قتل کر سکتا ہے؟

رات، لندن میں قائم ایک ٹی وی چینل نے عجب منظر دکھایا۔ پارا چنار کے معرکے میں گولیوں کا نشانہ بن جانے والے ایک جوان سال عرب کی نماز جنازہ کا منظر، ہزاروں کا ہجوم، کلمہ

شہادت کا درد، فرط عقیدت سے اپنی تسلیجیں اس کے بے جان جسم سے مس کرتے ہوئے لوگ، اس کی برف جیسی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے ہونٹ، لہو روتی ہوئی آنکھیں۔

حامد کرزی کو کون بتائے کہ نئے سورج کسی بچہ سقہ کی ٹوپ سے نہیں، ان اہل جنوں کی روشن پیشانیوں سے پھوٹتے ہیں جن کی قبریں انہوں سے کوسوں دور اجنبی زمینوں پر بنتی اور جن کے ماتھے اجنبی لوگوں کے بوسوں سے منور ہوتے ہیں۔

[04-11-2001]

آئین نو

جب طاقت کا بے محابا استعمال اور برہنہ بربریت ہی دستور زندگی بن جائے اور انسانی حقوق کے گن گانے والی مہذب دنیا اسی کو اصول و ضابطہ قرار دے ڈالے تو پھر درندگی کو کام دینا ممکن نہیں رہتا۔ امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پیٹھا گان کے واقعات یقیناً افسوسناک تھے۔ ان میں ضائع ہونے والی جانیں بھی قیمتی تھیں اور ان کے پیاروں کا دکھ بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ واقعات کیوں ہوئے؟ ان کے محرکات کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟ ان کا ارتکاب کرنے والے کون تھے؟ وہ کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ ان میں سے کسی بھی سوال کا واضح جواب تلاش کئے بغیر امریکہ گالیوں کی بوچھاڑ کرتا نکلی تلوار لئے افغانستان پر ٹوٹ پڑا۔ اخلاق و تہذیب کے ہر قرینے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے پوری دنیا کو دھمکی دی۔ دوسو کے لگ بھگ ممالک کی اکثریت کو ہانکتا ہوا وہ اپنے سیاسی باڑے میں لے آیا۔ کچھ نے اپنی جان بچانے کے لئے اپنی گردنوں کے منکے ڈھیلے کر دیئے اور جنہیں اس وحشت کا ساتھ دیتے ہوئے شرم محسوس ہوئی وہ چپ سادھ کر دبک گئے۔ اقوام متحدہ نے وہی کردار ادا کیا جو بدست جاگیرداروں کے بے بس کارندے کیا کرتے تھے۔ امریکہ نے اسے اپنے دفاع کا حق استعمال کرنے کا نام دیا جیسے دنیا کا سب سے پسماندہ ملک دنیا کے سب سے طاقتور ملک کو فتح کرنے نکلا تھا۔ کسی کو اس ”آئین نو“ کے خلاف آواز اٹھانے اور احتجاج کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ قلعہ جنگلی جیسا شرمناک سانحہ بھی عالمی ضمیر پر ہلکی سی خراش تک نہ ڈال سکا۔ امریکہ کے اس نئے ضابطہ حیات نے خیر و شر کے نئے پیمانے متعارف کرائے۔ دوسری جنگی عظیم کے بعد سامراجی نظام پر ایک کاری ضرب لگی تھی۔ 1990ء میں سوویت یونین کی ٹھکست سے بھی سامراج کو بڑا دھچکا لگا لیکن 11 ستمبر کے بعد امریکہ کے مادر پدر آزاد، آئین نو، کے سامنے بے چارگی کا اظہار کرنے والی دنیا نے تھکے

ہوئے سامراج کوئی توانائی دی ہے۔ اسرائیل کو اندازہ ہو رہا تھا کہ آزاد فلسطینی ریاست کی اٹل حقیقت سے منہ موڑنا مشکل ہے۔ روس نے نڈھال ہو کر چیچنیا کے حریت پسندوں سے مذاکرات شروع کر دیئے تھے۔ بھارت کبھی جنگ بندی اور کبھی حریت کانفرنس سے بات چیت کے ذریعے یہ تاثر دے رہا تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں برسوں سے دہشت گردی کو کسی نہ کسی طور پر ٹھنڈا کرنا پڑے گا لیکن 17 اکتوبر کے بعد سارا منظر بدل گیا۔ افغانستان پر امریکہ کی بے رحمانہ اور یکطرفہ یلغار نے انسانی حقوق کو کھلنے اور آزادی کی منصفانہ تحریکوں کو قوت کے زور پر دبانے والی سامراجی ریاستوں کو نیا حوصلہ دیا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے طالبان تلاش کئے، اپنے اپنے اسامہ کو بہانہ بنایا، اپنی اپنی القاعدہ دریافت کی اور اپنے اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لئے سرگرم ہو گئے۔ سر سے پاؤں تک ایک غیر اخلاقی اور غیر اصولی مہم میں دھنسا ہوا امریکہ کسی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انسانیت کے ماتھے پر لگے ہر سیاہ داغ کو سفید قرار دے کر اپنے چہرے کی کالک چھپانے والا، وائٹ ہاؤس ایک نئی دنیا تخلیق کر چکا ہے۔

اسرائیل نے جو کچھ کیا اس پر کسی کو حیرت نہیں ہونی چاہئے۔ مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے سینے میں فولادی میخ گاڑنے والا امریکہ اور مغرب اس کی پشت پر ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز تک فلسطین کی پانچ لاکھ آبادی میں یہودیوں کی تعداد ساٹھ ہزار سے بھی کم تھی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران کم و بیش چار لاکھ یہودی فلسطین میں آباد کئے گئے۔ مقامی عرب باشندوں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ ان کی زمینیں چھینی گئیں۔ ان کے کاروبار لوٹے گئے۔ پچاس ہزار عرب کسانوں کو زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا اور 14 مئی 1948ء کو امریکی صدر ٹرومین نے فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا مشورہ سنایا۔ فلسطینی اپنے ہی وطن میں بے وطن ہو گئے۔ اس دن سے لے کر آج تک امریکہ اپنے اس ”لے پالک“ کی ناز برداریاں کر رہا ہے۔ وہ اسرائیل کے بارے میں اقوام متحدہ کی پچاس سے زائد قراردادوں کو دینو کر چکا ہے۔ ڈربین کانفرنس کے مندوبین نے اسرائیل کو نسل پرست قرار دینا چاہا تو امریکہ ناراض ہو گیا۔ وہ سالانہ پانچ بلین ڈالر کا وظیفہ اور لاتعداد اسلحہ اسرائیل کو دے رہا ہے۔

دو دن سے امریکی ساختہ گن، شپ، ہیلی کاپٹر اور جیٹ طیارے غزہ، رملہ اور دوسرے فلسطینی شہروں پر آگ برس رہے ہیں۔ اس کے نینگ گلیوں کو روند رہے ہیں۔ امریکہ اس وحشت و

بربریت پر توشیح کی مہر لگا چکا ہے۔ غزہ سے قندھار تک ایک ہی کہانی رقم ہو رہی ہے۔ امریکہ کے ایجاد کردہ آئین نو اور اسرائیل کی روشن مثال کے بعد بھارت اپنے طالبان اور اپنی القاعدہ کے خلاف دانت تیز کر رہا ہے۔ جلد ہی بھارت دہشت گردی کی ایک دو بھیا تک وارداتوں کی زد میں آئے گا۔ دنیا اس سے اظہار ہمدردی کرے گی۔ امریکہ اسے اپنے دفاع کا حق استعمال کرنے کا اذن دے گا۔ ہم ان واقعات کی شدید مذمت کریں گے۔ لیکن آتش فشاں سے پھوٹنے والے لاوے کا راستہ نہیں روک سکیں گے۔

[05-12-2001]

مصلحت کیشی کا درس

افغانستان میں ”افغان عوام کی تمناؤں اور آرزوں کے مطابق ایک آزاد، خود مختار، نمائندہ اور جمہوری حکومت“ کے قیام کیلئے دو محاذوں پر زبردست جدوجہد جاری ہے۔ ایک طرف تو پورے افغانستان کے کوچہ و بازار میں بمباری ہو رہی ہے جس کے نتیجے میں اسی فیصد زرعی رقبہ اور باغات سلگتی راکھ کا ڈھیر بن چکے ہیں اور دوسری طرف جرمی میں چند گروہوں کی مشکلیں کس کر انہیں ایک عوامی حکومت بنانے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ یہ معاملہ غیر متعلق ہے کہ کس معاہدے پر دستخط ہونے ہیں۔ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ کوئی گروہ بھی مال غنیمت پر مطمئن نہیں ہوگا۔ جرمی کے بیوٹی پارلر میں بننے سنورنے والی یہ دلہن کسی اڑن کھنولے پر بیٹھ کر کابل تک آ بھی گئی تو امکان ہے کہ رونمائی سے پہلے ہی بیوگی اس کا مقدر بن جائے گی۔ دارلارڈز اپنی اپنی سلطنتیں قائم کر چکے ہیں۔ ان کے کارندے لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ اقوام متحدہ نے بے بسی کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ مزار شریف میں اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتی۔ گذشتہ روز ایک انگریزی اخبار میں یہ رپورٹ پڑھ کر میں چہروں بے کل رہا کہ مزار شریف میں بعض تاجک والدین نے دستم کے سپاہیوں کی غنڈہ گردی سے عاجز آ کر اپنی جواں سال بیٹیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ نقابوں میں ڈھکے چہروں کی مظلومیت کا ماتم کرنے والے، لٹی عصمتوں کا تذکرہ اس لئے نہیں کر رہے کہ اس سے طالبان کے دور کے بارے میں اچھا تاثر ابھرتا ہے۔ اب جو بد امنی، ڈاکہ زنی، چوری، لوٹ مار، قتل و غارتگری اور عصمت دری کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو دیکھتے دیکھتے مثالی امن و امان کا گہوارہ ملک درندوں سے بھرا جنگل بن گیا ہے۔ لیکن امریکہ، اس کی کولیشن اور اس کولیشن کی معنوی اولاد خوش ہے کہ کچھ چہرے بے حجاب نظر آنے لگے ہیں اور فضاؤں میں مظلوموں کی چیخوں کے ساتھ ساتھ موسیقی کی مدھرتائیں بھی سنائی دینے لگی ہیں۔

کہانی دیر تک کہی جاتی رہے گی۔ ہیرو شیشا اور ناگاساکی کے ہیرو کی پرشکوہ داستان میں اب ”فتح افغانستان“ اور قلعہ جنگلی جیسی انصاف پروری کے سنہری باب بھی شامل ہو گئے ہیں۔ شمالی اتحاد کے سورماؤں کی شجاعت و بہادری کے قصے بھی جعفر و صادق کی حکایات دلیڈیر کو بھی آج و تاب بخشتے رہیں گے اور طالبان کی غریب و سادہ ورنگین داستان بھی فراموش نہیں کی جاسکے گی۔ آج افغانستان پر کروڑ میزائلوں اور ڈیزلی کڑنا می نیپام بموں کی برسات کو دو مہینے ہو گئے ہیں۔ 17 اکتوبر کو امریکہ نے جس اشتعال کے عالم میں زبردست عسکری قوت کے ساتھ افغانستان کا رخ کیا تھا، اس سے انداز ہوتا تھا کہ چوبیس گھنٹوں میں قصہ تمام ہو جائے گا لیکن جنوں کی آشفٹہ سری باقی ہے۔ زندگی اور موت کو ذرا مختلف پیمانوں سے جانچنے والے طالبان گردنیں کٹا رہے ہیں لیکن جھکانے کیلئے تیار نہیں۔ انہیں جنونی، کم عقل، ہٹ دھرم، ضدی، اجڈ، گمنوار اور نہ جانے کیا کیا کچھ کہا جا رہا ہے لیکن امریکہ جیسی جاہل و قاہر قوت کے سامنے کھڑا ہونے کیلئے حساب کے فارمولوں کی نہیں انہی صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ بندہ صحرائی اور مرد کہستانی جن قدروں کیلئے سرکٹانے پر آمادہ ہو جاتا ہے وہ لاہور، اسلام آباد اور کراچی کے مجلس نشینوں کے نزدیک ”حماقت“ کہلاتی ہیں۔

یہ بات مسلسل کہی جا رہی ہے کہ افغانستان پر ٹوٹنے والی اقتاد کی وجہ طالبان کی بے حکمتی ہے۔ یہ فتویٰ صادر کرنے والے دراصل یہ اعلان کرتے ہیں کہ امریکہ معصوم ہے۔ اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ طالبان اور مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں اس کا دل بانگ صاف ہے۔ قضیہ یہ ہے کہ جس طرح شجاعت و بہادری اور حماقت و دیوانگی میں بہت کم فاصلہ ہے اسی طرح حکمت و مصلحت اور بزدلی و بے حسیتی میں بھی بال برابر فرق ہے۔ انسان کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس وقت کون سی سرحد پار کر کے کس علاقے میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کا فیصلہ لوگ اور وقت کرتے ہیں۔ اگر کسی کے اندر کوئی ڈھیلے ڈھالے ایمان والا کمزور شخص سکڑا سمٹا بیٹھا ہو تو وہ اپنی آبرو پر حملے کو کھسیانی سی ہنسی میں تحلیل کر کے اسے حکمت اور مصلحت کا نام دے کر چپ ہو جائے گا۔ وہ ساری زندگی اس کی بھاری قیمت ادا کرتا رہے گا لیکن مطمئن ہوگا کہ بے آبرو ہونے کے باوجود اس نے ایک خطرناک لمحہ ٹال دیا۔ لمحہ ٹلتا کہاں ہے؟ وہ تو آسب کی طرح مرتے دم تک پچھتا کرتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی انسان کے سینے میں زندگی و بیدار دل ہے اور وہ ایمان و

یقین کی حرارت سے سرشار ہے تو وہ اپنی آبرو پر پہلی ضرب لگتے ہی پوری قوت کے ساتھ نیچا آزمائی کرے گا چاہے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مر جانے کے بعد اس کی زندگی کا ایک نیا سفر شروع ہوتا اور وہ ایک نئے انداز میں متعارف ہوتا ہے۔

ایک کمزور دل شخص چلا جا رہا تھا۔ ایک بدست غنڈہ اس کے پاس سے گزرا اور تفریح طبع کے طور پر اس کا گریبان پکڑ کر دو چار کلمے رسید کر دیئے۔ وہ بیچارہ زمین پر گر پڑا۔ چہرے سے پھوٹتا خون پونچھتا ہوا اٹھا۔ غنڈہ اسے گھورے جا رہا تھا۔ تماشبین جمع ہو گئے۔ کمزور دل شخص کو بلا وجہ، بلا سبب بے آبروئی کے احساس نے مشتعل کر دیا لیکن عین اسی لمحے مصلحت، حکمت اور دانائی کی پھوار اس کے غصے پر پڑی۔ اس نے غنڈے سے کہا:

”تم نے سنجیدگی سے مارا ہے یا مذاق کیا ہے؟“

غنڈہ تو غنڈہ گردی پر تلا کھڑا تھا تن کر بولا

”میں نے سنجیدگی سے مارا ہے“

مصلحت کیش شخص کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا ”پھر ٹھیک ہے ورنہ میں ایسا مذاق برداشت

نہیں کرتا“

ہمارے بعض دوستوں کا خیال ہے کہ طالبان بھی ایسی ہی مصلحت سے کام لیتے اور تاریخ میں آبرو مند قبیلوں میں نام لکھوانے کے بجائے چند سانسوں کیلئے غیرت و حمیت کا سودا کرنے والے بے تنگ و نام گروہوں کا حصہ بن جاتے۔

[06-12-2001]

شمالی اتحاد براستہ بون

ہمایوں اختر خان کی افطاری بھی کسی بون کانفرنس سے کم نہ تھی۔ ہر میز کے گرد کرسی نشین سیاستدانوں، دانشوروں اور اخبار نویسوں کا موضوع گفتگو افغانستان کے لئے تشکیل پانے والی نئی افغان حکومت تھی۔ ہمایوں کا افغانستان سے صدیوں پرانا رشتہ ہے۔ ان کے والد جنرل اختر عبد الرحمن نے جہاد افغانستان کی صورت گری کر کے اس رشتے کو نئی استواری بخشی۔ یہ وہ دن تھے جب جوان سال ہمایوں جہلم روڈ راو پینڈی کے گھر میں حکمت یار، ربانی، مجددی، محمدی، گیلانی، سیاف اور یونس خالص کو دیکھا کرتے تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ ایک افغان نوجوان کو بھی اکیلے میں جنرل اختر کے پاس آتے جاتے دیکھا۔ اٹھائیس تیس سال کی عمر کا یہ نوجوان خوبصورت انگریزی میں شستہ گفتگو کرتا۔ یہ نوجوان معروف معنوں میں مجاہد تو نہ تھا لیکن اچکنزی قبیلے کے مجاہدین کی عسکری اور مالی مدد کے لئے سرگرم رہتا تھا۔ اس کا نام حامد کرزئی تھا۔

اسلام آباد کے ایک بڑے ہوٹل میں مسلم لیگ کے ”شمالی اتحاد“ اور ”جدہ گروپ“ دونوں کے نمائندے موجود تھے اور وہ بھی جو بڑی باریک بینی سے سیاسی توازن کا جائزہ لے رہے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور چین سمیت متعدد ممالک کے سفرائے کرام بھی موجود تھے۔ وینڈی چیمبرلین رونق محفل بنی اس طرح اٹھلا رہی تھیں جیسے وہ اس تقریب کی میزبان یا مہمان خصوصی ہوں۔ وہ مسکراہٹیں بکھیرتی ایک سے دوسری میز کی طرف جاتیں تو اخبار نویسوں کا غول ان کے ساتھ ساتھ چلتا۔ حالات کے نئے تناظر میں امریکہ ہی کو سب کچھ سمجھ لینے والے سیاستکار محترمہ سے ہاتھ ملانے اور تصویر بنوانے کو ”حاصل عمر رواں“ سمجھتے ہوئے ٹوٹے پڑے تھے۔ یہ منظر 11 ستمبر کے بعد جنم لینے والے امریکہ اور پاکستان دونوں کی کہانی بیان کر رہا تھا۔

وینڈی چیمبرلین نے بون کانفرنس کے فیصلوں پر مسرت کا اظہار کیا لیکن صحافیوں کے اصرار

کے باوجود کشمیر کو "ایک مشکل سوال" قرار دے کر پہلو بچالیا۔ زمانے بھر کا "مشکل کشا" بن جانے والا امریکہ جب کشمیر کی طرف آتا ہے تو چپ سادھ لیتا ہے کہ اسے مزاج یار کی برہمی کا خطرہ ہے۔ میری گول میز کے ارد گرد بیٹھے سیاستدانوں نے صورتحال پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ جناب سرتاج عزیز کا کہنا تھا کہ شمالی اتحاد کی بالادستی مسائل پیدا کرے گی۔ جناب وسیم سجاد نے بھی شمالی اتحاد کو استحقاق سے زیادہ حصہ دینے کو نامناسب قرار دیا۔ جناب اعجاز الحق کا خیال تھا کہ افغانستان کے دینی تشخص کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے لبرل طبقے کی پذیرائی سے اچھے نتائج نہیں نکلیں گے۔ امریکی سفیر سے اپنی خوش پوشی کی داد پانے والے شیخ رشید احمد کا کہنا تھا کہ حامد کرزئی ظاہر شاہ اور شمالی اتحاد کے گرگوں کے مقابلے میں بہتر انتخاب ہے۔ جناب گل اورنگ زیب کا خیال تھا کہ افغانستان کے بارے میں ہر معاہدہ بعد میں پھاڑ دینے کے لئے لکھا جاتا ہے۔ یون کافر نس کو "کامیابی" سے ہمکنار کرنے کے لئے امریکہ نے بڑے پاڑے پیلے۔ صدر برہان الدین ربانی قابو میں نہیں آرہے تھے۔ صدر جارج بوش کے افغان نژاد معاون خصوصی زلمے خاں نے اس سلسلے میں خصوصی کردار ادا کیا۔ انہوں نے براہ راست ربانی کو فون کر کے سنگین نتائج دھمکی دی اور کہا کہ کافر نس کے فیصلوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اسمعیل خان، رشید دوستم اور کریم خیل کے ذریعے بھی پیغام رسانی کی گئی۔ روس اور بھارت بھی استعمال کیا گیا۔ کوئی راستہ باقی نہ رہا تو ربانی موم پڑ گئے یوں نیا افغان سیٹ اپ جہاد اسلام کی ہر علامت سے پاک کر دیا گیا۔

جرمنی کے شہر یون میں "افغان عوام کی مرضی و منشا کے عین مطابق" تشکیل پانے والی غیر حکومت کے تیس ارکان میں سے انیس کا تعلق شمالی اتحاد (یونائیٹڈ فرنٹ) سے ہے۔ یوں کم پینسٹھ فیصد حصہ از بکوں، تاجکوں اور ہزاروں کو ملا ہے۔ دفاع، داخلہ اور خارجہ امور کی وزارت بدستور فہیم، قانونی اور پاکستان کو ایٹم بم سے اڑا دینے کا مطالبہ کرنے والے عبداللہ کے رہیں گی۔ پانچ نائب وزرائے اعظم میں سے تین کا تعلق شمالی اتحاد سے ہے۔ یوں جو شمالی امریکہ کے عسکری چھاتے تلے کابل میں داخل ہوا تھا اس نے اب یون کی سفارتی چھتری اپنے آپ کو جائز قابض کا درجہ دلوا لیا ہے۔ پولو کی قبیلے کا سردار حامد کرزئی امریکہ کا ہے۔ بھارت سے انٹرنیشنل ریلینشز میں ایم اے پاس کرنے والے کرزئی کے امریکہ

کی نوعیت خاصی گہری ہے۔ ان کے بھائی شکاگو، سان فرانسکو، بوٹن اور ہالٹی مور میں ”بلمند ریسنورنٹس“ کے نام سے افغانی کھانوں کی ایک چین چلاتے ہیں۔ ان کی وزارت عظمیٰ کے لئے سب سے زیادہ دباؤ امریکہ نے ڈالا۔ ملا عمر کے علاقے کا رہنے والا کرزئی انگریزی زبان پر دسترس اور لبرل خیالات کی وجہ سے مغرب کو عزیز ہے۔ امریکہ نے یہ سارا کھیل ”اقوام متحدہ“ کا نقاب پہن کر کھیلا۔

پاکستان کے حامد کرزئی سے اچھے مراسم ہیں کیونکہ وہ ایک عرصے سے کوئٹہ میں مقیم ہے اور متعلقہ ادارے اسے 1980ء کی دہائی سے جانتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ حامد کرزئی کس قدر اختیار و اقتدار کا مالک ہے؟ ابھی تو 22 دسمبر بھی صدیوں کی مسافت پر کھڑا ہے۔ یون کے قافلے کو کابل تک پہنچنے میں کافی وقت لگے گا۔ ربانی کی کرسی پر حامد کرزئی بیٹھ گئے تو بھی اصل حکمرانی شمالی اتحاد کے ہاتھ میں رہے گی جو یون کانفرنس کے بعد زیادہ معتبر اور زیادہ مقتدر ہو گیا ہے۔

[07-12-2001]

نئے تماشاگر

افغانستان کو تماشا بنانے والے بازیگروں اور تماشا بننے والی کٹھ چلیوں کو شاید اندازہ نہیں کہ آنے والے دنوں میں کیا کھیل شروع ہونے والا ہے اور افغانستان کس طرح امریکی مفادات کی بازی گاہ بننے والا ہے۔

یہ بات تو پہلے ہی کہی جا چکی ہے کہ بون کے یوٹی پارلر سے اپنے نین نقش تیار کرانے والی لہن شاید رونمائی سے پہلے ہی بیوگی کا زخم کھا بیٹھے کہ شاخ نازک پہ بننے والا ایشیا ناپائیدار ہوتا ہے۔ زخمی ”نامزدوزیر اعظم“ قندھار کے نواح میں بیچ و تاب کھار رہا ہے۔ دریائے ارغنداب کے کنارے کس نوع کی تاریخ رقم ہوتی ہے اور اس شہر کم نصیب میں محو خواب احمد شاہ ابدالی کو کیا کچھ دیکھنا پڑتا ہے اس کا اندازہ بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ فی الحال امریکہ خوش ہے کہ اس کی شہریت کا حامل ایک شخص تخت کا بل کے لئے نامزد کر دیا گیا ہے لیکن وہ افغانوں کے مزاج سے عدم واقفیت کے باعث یہ نہیں جانتا کہ.....

ہزاروں لغزشیں حامل ہیں لب تک جام آنے میں

بون معاہدے پر دستخط ہونے کے فوراً بعد ہی شمالی اتحاد کی چولیس بلنے لگی ہیں۔ یوں دکھائی دیتا ہے جیسے کسی بھی وقت افغانستان میں ایک خونی تصادم شروع ہو سکتا ہے۔ جمعرات کے روز رشید دو ستم نے قندوز میں موجود ازبک فوجی دستوں کو شہر خالی کر کے مزار شریف جمع ہونے کا حکم دیا جس کے ساتھ ہی تاجک دھڑے کے جنرل آصف دلاور، جنرل داؤد اور جنرل عظیمی کے دستوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں۔ اس وقت تک شہران کے کنٹرول میں آچکا ہوگا۔ دو ستم نے حامد کرزی کے قلعے پر پہلا پتھر پھینک کر یہ اشارہ دے دیا کہ مصنوعی جوڑ لگانے اور زبردستی کی بیوند کاری سے کوئی مفید نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا۔ بون میں تشکیل پانے والی عبوری حکومت کے بائیکاٹ کا

اعلان کرتے ہوئے دو ستم نے کہا کہ کرزئی اپنی نام نہاد حکومت کا دائرہ شمالی علاقوں تک پھیلانے کی کوشش نہ کرے۔ دو ستم نے کہا کہ جب تک ایک صحیح اور نمائندہ حکومت قائم نہیں ہو جاتی، ہم کاہل نہیں جائیں گے اور نہ ہی کسی کو مزار شریف آنے کی اجازت دیں گے۔ دو ستم کے حلقوں نے کہا ہے کہ تین اہم وزارتوں کے لئے پہلے ہی مفاہمت ہو چکی تھی جس کے مطابق وزارت خارجہ ازبک دھڑے یعنی دو ستم کی پارٹی ”جنبش ملی“ کو دینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ وزارت داخلہ ہزارہ جات پر قابض کریم خلیل کی جماعت حزب وحدت کے حصے میں آنا تھی اور وزارت دفاع پر برہان الدین ربانی کی جماعت جمعیت اسلامی کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ اگر ربانی کو صدر کے عہدے پر قائم رہنے دیا جاتا تو وہ کم از کم وزارت خارجہ اور ممکن ہے وزارت داخلہ سے بھی دستبردار ہو جاتے۔ انہوں نے امریکیوں کو اس کا واضح عندیہ دے دیا تھا لیکن ادھر سے اصرار تھا کہ حامد کرزئی کو بہر طور آگے لانا ہے۔ حامد کرزئی کی کوالیفیکیشن یہ ہے کہ وہ اپنے پانچ بھائیوں سمیت امریکی شہریت رکھتے ہیں۔ 1980ء کے بعد سے ان کا سی آئی سے خصوصی رابطہ ہے۔ پاکستان میں ان کی سب سے گہری دوستی محمود خان اچکزئی سے ہے جو بھارت کے بارے میں خاصا نرم بلکہ دوستانہ رویہ رکھتے ہیں اور یہی حال حامد کرزئی کا بھی ہے جو حصول تعلیم کے لئے طویل عرصہ بھارت میں رہے۔ وہ کونڈہ میں اپنے والد کے قتل کا الزام بھی پاکستانی اسٹیبلشمنٹ پر لگاتے ہیں۔ جب امریکہ نے ربانی کو زوج کر دیا تو ان کی طرف سے تینوں اہم عہدوں کے لئے اصرار بڑھ گیا۔ کاہل پر قابض ہونے کے ناتے انہیں نظر انداز کرنا مشکل تھا۔ یوں تین بیخ شیری تاجک تین اہم اور مرکزی عہدوں پر قابض ہو گئے۔ تینوں کا تعلق برہان الدین ربانی کی جمعیت اسلامی سے ہے کیونکہ احمد شاہ مسعود کی شورشوں کے نظار عملاً جمعیت میں ہی تخلیل ہو چکی ہے۔

بونی حکومت کی کامیابی کا انحصار حکومت میں شامل عناصر سے زیادہ حکومت سے باہر رہ جانے والے ناراض عناصر کے رویے پر ہے۔ حزب اسلامی کے سربراہ گلبدین حکمت یار نے مجوزہ حکومت کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور کہا ہے کہ بون کانفرنس میں زبردستی فیصلے کرائے گئے اور طاقت کا توازن چند اقلیتی قوتوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ پیر سید احمد گیلانی نے اسے ایک غیر متوازن حکومت قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ وہی حکومت ہے جو 1996ء تک ربانی کی صدارت میں قائم تھی۔ پروفیسر صبغت اللہ مجددی نے اسے بیرونی دباؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ پروفیسر سیاف، حاجی

قدیر، یونس خالص، محمدی اور اسماعیل خان بھی نئے سیٹ اپ سے خارج ہیں۔ سوطالبان کا افغانستان درجنوں افغانستانوں میں بٹ رہا ہے۔ پلیٹ میں آراستہ کیک کے ٹکڑے کٹ رہے ہیں۔ تماشا جاری ہے۔

حامد کرزی کا بل تک آ گیا تو اسے جنرل فہیم کی فوج اور یونس قانونی کی پولیس کے کٹہرے میں رہنا ہوگا۔ شہر بیخ شیری تاجکوں کے عسکری تسلط تلے سانس لے گا اور اقوام متحدہ کی تائید یافتہ فوج کچھ نہیں کر پائے گی۔ 18 رمضان المبارک 1993ء کو ایک معاہدے کی توثیق خانہ کعبہ کی مقدس دیواروں تلے ہوئی تھی لیکن وہ معاہدہ عید الفطر منائے بغیر فوت ہو گیا۔ 8 سال بعد 18 رمضان المبارک 2001ء کو یون میں ہونے والا معاہدہ بھی بن کھلے مرجھا جائے گا۔ 8 سال قبل بھی ربانی صدر تھے۔ آج بھی صدارت کی کرسی پر براجمان ہیں۔ تب بھی دارلارڈز نے سن مانی کی تھی اور آج بھی وہ دارلارڈز اپنا سکہ جمانے کا تہیہ کئے بیٹھے ہیں۔ عوامی امنگوں کی ترجمان حکومت کا سورج سامراجی مفادات کے افق سے نہیں، افغانستان کی گھائیوں سے طلوع ہوگا۔ تماشا گر بدل جانے سے تماشا کی نوعیت نہیں بدل جاتی۔

[08-12-2001] www.KitaboSunnat.com

وہ مرد جری!

قتدھار سے کیسے بھول پائے گا؟

www.KitaboSunnat.com

ملا عمر کا افغانستان اب حامد کرزئی، رشید دوستم، حاجی قدیر، اسماعیل خان، کریم خلیلی، قاسم فہیم، جنرل داؤد اور گل آغا کا افغانستان بن چکا ہے۔ امریکہ اور مغرب کے دل میں کانٹے کی طرح کھلنے والا شخص اب کلی طور پر بے دخل کر دیا گیا ہے۔ جب سردی کی شدت بڑھ جاتی ہے اور پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکنے لگتی ہیں تو افغانی اپنے بال بچوں اور بھڑ بھڑیوں کو لے کر میدانوں میں اتر آتے ہیں لیکن قتدھار کا بوریا نشیں، موسم سرما کی ایک سردرات، کلاشکوف کندھے سے لٹکائے، کبل لپیٹے قتدھار سے برف پوش پہاڑوں کی طرف نکل گیا۔ وہ افغانستان کا ایسا فرما نرہ تھا جس کے اشارہ ابرو کو حکم کا درجہ حاصل تھا۔ جس کا سکہ قندوز اور مزار شریف سے لیکر جلال آباد، ہرات اور قندھار تک یکساں قیمت رکھتا تھا۔ وہ پانچ سال سے زائد عرصے تک سیاہ و سفید کا مالک رہا۔ وہ ریاست کا سربراہ بھی تھا اور حکومت کا چیف ایگزیکٹو بھی۔ وہ فوج کا سپہ سالار اعظم بھی تھا اور شورائے عالی کا امام بھی۔ وہ رئیس الجاہدین بھی تھا اور امیر المؤمنین بھی لیکن وہ گیا ہے تو اس کے خون کے پیاسوں کے پاس کوئی ایک افسانہ بھی نہیں کہ وہ حاشیے چڑھا کر اس کی کردار کشی کر سکیں۔ اگر مغربی میڈیا ملا عمر کے حرم سے کوئی ایک "مانیکا" بھی دریافت کر سکتا تو آج اس کے عشرت کدوں کی با تصویر حکایتیں ٹی وی سکرینوں کی زینت ہوتیں۔ وہ گیا ہے تو اس کے بارے میں ادنیٰ سی کرپشن کا بھی کوئی قصہ نہیں۔ بیت المال کے ناجائز استعمال کی کوئی کہانی نہیں۔ اقربا پروری کی کوئی داستان نہیں۔ اس کے کردار کی اعلیٰ قبا پر کوئی ایک بھی داغ نہیں۔ اپنی پیشانی پر اللہ تعالیٰ کی سجدہ گزاری کا نورانی داغ سجائے وہ اپنے جانثاروں کے ساتھ پہاڑوں کو نکلا تو قتدھار گہری نیند سو رہا تھا۔ رات کی تاریکیوں میں میلوں دور تک ہر جنبش پر نظر رکھنے والی امریکی

سپاہ صحرا میں دور بینیں گاڑے بیٹھی رہی۔ زمین پر ہر ذی روح کی ذرا سی حرکت پکڑ لینے والے سیاروں کو اونگھ آگئی۔ گل آغا کی خونی سپاہ کے چوکس پہریدار اسے دیکھ نہ سکے۔ ساری دینا میں طوفان پھا کر دینے والا مردوروش ہوا کے لطیف جھونکے کی طرح ایک ایک نہ جانے کہاں چلا گیا۔

کچھ کہتے ہیں کہ نہیں وہ ابھی قندھار میں ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ ممکن ہے پختون دلی کی پرانی روایت کے تحت اس کے قبیلے نے اسے پناہ میں لے لیا ہو۔ ممکن ہے حامد کرزئی یا گل آغا کا کوئی سپاہی اس کے سر کا سودا کر لے۔ زمانے بھر کے تیروں کا رخ اس کے کشادہ سینے کی طرف ہے۔ امریکہ کے نزدیک وہ ایک بڑا شخص ہے۔ رسوائے زمانہ دہشت گرد ہے۔ دہشت گردوں کو پناہ دینے والے مافیا کا سرغنہ ہے۔ ہزاروں انسانوں کا لہو پینے کے باوجود امریکی کولیشن کی پیاس نہیں بجھی۔ اسے ملا عمر اور سامہ کالہو چاہئے۔ بون معاہدے کی کوکھ سے جنم لینے والی بونی حکومت کا بونا وزیر اعظم عام معافی کا اعلان کرنے کے بعد اپنا تھوکا چاٹ رہا ہے کہ اس کے آقائے ڈانٹ پلا دی ہے۔ چھین اسلامی ممالک میں سے کسی کا اس اجنبی شخص سے دور پارا رشتہ بھی نہیں۔ دلوں کو دوخت کرنے والی یہ خبر کسی بھی وقت آسکتی ہے کہ ملا عمر قتل ہو گیا۔ عالمی میڈیا اس دہشت گرد کی ہلاکت کو انسانی تہذیب و تمدن اور مہذب دنیا کی عظیم فتح قرار دے گا اور جارج بش اسے اکیسیویں صدی کی سب سے بڑی کامرانی سمجھ کر امریکی تاج کا نگینہ بنا لے گا۔ لیکن کشادہ سینے اور اونچے ماتھے والا بلند قامت شخص سو و زیاں سے آگے نکل چکا ہے۔ وہ افغانستان کا حکمران نہیں رہا لیکن اس کی حکمرانی کتنے برا عظموں پر محیط ہوگئی ہے۔ قندھار یقیناً اس کا ہے۔ اب سیاہ چادر اوڑھے ایک شخص، رات گئے کسی بستی میں گھومتا اور اپنے عوام کو پرسکون نیند کا مژدہ سنانا دکھائی نہیں دے گا۔ اب قندھار کا گورنر ملا حسن رحمانی لاشی نیکیٹا فٹ پاتھوں کی خاک چھامتا نظر نہیں آئے گا۔ اب سرشام گھروں کے دروازے بند ہو جایا کریں گے کہ گلیاں انسانوں سے خالی ہوگئی ہیں اور درندوں سے بھر گئی ہیں۔ اب جواں سال بیٹیوں کے والدین کبھی بیٹھی نیند نہیں سو سکیں گے۔

ملا عمر پہاڑوں میں جا کر ایک نئی دہشت کا روپ دھار لے یا ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے۔ وہ لمبی عمر پائے یا بہت جلد اپنی جان کا قرض چکا دے، یہ باتیں اب بے معنی ہو چکی ہیں۔ اس کے پاس نہ ایٹم بم تھا نہ میزائل نہ ایف 16 نہ جدید تربیت یافتہ فوج، اس کے باوجود وہ دو ماہ تک وقت کے فرعون اور اس کے چیلوں کے سامنے ڈنارہا۔ اس نے جس کو پناہ دی اس کے لئے

اپنی فرمانروائی تک قربان کر دی۔ اقتدار کی چند ساعتوں، کچھ مہینوں یا دو چار سالوں کے لئے اپنا سب کچھ ڈھیر کر دینے والوں کی اس دنیا میں اس نے ایک نظریے، ایک اصول اور ایک عہد کے لئے حکمرانی کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی جتنی وہ اپنے کندھے پر پڑی چادر کو دیتا ہے۔ اس نے نہ ہتھیار ڈالے نہ امریکوں سے پناہ مانگی۔ اقتدار اپنے رفقا اور بزرگوں کے حوالے کیا اور اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

کل کا مورخ جب اکیسویں صدی کی اس عالمی جنگ کا تذکرہ کرے گا تو ایسے بہت سے ناموں کو قلم کے ایکسٹرا کی طرح فالتو سمجھ کر نظر انداز کر دے گا جو آج کے ہیروز ہیں لیکن آج کا ولن، صدیوں تک تاریخ کی پیشانی کا جھومر بنا رہے گا۔ داغ داغ پیشانیوں والے بونے، اہل جنوں کے اس قافلے کی دھول بن جائیں گے۔ جس کے سالار کے ماتھے پر صرف ایک بارگاہ کے حضور سجدے کا داغ چودھویں کے چاند کی طرح دمک رہا ہوگا۔

حراماں نصیب قندھار اس مرد جبری کو کیسے بھول پائے گا؟

شہر بے رنگ ترے لوگ گواہی دیں گے
ہم سے خوش رنگ بھی تیرے خس و خاشاک میں تھے

[09-12-2001]

سردیوں کی طویل رات

ملا عمر کا قندھار عجیب آشوب میں ہے۔ زندگی سہمی ہوئی ہے اور بند دروازوں کی درزوں سے جھانکتی وحشت زدہ آنکھیں گلی کوچوں میں وہی منظر دیکھ رہی ہیں جو 1994ء میں طالبان کی آمد سے پہلے یہاں کے کوچہ و بازار کا مقدر بن گیا تھا۔ تب ملا نقیب اللہ قندھار کے کور کمانڈر اور گل آغا گورنر تھے۔ ملا نقیب اللہ نے حاجی بشر اور بعض دوسرے مجاہدین کمانڈروں سے مل کر طے کیا کہ طالبان ایک نیک مقصد کے لئے اٹھے ہیں اس لئے ان سے تعاون کرنا چاہیے۔ قندھار کے گورنر کو نظر انداز کر دیا گیا اور یوں قندھار خود بخود طالبان کے قدموں تلے بچھ گیا۔ اس کے بعد پے در پے معرکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ طالبان، ہرات اور کابل سے ہوتے ہوئے ہزار شریف تک جا پہنچے لیکن ملا عمر نے قندھار کا حجرہ نہ چھوڑا۔ ملا نقیب اللہ نے جس گرجبوشی سے طالبان کو خوش آمدید کہا تھا ملا عمر نے اسے احسان مندی کے جذبے کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھا۔ پیشکش کے باوجود ملا نقیب اللہ نے کوئی عہدہ قبول نہ کیا لیکن طالبان نے اس کی قدر و منزلت میں کمی نہ آنے دی۔ جب ملا عمر کی کابینہ اور شوروی نے شہر خالی کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تو طے پایا کہ قندھار، گل آغا شیر زئی اور حامد کر زئی کے حوالے کرنے کے بجائے یہ امانت نقیب اللہ کے سپرد کر دی جائے۔ شہر کے بڑوں کا اجلاس طلب کیا گیا، مذاکرات ہوئے، معاملات طے پائے اور طالبان شہر کی کنجی ملا نقیب اللہ اور حاجی بشر کے حوالے کر کے پہاڑوں کی طرف نکل گئے۔

گل آغا شیر زئی دو ہفتوں سے بیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کے دستے قندھار ائر پورٹ کے آس پاس بیٹھے امریکن طیاروں کی کارپٹ بمگ کا تماشہ دیکھتے رہے لیکن پشتمندی کی جرات نہ کر سکے۔ حامد کر زئی فصیل شہر کے نزدیک تک نہ جاسکا۔ امریکہ کی بہادر فوج ایک سوکلو میٹر دور ایک صحرا میں خیمہ نشین رہی کہ طالبان کا دو بدوسا منا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ 17 اکتوبر سے لے کر آج

تک کسی مقام پر بھی امریکی یا برطانوی دستوں نے طالبان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرأت نہیں کی۔ کرائے کے مقامی میر جعفروں اور میر صادقوں کو بھی اس وقت پیش قدمی کا حوصلہ ہوتا جب شدید بمباری سے طالبان خاک و خون میں نہا چکے ہوتے یا پھر خود ہی شہر خالی کر کے چلے گئے ہوتے۔ قندھار میں بھی یہی کچھ ہوا۔ شمالی اتحاد، حامد کرزئی یا گل آغا شیرزئی کسی کو بھی شیر کی کچھار میں جھانکنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ ملا عمر نے تین ہفتے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جب ضرورت پڑی ہم سارے شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے جائیں گے۔ قندھار خالی کرنے کا اصولی فیصلہ ہفتہ بھر قبل ہو گیا تھا اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے اقدامات بھی شروع ہو گئے تھے۔ ملا نقیب اللہ اور حاجی بشر کو بھی اس منصوبے سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ طالبان نے عہدگی کے ساتھ منصوبہ بنایا اور امریکن کولیشن کو آخری معرکہ سر کرنے کی خوشی اور سرشاری سے محروم کر دیا۔ امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رامزفیلڈ نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا ہے کہ ”قندھار پر قبضے کو ہماری حقیقی فتح قرار دیا جاسکتا ہے۔“

امریکہ کی محرومیوں کا دائرہ ابھی مزید پھیلے گا۔ ابھی ان کے ”بیرک کارمل“ کو تخت کا بل پر براجمان ہونے میں بھی خاصا وقت لگے گا۔ ابھی تو ملا عمر سے محروم ہو جانے والے قندھار کی آگ ہی بجھنے نہیں پا رہی۔ طالبان تو جا چکے لیکن گلی گلی مورچے لگے ہیں۔ قبائلی بزرگوں کا اجلاس کوشش کے باوجود اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر پایا۔ گل آغا شیرزئی نے قندھار کے گورنر ہاؤس پر قبضہ کر لیا ہے۔ قندھار کا ہوائی اڈہ اور تختہ پل پہلے ہی اس کے قبضے میں ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ملا نقیب اور حاجی بشر کے ساتھ طالبان کے کسی معاہدے کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ تو خود طالبان ہیں۔ ملا نقیب اللہ نے کور کمانڈر کے دفتر اور شہر کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا ہے۔ کمانڈر احمد اخوندزادہ اور حبیب اللہ، چھاؤنی کے ایک حصے پر قابض ہو گئے ہیں۔ حبیب اللہ نے چالیس ٹینکوں سمیت بھاری اسلحہ کی بڑی کھیپ پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ کئی اور سابق کمانڈر خالی سرکاری عمارتوں اور تنصیبات پر قبضے کر رہے ہیں۔ ہلمند پر گل بدین حکمت یار کے ایک کمانڈر فیض اللہ نے گورنر ہاؤس پر قبضہ جمالیا ہے۔ ملا شیر محمد اور ملا عطاء محمد اسے بے دخل کرنے کے لئے قوت آزمائی کر رہے ہیں۔ قندھار شہر لاقانونیت کی گرفت میں ہے۔ ہر طرف لوٹ مار جاری ہے۔ قندھار ہرات روڈ پوری طرح لیبروں، راہزنوں اور ڈاکوؤں کے زعمے میں ہے۔ وہ سارے قانون شکن اور غنڈہ

عناصر سامنے آگئے ہیں جو طالبان کی کڑی سزاؤں کے ڈر سے سات سال تک زیر زمین رہے۔ ڈوئلڈ رمز فیلڈ نے یہ رونا بھی رویا ہے کہ ان کی فوج ہمت ہارتھی ہے۔ ایک اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ”قبائلی سیاست اور طالبان لیڈروں کی تلاشی ہمارے لئے بہت بڑا چیلنج ہے۔ امریکی فوجیں ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں اور وہ مایوسی کا شکار ہیں۔ خراب موسم اور اندھیرے کی طویل راتوں کے باعث انہیں سخت مشکلات پیش آرہی ہیں۔“

اور قندھار کے لوگ سردیوں کی طویل راتوں میں ایک بار پھر بے امان ہو گئے ہیں۔ 1994ء کے موسم سرما سے 2001ء کے موسم سرما تک قندھار نے ایک بھی گھناؤنا جرم، ایک بھی مکروہ لاقانونیت اور ایک بھی غارت گری نہیں دیکھی۔ ملا عمر نہیں ہے تو شہر آسیب کا گھر بن گیا ہے۔ رمز فیلڈ کو ”سردیوں کی طویل راتوں“ کا گلہ ہے۔ قندھار اور پورے افغانستان کو سردیوں کی جس طویل رات میں دھکیل دیا گیا ہے اس کی صبح نہ جانے کب ہوگی۔

[10-12-2001]

فسطائیت کے سفیر

افغانستان میں حتمی فتح و شکست کا فتویٰ جاری کرنے میں زیادہ جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس طرح کی کشمکش کو ہارجیت کے روایتی مفہوم کے حوالے سے جانچا بھی نہیں جاسکتا۔ ایسے واقعات تاریخ کی گیلری میں آویزاں بہت بڑی تصویر کی طرح ہوتے ہیں اور بڑی تصویروں کے خدو خال کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں خاصے فاصلے پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ ملا عمر کی جہالت اور جارج بش کی علمی فضیلت کا صحیح موازنہ کرنے کے لئے ابھی امکانات، واقعات اور مکافات کے لمبے سلسلے کا انتظار کرنا چاہیے۔ فی الحال امریکہ کے نئے عزائم پر نظر رکھتے ہوئے یہ دیکھنا ہوگا کہ کس کس کی ”خمد اور ہٹ دھرمی“ اگلا نشانہ بننے والی ہے۔ آدم خور کو تو پیٹ بھرنے کے لئے کچھ چاہئے۔ شکار بے حکمتی کا مظاہرہ کر کے مزاحمت کرتا کرتا گر پڑے یا حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے لقمہ تر بننے کے لئے رضا کارانہ طور پر اپنی شہد رگ اس کے جڑے تلے رکھ دے، عفریت کو بہر حال تازہ گوشت اور گرم لہو چاہئے۔

صدر جارج بش نے پرل ہاربر پر حملے کی ساشوئیں سالگرہ مناتے ہوئے کہا ہے کہ ”فاشزم (فسطائیت) کے سفیروں کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہو سکتا۔“

انہوں نے دہشت گردی کے مخصوص خود ساختہ مفہوم اور افغانستان کے پس منظر میں اسامہ اور ملا عمر کو فسطائیت کے وارث قرار دیتے ہوئے وہ لب و لہجہ اختیار کیا جو مصنوعی خداؤں کے انجام اور جزا و سزا کے تصور سے بے خبر قوتوں کا خاصا رہا ہے۔ افغانستان میں ”فسطائیت“ کا قلع قمع کرنے میں تو شاید اب زیادہ دیر نہ لگے، دیکھنا صرف اس قدر ہے کہ ”آزادی کے لئے جہد مسلسل“ کے اس بدست قافلے کا اگلا پڑاؤ کہاں ہوتا اور کس کی ”بے حکمتی“ کو لقمہ بناتا ہے۔

ایک شخص، کہ نام اس کا ایریل شیرون ہے اور جوان دنوں امریکہ کی گود میں بیٹھی ایک فسطائی

ریاست اسرائیل کا وزیر اعظم ہے، اس لئے دہشت گرد قرار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ امریکی مفادات کا مہرہ ہے اور اس کا نام مسلمانوں جیسا نہیں۔ جب امریکہ نے عالمی کونسل کا ڈرامہ رچا کر ”جاہل افغانیوں“ کو ظلم و بربریت کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تو ایریل شیرون نے بھی انگریزی لی۔ اس نے یاسر عرفات کو ”مشرق وسطیٰ کا اسامہ بن لادن“ قرار دے کر فلسطینی علاقوں پر وحشیانہ یلغار شروع کر دی۔ امریکی سرمایہ اور اسلحہ تو اسے مل ہی رہا تھا، اب اسے برہنہ جارحیت کی باضابطہ سند بھی جاری کر دی گئی اور فرمان جاری ہوا کہ اسرائیل کو اپنے دفاع کا حق ہے۔ ایریل شیرون وہ شخص ہے جس نے ستمبر 1982ء میں لبنان میں قائم صابرا اور شتیلا کے فلسطینی کیمپوں کو اپنی براہ راست نگرانی میں انسانیت سوز مظالم کا نشانہ بنایا۔ اس کے خلاف خود اسرائیل میں لاکھوں افراد نے مظاہرہ کیا۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارے کو ستر ہزار کے لگ بھگ افراد نے اپنے دستخطوں سے اس درندے کے خلاف کارروائی کی درخواست دی۔ اس کے خلاف آج بھی پینچیم کی عدالت میں دہشت گردی کا مقدمہ درج ہے۔ روز روشن کی طرح ٹھوس اور ناقابل تردید شواہد کے مطابق وہ ایک مانا ہوا دہشت گرد ہے لیکن اس صدی کا ”جید عالم“ اس کے جرائم کو اس کے نامہ اعمال کا حسن قرار دیتے ہوئے اسے ریاستی دہشت گردی اور قتل عام کا مختار نامہ جاری کر چکا ہے۔ امریکہ کی لغت میں ایریل شیرون حق و صداقت کا علمبردار اور ملا عمر فسطائیت کا وارث ہے۔

جمہوریت، آزادی، مساوات اور حقوق انسانی کے دعویدار ملک کا عالم یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگیاں عذاب بنا دی گئی ہیں۔ پولیس کو بغیر وارنٹ کسی بھی گھر میں گھسنے، کسی سے بھی پوچھ گچھ کرنے اور کسی کو بھی پولیس سٹیشن لا بٹھانے کا اختیار مل چکا ہے۔ اس ”کسی“ کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوتا ہے۔ اب تک پانچ ہزار سے زائد مسلمانوں کو کئی کئی دن اذیت ناک تفتیش کا نشانہ بنایا جا چکا ہے۔ بارہ سو سے زائد مسلمان جن میں کئی پاکستانی بھی ہیں، تفتیش کے عمل سے گزر رہے ہیں اور امریکہ ان کے نام بتانے پر بھی تیار نہیں۔ ایک پاکستانی ایف بی آئی کے تشدد سے ہلاک ہو چکا ہے۔ تارکین وطن کے لئے خصوصی قوانین بن چکے ہیں۔ جارج بوش کسی بھی شخص کو دہشت گرد قرار دے کر اسے فوجی عدالت کے سپرد کر سکتے ہیں۔ ”عدالت“ خفیہ سماعت کے بعد ایسے عمر قید یا موت کی سزا سناسکتی ہے جس کے خلاف اپیل بھی نہیں ہوگی۔ یہ فوجی عدالتیں امریکہ کے باہر بھی قائم کی جاسکتی ہیں جس کا سلیبس زبان میں ترجمہ یہ ہے کہ دو امریکی فوجی افسر کامل، اسلام آباد،

دمشق، طرابلس، بغداد، کہیں کسی بھی چوک میں کرسیاں ڈال کر کسی بھی ایسے شخص کو موت کی سزا سنا سکتے ہیں جسے جارج بوش دہشت گرد خیال کرتے ہوں۔ سمندروں میں قزاقوں کی طرح گردش کرتی امریکی کمانڈوز سے لدی آبدوزوں سے حکم جاری ہوا ہے کہ اگر کوئی تجارتی بحری جہاز تلاشی دینے کے لئے ندر کا تو اسے غرق کر دیا جائے گا۔ گذشتہ ہفتے کراچی کے ساحل کے قریب پانامہ کے ایک جہاز کو آٹھ گھنٹے تک روک کر اس میں لدے تین سو کنٹینروں کی تلاشی لی گئی اور کئی ایک کو سیل کر دیا گیا۔

طالبان کی قیادت تو اپنی ”جہالت“ کی سزا پا چکی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تقریباً دو درجن ممالک ”جہالت“ کے سبب اسی انجام سے دو چار ہو چکے ہیں۔ نصف درجن ”جائیل“ حکومتوں کے تختے اٹے جا چکے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کس کی حکمت، بصیرت، دانشمندی اور معاملہ فہمی کو ”جامعہ امریکہ“ سے کس کس نوع کی سندنفضیلت عطا ہوتی ہے اور کس کس کو فسطائیت کا سفیر قرار دے کر شکم پروری کا سامان کیا جاتا ہے۔

[11-12-2001]

عید مبارک

عالم اسلام کی عید بھی کیا عید ہے! ہر طرف لہو کے جھرنے پھوٹ رہے ہیں اور علم و دانش کی وارث سپر پاور نے فلسطینیوں کے قتل عام پر نظر رکھنے والے مبصرین کے بارے میں سلامتی کونسل کی قرارداد کو ویٹو کر دیا ہے۔ خون مسلم کس قدر ارزاں ہو چکا ہے۔ قاتلوں کے رنگ روپ الگ الگ، نام جدا جدا، مذہب اور مسلک مختلف، لیکن شرق و غرب کے ہر مقتول کا نام ایک ہی ہے۔ کہتے ہیں یہ نہ تہذیب کی جنگ ہے نہ اسلام سے کسی کو دشمنی ہے نہ مسلمانوں کے وجود سے کسی کو کد ہے لیکن عجب اتفاق ہے کہ امریکہ کا عیسائی افغانستان کے مسلمان کو مار رہا ہے۔ اسرائیل کا یہودی فلسطین کے مسلمان کو کچل رہا ہے۔ بھارت کا ہندو کشمیر کے مسلمان کی رگ جاں پر خنجر چلا رہا ہے۔ روس کا کیونسٹ چیچنیا کے مسلمان کا لبو پی رہا ہے۔ مختلف ناموں، مختلف مقاموں اور مختلف زبانوں والے سارے شکاری صرف ایک ہی ”غزال“ کا شکار کر رہے ہیں اور پھر کمال معصومیت سے کہتے ہیں کہ ”ہم تو روزے رکھتے ہیں۔ افطاریاں دیتے ہیں۔ عید مبارک کے پیغامات نشر کرتے ہیں۔ مسلمانوں سے ہمارا کیا جھگڑا۔“ نام نہاد مہذب ملکوں میں رزق حلال کی جدوجہد میں مصروف جن محنت کشوں کی زندگیاں اجیرن بنا دی گئی ہیں وہ سب کے سب مسلمان۔ جن تنظیموں کے گلے میں دہشت گردی کا طوق ڈال دیا گیا ہے وہ سب کی سب مسلمان۔ جن اداروں کی جمع پونجی ہڑپ کر لی گئی وہ سب کے سب مسلمان۔ جن ممالک کو دہشت گردی کے خلاف مہم کا اگلا مورچہ قرار دیا جا رہا ہے وہ سب کے سب مسلمان۔ جن تنظیموں کو نابود کر دینے کے لئے اندھی قوت استعمال کرنے کا اذن جاری ہو چکا ہے، وہ سب کی سب مسلمان۔ اس کے باوجود کہا جاتا ہے ”مسلمان تو ہمارے دوست ہیں۔ ہم تو روزے رکھتے اور افطاریاں دیتے ہیں۔“

امریکی حکام نے کہا ہے کہ وہ گرسس پر اپنے عوام کو اسامہ کی لاش کی شکل میں عظیم تحفہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس تحفے کے لئے بڑی کاوشیں کی گئیں۔ مزار شریف سے قندھار تک

قتل گاہیں سجائی گئیں۔ قلعہ جنگلی میں رقص ایلہیسی کا اہتمام کیا گیا۔ امن، عافیت اور انسانیت کے سفیروں کو در بدر کر کے ایک اخلاق باختہ ٹولے کو افغانستان پر مسلط کیا گیا اور پھر اسے معتبر بنانے کے لئے امریکہ کو کم و بیش پندرہ ہزار بم گرانا پڑے۔ ہزاروں معصوم انسانوں کو ہلاک کیا گیا۔ درجنوں بستیاں پیوندز میں کر دی گئیں۔ تیس لاکھ سے زائد افراد نقل مکانی پر مجبور کر دیئے گئے۔ محفوظ شاہراہوں اور پرامن آبادیوں کو درندوں کی شکار گاہ بنا دیا گیا۔

لیکن اصل شکار ابھی دور ہے۔ ملا عمر کی قیمت ایک کروڑ ڈالر اور اسامہ کی قیمت اڑھائی کروڑ ڈالر لگائی ہے۔ دو لاشوں کے لئے ساڑھے تین کروڑ ڈالر خرچ ہوں گے لیکن ان لاشوں تک رسائی کی مہم پہلے دو مہینوں میں ساٹھ بلین ڈالر کھا چکی ہے۔ امریکی عوام کو کرسس کی شایان شان تحفہ پیش کرنے کے لئے یہ کوئی بڑی قیمت نہیں۔

کرسس میں ابھی کچھ دن باقی ہیں لیکن عید تو سر پر آگئی۔ میں اپنے اہل وطن کو کون سا تحفہ پیش کروں؟ بچھے دلوں اور مرجھائے چہروں والے ان کم نصیبوں کے خشک ہونٹوں پر مسکرائشیں لانے کے لئے کون سی کہانی سناؤں؟ کشمیر کی کہانی یا فلسطین کی؟ چیچنیا کی داستان یا افغانستان کی؟ ایسے موسم میں تو عید مبارک کہتے ہوئے بھی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میں ملا عمر اور اسامہ بن لادن کو بھی عید کا کوئی تحفہ، کوئی پیغام نہیں بھیج سکتا۔ ہیر و شیمان اور ناگاساکی کے حوالے سے معروف دنیا کا سب سے تعلیم یافتہ اور سب سے ”شریف النفس“ ملک کہتا ہے کہ یہ دونوں ”برے“ شخص ہیں۔ ”بد معاش“ دہشت گرد اور قاتل ہیں۔“ اس خوف میں ملا عمر اور اسامہ بن لادن کو کوئی عید کارڈ بھی نہیں بھیج سکتا۔ ویسے بھی ان بخاروں کا نہ کوئی اتہ پتہ ہے نہ گھر نہ ٹھکانہ۔ جانے وہ کن پہاڑوں کے کون سے غاروں اور کون سی گھاٹیوں میں ہیں۔ انہیں تو شاید یہ بھی اندازہ نہ ہو کہ سورج کس وقت طلوع اور کس وقت غروب ہوتا ہے۔ گہری تاریکیوں میں بیٹھے ان خرقہ پوشوں کو کون خبر دے گا کہ عید کا چاند نکل آیا ہے؟ یوں بھی انہیں عید اور عید کے تحفوں سے کیا واسطہ؟ کسی سنہری طشتری میں سجے ان کے سر تو امریکی عوام کے لئے کرسس کا تحفہ بننے والے ہیں۔

امریکہ جیسی عظیم قوم کے تہوار کا تحفہ بنا کوئی معمولی اعزاز نہیں۔ یہ سعادت چیزوں اور ممولوں کے حصے میں نہیں آتی۔ ہوا کا کوئی جھونکا، القاعدہ سے تعلق کا الزام سہہ سکے تو ان اہل جنوں تک

”عید مبارک“ کا پیغام ضرور پہنچا دے..... لیکن میرا نام لئے بغیر!

[16-12-2001]

وجود کی بقا (1)

بھارت کی فہرست مطالبات حتمی نہیں۔ حالات و واقعات کے اتار چڑھاؤ اور ہمارے رد عمل کی روشنی میں اس فہرست کی کانٹ چھانٹ ہوتی رہے گی لیکن صورت حال کی سنگینی کے باوجود میں اس رائے پر قائم ہوں کہ بھارت جنگ سے دور رہے گا۔

اس کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط تاریخ میں پاکستان نے بھارت کے مقابلے میں جس طرح حداری اور خودداری کا مظاہرہ کیا ہے اس پر کاری ضرب لگائی جائے۔ یہ حقیقت باور کرا دی جائے کہ پاکستان کسی طور بھارت کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اگر اسے اپنا وجود عزیز ہے تو جذبات کی منہ زوری کو لگام دے اور تلخ زمینی حقائق کو قبول کرتے ہوئے ایک باجگزار ذیلی ریاست کے طور پر زندہ رہنا قبول کر لے۔

طاقت کا توازن کبھی ہمارے حق میں نہیں رہا۔ بھارت کی بری، بحری اور فضائی قوت ہم سے کہیں زیادہ ہے، اس کے پاس جدید ترین اسلحہ کی بھی فراوانی ہے، عالمی سطح پر اس کا جمہوری تشخص ہمارے بے ننگ و نام نظام سے کہیں زیادہ معتبر ہے۔ ہم نے افرادی اور عسکری قوت کا یہ عدم توازن ہمیشہ اپنی نظریاتی قوت، ایمان و یقین، عزم جہاد، شوق شہادت اور مقصد کی صداقت سے پورا کیا۔ ایمان، تقویٰ اور جہاد فی سبیل اللہ کا اثاثہ ہماری مسلح افواج کیلئے ہمیشہ سرمایہ قوت رہا۔ ماضی میں ہماری ہر ہزیمت کے پیچھے سیاسی آلائشوں کی فتنہ گری، شخصی اتاؤں کی کشمکش و پیکار، ذاتی و گروہی مفادات کی حشر سامانی اور معاملات کی ناقص تجزیہ کاری کا بڑا دخل رہا۔ یہ سب کچھ سیاسی و عسکری قیادت کے کھاتے میں جاتا ہے۔ جہاں تک میدان جنگ میں حسب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو کر جاں سپاری کے ساتھ معرکہ آرا ہونے کا تعلق ہے، ہمارے جوانوں اور افسروں نے اس کی عظیم مثالیں قائم کیں۔ جو جنگ ہم ہار گئے، جس میں ہم آدھا ملک گنوا بیٹھے، جس میں

ہمیں ہتھیار ڈالنے کی ذلت کا سامنا کرنا پڑا اور جس میں ہمارے ایک لاکھ کے قریب فوجی اور شہری بھارت کی قید میں چلے گئے، وہ جنگ بھی عزم و ہمت کی لازوال داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ مشکل ترین حالات میں، مقامی آبادی کے غیر دوستانہ رویے کے باوجود قوم کے فرزندوں نے جس بائکین سے جانیں دیں اس کا ولولہ آفریں تذکرہ جنرل نیازی کی ذلت و رسوائی کے بلے تلے دب گیا۔

سازد سامان جنگ کی اہمیت اور ٹیکنالوجی کی بالادستی کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہی لیکن 11 ستمبر کے بعد اسے ایک نیا رخ ملا ہے۔ امریکہ نے سات سمندر پار سے آکر ایک بے سرو سامان ملک کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا اور جب چاروں طرف قبرستان کی خاموشی چھا گئی تو اس کا پہلا بہادر فوجی زمین پر اترا۔ اس منظر کو دیکھ کر بعض ”حقیقت نگاروں“ نے ایک نئے فلسفہ زندگی کی تبلیغ شروع کر دی جس کا محور یہ نکتہ ہے کہ طاقتور کے سامنے کسی اصول، نظریے، آدرش یا قدر کی بات نہ کرو۔ اگر اس کا مقابلہ کرنے کی سکت ہے تو ڈٹ جاؤ ورنہ اپنا اور اس کا وقت ضائع کیے بغیر اس کے مطالبے کو تسلیم کر لو۔ اس فلسفہ حیات کی تہہ میں یہ سوچ کارفرما ہے کہ اصل اہمیت ”وجود“ کو ہے۔ روح، احساس، جذبات، غیرت، حمیت، آبرو، عزت نفس، خود مختاری، آزادی، اتنا یہ سب اضافی چیزیں ہیں۔ وجود کی سلامتی کیلئے ان میں سے جس جس کی بھی قربانی دینا پڑے قطعاً دیر نہیں لگانی چاہیے۔ وجود سلامت ہے تو سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ انتہائی زہریلا، مہلک اور فتنہ انگیز قسم کا فلسفہ ہے۔ اس کے مبلغین ایک ایسی نفسیاتی فضا تخلیق کر رہے ہیں جس میں سر اٹھا کر چلنے کی رسم مکمل طور پر متروک ہو جائے اور پوری قوم رضا کارانہ شکست کی چادر تان کر گہری نیند سو جائے، صرف اس احساس تسکین کے ساتھ کہ اس کا وجود سلامت ہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ وجود کوئی جامد شے نہیں۔ یہ انہی عناصر ترکیبی سے تشکیل پاتا ہے جن کا تعلق غیرت و حمیت اور خودداری و اتنا کے قبیلے سے ہے۔ جو قوم محض ”وجود“ کی سلامتی کیلئے عصمت و ناموس کے متاع بے بہا گنوا بیٹھتی ہے اس کا وجود راستے کے پتھر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جو ہمیشہ پاؤں کی ٹھوکروں میں رہتا ہے۔

11 ستمبر کے بعد امریکی کولیشن کا ہراول دستہ بنتے وقت دلیل اور دلیل کی کوئی محتجاش ہی نہ تھی۔ البتہ بعد میں ہم نے اس ”دانشمندانہ اور حکیمانہ“ فیصلے کی اہمیت و افادیت کا نقشہ کھینچتے وقت یہی دلیل دی کہ پاکستان ہے تو سب کچھ ہے ”سب سے پہلے پاکستان“ کا یہ مفہوم لیا گیا کہ ملک کا

وجود سلامت رہے تو سب کچھ سلامت ہے۔ یہ کسی نے نہ پوچھا کہ کیا پاکستان کسی الماری میں رکھا کوئی خوبصورت گلدان ہے؟ کیا پاکستان محض ایک جغرافیائی خطے کا نام ہے؟ اسلامی فلسفہ حیات، دو قومی نظریے، جمہوری تشخص اور آزادی و خود مختاری سے محروم پاکستان کس "وجود" پر ناز کرے گا؟ چار سرحدوں میں گھرا زمین کا کلچر انہی خصوصیات کی بدولت تو پاکستان بنتا ہے۔ ان سے محروم ہو جانے کے بعد تو کوئی پاکستان باقی ہی نہیں رہتا جسے "سب سے پہلے" کہا جاسکے۔

جب کسی ملک کی اجتماعی سوچ، قوت کے خوف میں مبتلا ہو جائے، اس کے دانشور حقیقت پسندی کے نام پر غیرت و حمیت کا تمسخر اڑانے لگیں اور فیصلوں پر قدرت رکھنے والے قائدین ہر قیمت پر کشمکش و پیکار سے گریز کی پالیسی پر چل نکلیں تو تو انا جذبوں اور ناقابل تسخیر عزم کی مالک قوم بھی اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا ہو کر بھوسے کا ڈھیر بن جاتی ہے۔ وجود کی بقا کا آشوب اس کے اعصاب سے قوت و توانائی کی ایک ایک رتن نچوڑ کر اسے نامہربان موسموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔

[24-12-2001]

وجود کی بقا (2)

بدلتی رُت دیکھ کر بھارت یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ جو اربو نو بہار امریکہ اور اسرائیل کی آرزوں کو شاداب کر گیا وہ اس کے اربانوں کی کھیتی پر برسنے کیلئے بھی تلا کھڑا ہے۔ اقوام متحدہ چودھری کے حجرے کی خاک رو بہ بن چکی ہے اور عالمی برادری، امریکی اداؤں پر تالیاں بجانے والے خواجہ سراؤں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ سامراجی سوچ رکھنے والے ہر ملک کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی پسند کے ”دہشت گردوں“ کا تعین کرے، امریکہ کو خبر دے اور پھر وہ سب کچھ کر گزرے جس کی قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ بھارت نے پاکستان کی انا کے پر کاٹنے، کشمیر کا قضیہ چکانے اور خطے پر اپنی بالادستی کا پرچم لہرانے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔

پاکستان عجب دورا ہے پر کھڑا ہے۔ تاریخ کے اس انتہائی نازک موڑ پر ملک ایک بار پھر منتخب قیادت، جمہوری اداروں، سیاسی فہم و فراست اور ادارہ جاتی مشاورت سے محروم ہے۔ فوج کی ذہنی و فکری ساخت اور پیشہ وارانہ تربیت کی پوری عمارت دفاع وطن کے پڑھزم جذبے پر کھڑی ہے۔ ماضی کی تاریخ میں ہمیشہ بھارت ہی کی طرف سے نشانہ بننے کے باعث فطری طور پر ہماری مسلح افواج صرف ایک ہی دشمن کا تصور اور اسی کیخلاف پنچہ آزمانی کا عزم رکھتی ہیں۔ وطن کی آبرو پر مرنا اور خاک پاک کی آبرو کیلئے اپنے لہو کی بوند بوند پیش کر دینا اُن کی سرشت میں شامل ہے۔ اگر وہ اس بنیادی وظیفے تک محدود ہوتیں تو معاملہ مختلف تھا لیکن آج پاکستان کی حکمرانی بھی اُن کے ہاتھ ہے اور اس اعتبار سے بھارت کے موجودہ جارحانہ رویے کا مقابلہ کرنے کیلئے سیاسی منصوبہ سازی، بین الاقوامی نزاکتوں کے شعور، حکیمانہ مصلحت کشی اور تصادم سے گریز کیلئے مدبرانہ سفارتکاری کی ذمہ داری بھی انہوں نے اپنے سر لے رکھی ہے۔ یہ کام سیاسی حکومتوں کو زیب دیتے ہیں۔ اُن کے دامن پر غیر ضروری لچک، بے جا کمزوری، دشمن کو ناروا رعایتیں دینے، جنگ سے

گریز کیلئے کم ہمتی حتیٰ کہ تصادم کوٹانے کیلئے بزدلی کا داغ بھی لگ جائے تو کوئی بہت بڑا زیاں نہیں ہوتا۔ سیاست کی قبلا پر اس طرح کے دھبے لگتے رہتے ہیں لیکن ہر حال میں دشمن پر کاری ضرب لگانے اور وطن کی انا کیلئے نقد جاں پیش کرنیوالوں کی وردی پر کلفتی جھکانے یا مصلحت شعاری کی ہلکی سی چھینٹ بھی پڑ جائے تو پوری قوم کے مورال پر گہرا گھاؤ لگتا ہے۔ بھارت کی فوج یکسو ہے۔ اس کی نظر متعینہ اہداف اور طے شدہ مقاصد پر ہے۔ سفارتی حکمت کاری، سیاسی منصوبہ بندی، بین الاقوامی رائے عامہ کی صورت گری، بڑے معرکے کیلئے سازگار فضا کی تیاری اور پھر حتمی فیصلے کی ذمہ داری عوام کی منتخب قیادت پر ہے۔ ہمارے ہاں معاملہ مختلف اور بڑی حد تک الجھا ہوا ہے۔ فوجی قیادت، سیاسی کردار ادا کرتے ہوئے تصادم کوٹانے کیلئے مصلحت کا راستہ اختیار کرتی اور بھارتی مطالبات کے سامنے جھک جاتی ہے تو اس کا داغ وردی پر لگے گا اور اگر وہ سیاسی حکمت، بین الاقوامی تقاضوں اور زمینی حقائق کو پس پشت ڈال کر خالصتاً فوجی ذہن سے فیصلہ کرتی ہے تو بھی نتائج و عواقب کی ذمہ داری برسوں اس کا پیچھا کرتی رہے گی۔ ایوب خان کی روح مصلحت کیش، اعلان تاشقند کے بوجھ سے آزاد نہیں ہو سکی اور یحییٰ خان کی بے مصلحت فوج کشی کا داغ شاید قیامت تک نہ ڈھل سکے۔ بھارت جنگ کرے نہ کرے ہمارے اعصاب کی آزمائش کیلئے بندرتیج دباؤ بڑھا رہا ہے۔ اس کا اولین ہدف ہماری قومی خودی ہے۔ اس سارے اقدامات کا مقصد ہماری عزت نفس سے چھیڑ چھاڑ ہے۔ نئی دہلی میں پاکستانی سفیر قاضی اشرف جہانگیر کو بے توقیر کیا جا رہا ہے۔ طے پایا ہے کہ وہ کڑی پابندیوں میں رہیں گے اور ایسا ہی فرمان پاکستان کیلئے بھی جاری ہو رہا ہے۔ بھارتی فضا پاکستانی طیاروں کیلئے ممنوع قرار پانے والی ہے۔ سندھ اور پنجاب کا پانی بند کرنے کیلئے سندھ طاس معاہدے کی یکطرفہ منسوخی کا ذکر بھی ہو رہا ہے۔ سرحد پار سے فائرنگ، فضائی حملے، مخصوص ٹھکانوں پر کمانڈو ایکشن اور زمین سے زمین تک مار کرنیوالے میزائلوں کے استعمال کی دھمکیاں بھی آرہی ہیں۔ ہماری طرف ایک سناٹا ہے جو کبھی کبھی بے ربط، بے مغز اور منتشر بیانات سے ٹوٹتا رہتا ہے۔

اس انتہائی نازک اور تشویشناک صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے ہمیں حکمت، تدبیر، فہم، فراست اور اجتماعی قومی دانش کی ضرورت بھی ہے اور وطن کی آبرو کیلئے کٹ مرنے کے جنوں خیز عزم کی بھی۔ موجودہ قیادت کو بلا تاخیر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا وہ ان سارے اوصاف کی مالک ہے؟

کیا قومی تاریخ کے اس فیصلہ کن موڑ پر وہ سارا بار گراں تھا اپنے کندھوں پر اٹھانا چاہتی ہے، یا اُن کو بھی شریک سفر کرنا چاہتی ہے جو بہت بُرے سہی، لیکن اس مٹی کے فرزند ہیں۔

یہ وجود کی بقا کا سوال ہے..... پاکستان کا وجود، ایسے پاکستان کا وجود جو اپنے نظریے کی صداقت، قائد اعظمؒ کے افکار کی استقامت اور چودہ کروڑ عوام کی قوت کا مظہر ہو۔ جو بھارت کے سامنے پورے قد کے ساتھ کھڑا ہو سکے۔

[25-12-2001]

یہ کس کے ہنر کا شاہکار ہے؟

معاملات کس طرح الجھتے ہیں؟ ہنگامی تقاضوں کی وقتی مجبوریاں کیونکر برسوں پر محیط ریاضت کو بے اثر کر دیتی ہیں؟ اور فیصلہ انا سے لڑھکنے کے بعد دست و پا کس طرح اختیار کھو بیٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں۔

کشمیر کا مسئلہ ہماری قومی تاریخ کے ہر نشیب و فراز پر پوری طرح حاوی رہا اور یقیناً آج بھی ہے۔ نصف صدی سے زائد عرصے میں ہم نے اس مسئلے کی خاطر جنگیں بھی لڑیں۔ جنگوں کی تیاری کے لئے صبر آزمائیاں بھی برداشت کیں لیکن اس حقیقت کو مان لینے میں کوئی حرج نہیں کہ ایک مستحکم اور پائیدار پالیسی تشکیل دینے اور حکومتوں کی آنکھ چھوٹی سے بے نیاز ہو کر استقلال کے ساتھ اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں نہ کی جاسکیں۔ اکثر اوقات اس اہم ترین مسئلے کو ذاتی یا گروہی مفادات یا اقتدار کے عارض و رخسار کی زیبا نش کے لئے استعمال کیا جاتا رہا۔ ہمارا دفتر خارجہ عالمی سطح پر انتہائی مضبوط مقدمے کو بھی پوری توانائی کے ساتھ پیش نہ کر سکا۔ ہمارے سفارتخانوں کی ترجیحات میں اسے معقول جگہ نہ مل سکی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک ملک کی اعلیٰ ترین شخصیت پاکستان کے دورے پر آئی۔ اس وقت کے صدر جناب محمد رفیق تارڑ کے ساتھ ملاقات میں جب صدر نے کشمیر کا ذکر کیا تو مذکورہ شخصیت نے بڑی معصومیت سے کہا کہ ”مجھے تو اس معاملے کی تفصیلات کا علم نہیں۔ یہ کیا قضیہ ہے؟“ آج اگر دنیا کشمیر کے مسئلے کی حقیقی نوعیت سے بے خبر ہے اور دست راز ایگاں کا سفر جہادی تنظیموں کی رگ جاں تک آن پہنچا ہے تو یہ سب کچھ ہمارے دست ہنر مند ہی کا کمال ہے۔

بھارت خود یہ معاملہ اقوام متحدہ میں لے گیا تھا۔ اسی کی پیش رفت پر سلامتی کونسل نے قراردادیاں تھاکہ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ کشمیری عوام کی مرضی و منشاء کے مطابق ہوگا جس کا تعین اقوام متحدہ کی

نگرانی میں آزادانہ استصواب رائے کے ذریعے کیا جائے گا۔ ہم بجا طور پر ایک مدت تک اقوام متحدہ کی ان قراردادوں پر عمل درآمد کو ہی مسئلہ کشمیر کا حل قرار دیتے رہے۔ تقسیم ہند کے فارمولے سے منسلک کرتے ہوئے ہم نے کشمیر کی پاکستان میں شمولیت کو نامکمل ایجنڈے کی تکمیل کا نام دیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارا موقف ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا چلا گیا۔ ہم مصلحتوں کے کھیل میں شریک ہو کر معاملے کی اصل نوعیت کو فراموش کر بیٹھے اور ایک واضح خواب، کثرت تعبیر سے پریشان ہوتا چلا گیا۔ ہمارا مقدمہ عالمی سطح پر اس لئے الجھتا گیا کہ خود ہمارے ذہنوں میں کنفیوژن کے جالے تن گئے۔ بھارت نے شملہ معاہدے کی رو سے سیز فائر لائن کو لائن آف کنٹرول قرار دینے اور باہمی گفت و شنید سے اسے حل کرنے کے عہد کو اپنی بڑی کامیابی سمجھا جس کے بعد سے تاویلات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ”کشمیر کا ز“ مسلسل ہماری لڑکھنئیوں کی زد میں ہے۔ ہم نے کہا کہ یہ مسئلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل ہونا چاہئے۔ پھر کہا کہ یہ مسئلہ دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے طے کیا جائے۔ پھر ہم پر انکشاف ہوا کہ کشمیری بھی موجود ہیں لہذا اعلان ہوا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے سہ طرفہ مذاکرات ضروری ہیں۔ پھر ہم نے کشمیر کے ”تیسرے آپشن“ کے لئے بھی اپنی گردن اثبات میں ہلانا شروع کر دی۔ پھر ہم نے کہا کہ کوئی ”معتبر ثالث“ جو فیصلہ بھی کر دے گا، ہم منظور کر لیں گے اور جب ایک عرطویل کے بعد آگرہ کانفرنس کا میلہ سچا تو ہمارا مطالبہ سکڑ سمٹ کر صرف اس قدر رہ گیا کہ بھارت اس مسئلے کو بنیادی مسئلہ (CORE ISSUE) تسلیم کر لے۔ ہمارے وجود کو دلچست کر دینے کے بعد احساس فتح مندی سے سرشار اندرا گاندھی نے بھی اتنا بے چک رو یہ اختیار نہیں کیا تھا جتنا سنگناخ طرز عمل آگرہ کانفرنس کے دوران بھارتی قیادت نے اختیار کیا۔ مسئلہ کشمیر کی اہمیت اور مرکزیت کا حوالہ تو شملہ معاہدے میں بھی موجود تھا۔ آگرہ کانفرنس کے دوران سرکاری سطح پر پاکستان نے ایک دفعہ بھی اقوام متحدہ کی قراردادوں کا نام نہیں لیا۔

اور آج جبکہ بھارت خونی جڑے کھولے ہماری سرحدوں پر دھاڑ رہا ہے، حقیقت ایک بار پھر خرافات میں کھو گئی ہے۔ ظلم و بربریت کی مکروہ روایات کے حامل ایک جنونی ملک کی پارلیمنٹ کی غلام گردش میں مارے جانے والے نصف درجن اہلکاروں کا بدلہ لینے کے لئے دہائی دی جا رہی ہے۔ بس اور کون پادل بھارت کی ہموائی کرتے ہوئے ہر اس تحریک کو دہشت گرد قرار دے رہے

ہیں جس کا آزادی کشمیر سے دور کا تعلق بھی بنتا ہے۔ قبرستانوں میں بدل جانے والی بستیوں اور خاک و خون میں نہا جانے والی اسی ہزار جوانیوں کا تذکرہ کسی کے ہونٹوں پر نہیں۔ ”بھاری اکثریت سے پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہو کر ایک دستوری حکومت کے آئینی وزیر خارجہ“ پر اچانک منکشف ہوا ہے کہ الماری میں بند معطل آئین کی رو سے جیش محمد اور لشکر طیبہ جیسی جماعتیں تو قائم ہی نہیں ہو سکتیں۔

کشمیر کا بنیادی مسئلہ نہ جانے کون سی کال کوٹھڑی کے کس تنگ و تاریک گوشے میں پڑا ہے۔ چون سالوں سے کشمیر جنت نظیر کو درندگی اور سفاکی کا دکھتا جہنم بنا دینے والا بھارت عالمی برادری کی عدالت میں مدعی بن کر کھڑا ہے اور ہم زمین پر نظریں گاڑے اپنی بے گناہی کی کتھانار ہے ہیں۔
یہ کس کے ہنر کا شاہکار ہے؟

[28-12-2001]

خواب مرتے نہیں

یہ بحث غیر ضروری ہے کہ اس کی تازہ ٹیپ کتنے دن اور کتنے مہینے پرانی ہے۔ یہ سوال بھی اپنی اہمیت کھو چکا ہے کہ وہ کہاں ہے؟ یہ الجھن بھی بے معنی ہے کہ وہ زندہ ہے یا مردہ؟ وہ ان سارے جھگڑوں، ہسارے خرخشوں، ہسارے گورکھ دھندوں سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ ٹھکانے ان کے ہوتے ہیں جو آفاقی تصورات اور لافانی نظریوں کے بجائے زمین کے ٹکڑوں اور مٹی کے گھرنندوں پر یقین رکھتے ہوں۔ موت ان لوگوں سے معاملہ کرتی ہے جن کی زندگیاں سانس کی ڈوری سے بندھی ہوں اور جن کا رشتہ جاں دل کی دھڑکنوں سے جڑا ہو۔ جغرافیہ انہیں اپنی جگہ بند یوں میں لیتا ہے جو تاریخ کی لامحدود دستوں سے بے بہرہ ہوں۔ گرداب اور بھنور ان کے مقتل بنتے ہیں جو سمندروں کی گہرائیوں سے عشق کرنے کے بجائے ساحلوں کی آسودگی پر نظر رکھیں۔ جب کوئی ارب پتی اور کھرب پتی ہوتے ہوئے، مہر میں محلات کی خوابگا ہوں اور نرم و گداز پچھونوں کو لات مار کر تورا پورا کے سنگلاخ غاروں کو مسکن بنا لیتا ہے تو وہ سانس اور ٹیکنا لوجی کے مادہ پرست پیانے سے بہت دور نکل جاتا ہے۔

وہ کئی سالوں سے دل مغرب میں تیر کی طرح پھوست ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی عسکری اور اقتصادی قوت اس کے تعاقب میں ہے۔ اُسے مسلسل گالیاں دی جا رہی ہیں۔ ”دہشت گرد، قاتل، جھگڑا، بد معاش، بدکار، خونی، جرائم پیشہ، فسادی، جنونی، شرکاپلا“ گالیوں کی اس بوچھاڑ کے باوجود وہ عزیز جہاں ہے۔ دنیا کا کوئی بڑا شہر ایسا نہیں جس کی شاہراہوں پر اس کے نام کے نعرے نہ لگے ہوں۔ اس کی تصویروں والے جلوس نہ نکلے ہوں۔ وہ شاعروں کے قصیدوں، اہل قلم کی کہانیوں، مثنوی کی نواؤں اور اربوں اہل درد کی دعاؤں میں زندہ ہے۔ دنیا کے کسی ترقی یافتہ شہر کی کوئی محفل اور کسی پسماندہ گاؤں کی کوئی چوپال اس کے ذکر سے خالی نہیں۔ نیلی ویرن کاہر

نیٹ ورک اس کے تذکروں سے معمور ہے اور ہر داستان گواہی کے قصے سے دلوں کو گرم رہا ہے۔ ڈونلڈ رز فیلڈ نے بے چارگی سے کہا ہے ”ہمیں صرف اتنا علم ہے کہ اس کا کچھ علم نہیں۔“ اس علم کی گتھیاں سلجھانے کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ تحقیق بے محل ہے کہ وہ پاکستان میں ہے یا افغانستان میں۔ چین میں بیٹھا ہے یا ایران میں۔ عراق میں ہے یا سوڈان کی راہ لے چکا ہے۔ وہ کہیں بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ جنوب میں ملا عمر کے ساتھ بیٹھا قبوے کی چسکیاں لے رہا ہو۔ ممکن ہے ہرات ایران شاہراہ کے پہلو میں عبدالرحمان جامی کی قبر کا مجاور بن چکا ہو۔ ممکن ہے قندھار کے نواح میں دریائے ارغنداب کے ساتھ ساتھ لگے انگور کے باغوں میں سے کسی باغ کا مالی بن چکا ہو۔ ممکن ہے وہ ماڈرن طرز کا سوٹ پہنے، ٹائی لگائے اسلام آباد کے فائبر سٹار ہوٹل میں سی این این کے نمائندے کے ہمراہ کافی پی رہا ہو۔ ممکن ہے وہ کوہ سفید کی کسی گھاٹی میں پتھروں کی اوٹ میں چادر بچھائے رکوع و سجود میں مصروف ہو اور ممکن ہے اس کی بے گور و کفن لاش تو راہورا کے کسی غار کی اتھاہ تاریکیوں میں پڑی ہو۔ لامتناہی امکانات کے اس گھنے جنگل میں وہ جہاں بھی ہے، جس حال میں بھی ہے، حدیث و روایاں سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ کم کم لوگوں نے اپنی زندگیوں میں عروج و کمال کی وہ رفعتیں پائیں جو اس کے حصے میں آئیں۔ اس کی تصویروں سے مزین، ٹی شرٹس، اس کے نورانی چہرے سے بچے رومال اس کے نام سے قبولیت پانے والی خوشبوئیں اس کے قد آدم رنگین پوسٹر اور اس کا نام پانچواں لے لاکھوں بچے۔ وہ نہ کسی ملک کا فرمانروا ہے نہ بادشاہ، نہ شہزادہ، نہ فلسفی نہ حکیم، نہ مصنف، لاکھوں کے مجمع کو الٹ دینے والا آتش بیاں مقرر، نہ معروف معنوں میں عالم، نہ فقیر نہ سیاسی معرکے سر کرنے والا سیاستدان۔ لیکن شہرت و ناموری اس کی کنیر ہے اور عقیدت و محبت اس کے گھر کی دہلیز پر جگہ کنال ہے۔

بیسویں صدی کے ڈوبنے اور اکیسویں صدی کے طلوع ہونے والے سورج نے اس سے زیادہ قد آور، اس سے زیادہ باکمال اور اس سے زیادہ صاحب جلال و جمال شخص نہیں دیکھا۔ وہ کچھ بھی نہیں لیکن ایسا جادو گر ہے کہ ایک دنیا اس کے سحر میں مبتلا ہے۔ تاریخ میں اس جیسے طلسماتی کردار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ وہ دکھائی دے یا نہ دے لیکن جارج بوش کے ماتھے کی ایک ایک شکن میں جھلکتا اور نونی بلیر کے غیظ آلود چہرے میں پیہم دکھاتا ہے۔ وہ زندہ ہاتھ لگ جائے یا مردہ، اس کے ہاتھوں میں جھٹکڑیاں پڑیں یا پاؤں میں بیڑیاں، سب کچھ بے معنی ہے۔ وہ اس

مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں موت اُس کی روح تو قبض کر سکتی ہے مار نہیں سکتی۔ جارج بش کی بہادر سپاہ اس کا سینہ تو چھلنی کر سکتی ہے قتل نہیں کر سکتی۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شہسواروں کو اندازہ ہی نہیں کہ ان کی حیاتیاتی انجینئرنگ، ان کی ”کلوننگ“ مراکش سے انڈونیشیا تک اس کے کتنے ہم شکل، ہم مسلک، ہم مشرب اور ہم مقصد پیدا کر چکی ہے۔

جانے دیجئے اس بحث کو کہ الجزیرہ کی تازہ کیسٹ کتنے دن اور کتنے مہینے پرانی ہے۔ اس بحث کو چھوڑیے کہ وہ زندہ ہے یا مردہ۔ بھول جائیے اس قصے کو کہ وہ کس دیس میں ہے۔ بس اتنا یاد رکھیے کہ جارج بش اور ٹونی بلیئر دو تین برس بعد وقت کے کوڑا دان کا حصہ بن جائیں گے لیکن وہ صدیوں تک تاریخ کے ایک ایک طاق میں لودیتار ہے گا۔ وہ تو ایک سردی خواب ہے جو صدیوں سے زندہ ہے۔ تعبیریں تاریک راہوں میں کھو جائیں تو بھی خواب زندہ رہتے ہیں۔ سدا بہار گلابوں کی مہک کی طرح، کسی جادوگری کی پراسرار گونج کی طرح

تیز دکھیو سر ہر خار کو اے دشت جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پامیرے بعد

[29-12-2001]

ایک قرارداد کی آمد آمد

کان بند بھی کر لئے جائیں تو بعض آوازیں صور اسرائیل بن کردل و دماغ پر آرے چلانے لگتی ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ امریکی کولیشن کے ساتھ ”امریکی توقع سے بھی زیادہ تعاون“ کرنے کے نتیجے میں آج ساری دنیا ہمارے ساتھ کھڑی ہوتی۔ امریکہ اپنے سنہری پر پھیلانے ہم پر سایہ نکلن ہوتا اور کولن پاول جسٹون سگھ کو اسی انداز کا ایک فون کر چکے ہوتے جس انداز کا فون 11 ستمبر کی رات ہمارے لئے آیا تھا۔ جارج بش سپاٹ اور دونوک لہجے میں واجپائی سے کہتے ”جناب وزیر اعظم! یہ نہ بھولنیے کہ پاکستان نے ہمارے لئے اپنی پوری تاریخ پر لیکر پھیر دی ہے۔ اپنی فضائیں، اپنے پانی، اپنے زمینی اڈے، اپنی پیشہ ورانہ مہارت، اپنی معلومات کا خزانہ، اپنی سفارت کاری، اپنے وسائل نقل و حمل، اپنی انٹیلی جنس، سب کچھ ہماری جھولی میں ڈال دیا ہے۔ یہاں تک کہ اسلامی اخوت کے حوالے سے اپنے اوپر عائد پابندیوں کو بھی ایک طرف رکھتے ہوئے ان طالبان کی غارتگری میں ہمارا ساتھ دیا ہے جنہیں وہ اپنے جگر گوشوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ آج اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ ”ہمارے بھروسوں“ کی تلاش میں مغربی سرحدوں پر جو کس کھڑا ہے۔ ہماری خاطر اس نے ایک دوست، ہمدرد اور ننگسار افغانستان کو حریف اور دشمن افغانستان میں بدل لیا ہے۔ ہماری خوشنودی کے لئے اس نے پہلی مرتبہ اپنی روایات سے ہٹ کر ایک پڑوسی اسلامی ملک کے خلاف کارروائی میں کردار ادا کیا ہے اور ابھی تک کر رہا ہے۔ عملی کاوشوں کے ساتھ ساتھ اس نے عالمی سطح پر ہمارے حق اور طالبان کی مخالفت میں ہر زور بیانات دیتے وقت ایسے دلائل تراشے ہیں جو ہمارے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ اسامہ کے خلاف ملنے والی ڈھیلی ڈھالی کڑیوں کو سب سے پہلے پاکستان ہی نے محکم استدلال کے ساتھ انتہائی مضبوط اور کافی مثبت قرار دیا۔ آج بھی وہ اپنے قومی مفادات سے کہیں زیادہ ہمارے اہداف و مقاصد کے

لئے فکرمند ہے۔ اس سب کچھ کے عوض ہم اس کی معیشت کی معمولی مرہم پنی اور چند دوروں کی سوغات کے سوا اسے کچھ بھی نہ دے سکے۔ 32 ارب ڈالر کے قرضوں کا بوجھ بدستور اس کی پیٹھ پر لدا ہے اور ایک ارب ڈالر بھی معاف نہیں کئے جاسکے۔ آج ہی جناب شوکت عزیز نے بتایا ہے کہ پاکستان ہماری وجہ سے تین ارب ڈالر کا نقصان کروا چکا ہے۔ صدر مشرف نے انجٹائی نازک حالات میں قومی تاریخ کا مشکل ترین اور نامقبول فیصلہ کر کے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ان حالات میں ہم پر یہ اخلاقی اور سیاسی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ہم پاکستان کے وجود اس کی عزت و حرمت، اس کے تشخص اور اس کی خود مختاری کا تحفظ کریں اور ہم اپنے اس فرض میں کبھی کوتاہی نہیں کریں گے۔ چونکہ آپ کی پارلیمنٹ پر حملے کے بارے میں ایسا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا جس سے پاکستان کے ملوث ہونے کا نتیجہ نکالا جاسکے اس لئے مہربانی فرما کر آپ اپنی حدود کے اندر رہیں۔ پاکستانی عوام کو پہلے ہی ہماری بے وفائی کا گلہ ہے اور ہم نے وعدہ کر رکھا ہے کہ اس مرتبہ ہم ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔ بلکہ ماضی کے سارے گلے شکوے بھی دھو ڈالیں گے۔ لہذا آپ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اپنی افواج زمانہ امن کی پوزیشنوں پر واپس لے جائیں ورنہ ہم آپ کو پتھر کے زمانے میں دھکیل دیں گے اور ایسے انجام سے دوچار کریں گے جو آپ کی آنے والی نسلیں (اگر وہ بچیں تو) بھی یاد رکھیں گی۔ مجھے بحث یا مکالمے کی نہیں ”ہاں یا نہیں، میں دو ٹوک جواب کی ضرورت ہے۔“

یہ ٹیلی فون نہیں ہو سکا۔ جو ہوا اس کا ایک ایک لفظ بندکانوں کی مقفل کھڑکیوں سے بھی صحرائی طوفان کی طرح اٹھا چلا آرہا ہے۔ جارج بش نے بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کا رشتہ گیارہ ستمبر کی کارروائیوں سے جوڑ دیا۔ ارشاد ہوا کہ جیش محمد اور لشکر طیبہ، دہشت گرد تنظیمیں ہیں ان کا نان نفقہ بند کر دیا گیا۔ انہیں ”القاعدہ کی بنیادیں“ قرار دے کر گردن زدنی ٹھہرایا گیا۔ ”جمہوریت، آزادی اور مذہبی رواداری“ کے خلاف کھلی دہشت گردی کا کھرا پاکستان تک پہنچا دیا گیا۔ اب ایک ہی مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان ”دہشت گردوں“ کے خلاف موثر کارروائی کرے۔ اسلامی کانفرنس بھی یہی راگ الاپ رہی ہے۔ چین نے بھی یہی نصیحت کی ہے۔ جی ایٹ کانفرنس نے بھی اپنے تازہ اعلامیے میں کہا ہے کہ پاکستان اپنی سر زمین پر کام کرنے والے دہشت گردوں کے خلاف مزید اقدامات کرے جو خاص طور پر بھارت کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ ”فرانس کے وزیر خارجہ

نے بھی اسی مضمون کا خط ارسال کیا ہے۔ دنیا کے کسی ملک کے کسی حاکم نے دے لفظوں میں بھی یہ نہیں کہا کہ "کشیدگی کے مستقل حل کے لئے کشمیر کے دیرینہ مسئلے کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق حل کیا جائے۔" خود ہماری عزت مآب حکومت کے کسی اہلکار نے اس نوع کی یاد دہانی ضروری نہیں سمجھی۔ اس وقت عالمی کٹھنرے میں کھڑے "مجرم" کا نام پاکستان ہے۔ فرد جرم عائد ہو چکی ہے امریکہ معتبر بیانی گواہ کے طور پر موجود ہے۔ کسی عالمی فورم سے ایک ایسی درخواست اپیل یا قرارداد آیا چاہتی ہے جس میں دہشت گردی کے خلاف ہمارے بھرپور عزم اور ہماری امن دوستی کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد ہم سے ہر وہ بات مان لینے کے لئے کہا جائے گا جو بھارت چاہتا ہے اس کے جواب میں ہمیں اتنی رعایت ملے گی کہ بھارت ہماری کٹھنی پر رکھی بندوق ہٹالے گا۔

اور ہم اس عالمی مطالبے کے جواب میں کیا کریں گے؟ اس سوال کا جواب کچھ ایسا مشکل

نہیں۔

[30-12-2001]

مالِ غنیمت

جب قانون، ضابطے، قاعدے، بین الاقوامی اصول، اخلاقی اقدار اور انسانیت کے قرینے بے مہارت طاقتوں کی فرعونیت کے باجگزار بن جائیں اور ساری مہذب دنیا تک تک تماشادیکھتی اور تماشگر کے ہنر کی داد دیتی رہے تو وہی کچھ ہوتا ہے جو ان دنوں ہو رہا ہے۔ امریکی مہم انوکھے انوکھے ٹھکانے تلاش کرتی، مگر نگر کے ”دہشت گردوں“ کا لہو چتی، تہذیب کی لغت کو معنی و مفہوم کی نئی رفعتیں دیتی، مسلسل سفر میں ہے۔ جارج بوش اور ان کے حواری مرصع الفاظ میں اسلام کو امن و عافیت اور انسان دوستی کا مذہب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”سارے مسلمان دہشت گرد نہیں“ لیکن عجب اتفاق ہے کہ اب تک تلاش کئے جانے والے سارے ”دہشت گرد“ مسلمان ہیں۔ امریکی لشکر کے شہسوار رنگ رنگ کے لیکن سب کی آستینوں پر فرزند ان حجاز ہی کا لہو ہے۔

طالبان ایک ریاست کے حکمران تھے۔ ایسی ریاست جو اقوام متحدہ کی رکن تھی۔ جس نے سلامتی کونسل کی تمام اہم قراردادوں کو تسلیم کر رکھا تھا۔ جس نے اقوام متحدہ کے تمام عہد ناموں پر دستخط کر رکھے تھے۔ وہ اپنی ریاست کی باضابطہ فوج تھے جس نے جبر کے سامنے سر جھکانے کے بجائے، اپنی بے سرو سامانی کے باوجود دفاع و وطن کا حق استعمال کیا لیکن امریکہ ہاتھ لگنے والے طالبان اور ان کے پہلو پہ پہلو لڑنے والوں کو جنگی قیدی ماننے پر تیار نہیں۔ وار لارڈز کی دستبرد میں آنے والے تمام قیدی، موکی سوغات کی طرح ملکوں ملکوں تقسیم ہو رہے ہیں۔ بستی بستی بانٹے جا رہے ہیں، گلی گلی آوازیں لگ رہی ہیں۔

جنگی قیدیوں کے ساتھ سفاکی کا پہلا شرمناک مظاہرہ، قلعہ جنگلی میں امریکی ورنڈوں کی منصوبہ سازی کے تحت ہوا جہاں ایک ہزار سے زائد انسانوں کو بے دردی سے بھون ڈالا گیا۔ مزار شریف، قندوز، کابل، قندھار اور ہرات میں پکڑے گئے افراد کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا، اس کے

تذکرے سے بھی گھن آتی ہے لیکن امریکہ نازاں رہا کہ اس کی خوئے بیمار کو تسکین مل رہی تھی۔ اب خبر آئی ہے کہ قیدیوں کی ایک بڑی کھیپ کیوبا میں امریکہ کے ایک بحری اڈے پر منتقل کی جا رہی ہے۔ یہ اڈا ایک سو سال قبل امریکہ نے پٹے پر لیا تھا اور دو ہزار سونے کی اشرفیاں اس کا سالانہ کرایہ مقرر ہوا تھا۔ آج اس کی مالیت تقریباً چار ہزار ڈالر ماہانہ بنتی ہے لیکن صدر کاسٹرو نے آج تک کرائے کا کوئی چیک کیش نہیں کرایا۔ کیوبا چیخ رہا ہے کہ امریکہ یہ اڈا فی الفور خالی کر دے اور اسے غیر انسانی مقاصد کے لئے ہرگز استعمال نہ کرے لیکن ڈونلڈ رمنز فیلڈ نے کہا ہے کہ ”ہمیں کیوبا کے داویلے سے کچھ واسطہ نہیں۔“

اس وقت 139 قیدی قندھار کے صحرائی مرکز میں بنائے گئے خصوصی تفتیشی مرکز میں ہیں۔ جانی دا کرسمیت آٹھ قیدی خلیج عمان میں کھڑے ایک بحری جہاز میں ہیں۔ 14 قیدی شبرغان سے کسی نامعلوم منزل کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ 75 قیدی ننگر ہار کے پولیس چیف اور ”فاتح توربا بورا“ حضرت علی کی تحویل میں ہیں۔ درجنوں ننگر ہار کے گورنر کے بھائی اور کورکمانڈر زمان خان کے حجرے میں بند ہیں۔ 63 کیوبا بچپننے والے ہیں۔ دو بگرام کے ہوائی اڈے پر کسی پنجرے میں بند ہیں۔ ایک مزار شریف میں کولیشن کے زیر تفتیش ہے۔ ایک سو سے زائد کوہاٹ میں سی آئی اے اور ایف بی آئی کے نرغے میں ہیں۔ دو سو کے لگ بھگ قیدیوں کا تحفہ واجپائی کو بھیجا جا چکا ہے۔ شمالی اتحاد نے جن ساڑھے سات ہزار قیدیوں کی خبر دی ہے نہ جانے وہ کہاں ہیں اور کس کی تحویل میں ہیں۔ دو دن قبل نیویارک کی ڈسٹرکٹ کورٹ نے بلا ضعیف کے نام وارنٹ جاری کر کے چھ ماہ کے اندر اندر پیش ہونے کا حکم جاری کیا ہے۔ برسوں سے افغانستان میں مقیم عربوں کی بیویاں اور بچے کس حال میں ہیں، کوئی نہیں جانتا۔ دارلارڈز کے ہاتھ جو لگا، وہ اسے غلاموں اور کنیزوں کی طرح بیٹام کر رہے ہیں۔

امریکہ اپنے من پسند قیدیوں کو کیوبا کے بحری اڈے پر اس لئے ڈھیر کر رہا ہے کہ یہ جگہ میلا سے صرف 850 کلومیٹر دور ہے۔ یہاں عالمی پریس کی رسائی نہیں۔ ہر آنے جانے والے خصوصی اجازت نامہ لینا پڑتا ہے۔ یہاں نہ امریکہ کا قانون لاگو ہوتا ہے نہ کیوبا کا، صرف بحری کے قانون کی رسائی ہے۔ مرضی کی عدالت بٹھانا اور مرضی کا فیصلہ لینا سہل ہے۔ کوئی قیدیوں کی حالت زار کا نوٹس بھی نہیں لے سکتا۔ امریکہ نے 1949ء کے اس جینیوا کنونشن پر دستخط کر

ہیں جو جنگی قیدیوں کے ساتھ انسانی سلوک کی ضمانت دیتا ہے۔ 1998ء میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے افغانستان ہی کے حوالے سے قرارداد نمبر 1193 منظور کی تھی جس کا مقصد افغانستان میں سرگرم عمل جنگی گروپوں کو اس بات کا پابند بنانا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے قیدیوں سے جیوا کنونشن کے مطابق برتاؤ کریں۔ امریکہ نے شدد سے اس قرارداد کی حمایت کی تھی اور اب وہ افغانستان کے قیدیوں کو جنگی قیدی (POWS) ماننے پر تیار نہیں۔ ان کے لئے اس نے ”میدان جنگ میں زیر حراست افراد“ (Battlefield detainees) کی نئی اصطلاح ایجاد کی ہے اور بلاشبہ وہ کسی بھی شے کو کوئی بھی نام دینے پر قادر ہے۔

مال غنیمت، غنیم کے لشکریوں میں بٹ رہا ہے۔ جگر لخت لخت کی تقسیم جاری ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے پرلگا کر اونچی ہواؤں میں اڑنے والی مہذب دنیا خاموش ہے۔ چھپن اسلامی ممالک کی زبانیں گنگ ہیں اور سوارب مسلمانوں کی نمائندگی کرنے والی اسلامی کانفرنس چپ چاپ اپنے جگر کی قاشیں سر بازار نیلام ہونے کا تماشا کر رہی ہے۔ کون بولے اور کیوں بولے؟ ان کا کسی سے کیا رشتہ ہے؟

[01-01-2002]

پہلا قدم

بے یقینی اور مایوسی کی پت جھڑکچھ اس انداز سے آتی ہے کہ امید اور آس کے سارے شجر ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ تنگی شاخیں سوانیزے پر کھڑے سورج کی ایک کرن بھی نہیں روک پاتیں اور وجود کا ایک ایک مسام تھوڑی طرح دکھنے لگتا ہے۔ ناسازگار موسموں میں بھی دلوں کے اندر اعتماد و یقین کا کوئی شگوفہ ضرور کھلا رہتا ہے۔ ایسے میں اپنے گھر کے کمزور درودیوار کے باوجود اتنا یقین ضرور رہتا ہے کہ طوفانی ہوائیں سارے روشندانوں اور سارے درپچوں کو اڑا دینے کے باوجود گھر کے پھانک کا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گی۔ ہر طرح کے حالات میں کمزور قومیں بھی اپنے اندر کچھ دفاعی لائیں بنائے رکھتی ہیں اور بے بس لوگ بھی کسی نہ کسی موڑ پر کھڑے ہو کر پورے اعتماد سے سینہ پھلا کر کہتے ہیں کہ ”بس! اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا“ اس خود اعتمادی کے پیچھے ہتھیار کی طاقت سے کہیں زیادہ غیرت و حمیت، عزت نفس اور قومی خودداری کا وہ جوہر ہوتا ہے جو افراد کو یقین و اعتماد کی قوت عطا کرتا ہے۔ انہیں کامل بھروسہ ہوتا ہے کہ بڑے فیصلوں پر قادر قوتیں سب کچھ کر سکتی ہیں لیکن فلاں لیکر سے پیچھے ہٹنے یا فلاں مطالبے کے سامنے سہرا انداز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جب ہر کھونٹا اکھڑ جائے اور ہر مورچہ تاراج ہو جائے تو چودہ کروڑ افراد بھی صحرا میں کھڑے چودہ کروڑ بے برگ و بار، ٹنڈ منڈ پیڑوں کی طرح تیز دھوپ میں سلگنے اور چنختے رہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔

امریکی کولیشن کا حصہ بن کر دہشت گردی کی عالمی مہم کا دست و بازو بننا یقیناً قرین مصلحت تھا۔ لیکن قوم کے ایک بڑے حصے کو یقین تھا کہ پاکستان، طالبان کے افغانستان کے خلاف کسی عارت گری کا موثر آلہ نہیں بنے گا۔ جب ایسا ہو گیا تو پھر بہت کچھ ہوتا چلا گیا۔ کسے یقین تھا کہ پاکستان کے ہوائی اڈے امریکہ کی تحویل میں ہوں گے اور اس کے رنگارنگ طیارے ان اڈوں کی زیر نیت

نہیں گے؟ کون یہ تصور کر سکتا تھا کہ اس کے جاسوسی سیارے ہماری فضاؤں میں گردش کریں گے؟ کون یہ کہہ سکتا تھا کہ ہماری اٹھیلی جنس تک ان کی رسائی ہوگی؟ کس کی پرواز تخیل اس بلندی تک جاسکتی تھی کہ قومی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہزاروں غیر ملکی فوجی ہماری سرزمین پر خیمہ زن ہوں گے؟ کس کو یہ گمان بھی تھا کہ ہمارے ایٹمی پروگرام کی تعمیر کرنے والے سائنس دان مجرموں کی طرح تفتیشی مراحل سے گزر رہے ہوں گے؟ کون باہد کر سکتا تھا کہ ہم ہر اس تنظیم، ادارے اور فرد کے اکاؤنٹس فی الفور منجمد کر دیں گے جس کا حکم دانشمندان سے آئے گا؟ کون یہ قیاس آرائی کر سکتا تھا کہ ہم افغانستان میں جانیں دینے والے پاکستانیوں کی لاشیں تک وصول نہیں کریں گے؟ کون یہ بات سوچ سکتا تھا کہ عالمی نیلام گھر میں پاکستانی قیدیوں کی بولی لگتی رہے گی اور ہم خاموش رہیں گے؟ کون کہہ سکتا تھا کہ ہمارے لئے افغانستان میں سفارت خانہ کھولنا بھی مشکل ہو جائے گا؟ کون یہ پیشین گوئی کر سکتا تھا کہ ملا عبدالسلام ضعیف کو پاکستان میں پناہ نہیں ملے گی؟

یہ سب کچھ پچھلے پونے چار ماہ میں ہو گیا۔ کئی ہری بھری کھیتیاں اجڑ گئیں لیکن دل کے شاداب گوشوں میں اعتماد کی یہ رت موجود تھی کہ یہ ذرا دور کا معاملہ ہے لیکن اب تو آگ صحن گلستان تک آ پہنچی ہے۔ کشمیر کے چنار اور اسلام آباد کے درود یوار بہ یک وقت زد میں ہیں۔ معاملہ اس دشمن سے ہے جس کے سامنے سر جھکانے کا تصور ہی جا بگئی کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ یقین کے آئینہ خانے ایک بار پھر کرجی کرجی ہو رہے ہیں۔ اسباب و محرکات کو جانے دیجئے۔ حقائق یہ ہیں کہ جمیش محمد، لشکر طیبہ اور حرکت المجاہدین کے اٹانے منجمد کر دیئے گئے ہیں۔ مولانا مسعود اظہر اور حافظ محمد سعید گرفتار ہو چکے ہیں۔ ان کی تنظیموں کے دفاتر سیل کر دیئے گئے ہیں۔ جہاد فنڈ کے بکسوں کے ڈھیر پولیس کے قدموں میں پڑے ہیں۔ جارج بوش سے ٹوٹی بلیئر اور کوئی عمان سے واجپائی تک سب نے پاکستان کے اقدامات کو مثبت اور خوش آئند قرار دیا ہے۔ جسوزت سگھ نے اسے ”درست سمت کی طرف اچھا قدم“ کہا ہے۔

گزشتہ شام تہذیبی جذبات سے برہمی کی آخری حدوں کو چھوتے ہوئے میرے ایک دوست نے کہا تھا ”بھارت ہمیں کوئی فہرست دینے کی جرأت نہیں کر سکتا اور پاکستان کی طرف سے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ ایسی کسی فہرست پر کوئی رسمی کارروائی بھی کرے۔“

سرکاری ترجمان نے تصدیق کر دی ہے کہ فہرست آچکی ہے اور ثبوت ملنے کے بعد

مزید کارروائی کا فیصلہ کیا جائے گا۔ وزیر خارجہ عبدالستار نے کھٹمنڈو میں اعلان کیا ہے کہ ”سارک معاہدے کے تحت قانونی تقاضے پورے کئے گئے تو مطلوب افراد بھارت کے حوالے کئے جاسکتے ہیں“ گمان ہے کہ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے اس بیان کی کوئی وضاحت، کوئی تردید نہما تشریح یا اس نوع کی کوئی رسمی شے سامنے آجائے گی۔ لیکن یقین کی فسیل میں اتنی دارڑیں آچکی ہیں کہ کوئی واقعہ، کوئی سانحہ اور کوئی المیہ، حدگماں سے پرے دکھائی نہیں دیتا۔

آج صبح، کل شام والے برہم دوست سے ملاقات ہوئی تو اس کا چہرہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد تھا۔ میں نے اسے کوئی طعنہ نہیں دیا۔ کوئی کچوکا نہیں لگایا لیکن جونہی میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں نے اسے کل بھی ہتا دیا تھا کہ پہاڑ کی چوٹی سے اگر کوئی قدم اٹھالیا جائے تو اگلے قدم خود بخود اٹھتے چلے جاتے ہیں۔

[03-01-2002]

دباؤ اور قوت مدافعت

تقسیم ہند کے تاریخ ساز لحاظ میں جنوبی ایشیا کو مسئلہ کشمیر کا تختہ پیش کرنے والی سلطنت برطانیہ کے عالی مقام وزیر اعظم، صلح صفائی کے لئے تشریف لارہے ہیں۔

پاک بھارت کشیدگی کی موجودہ فضا میں امریکہ سمیت کم و بیش دنیا بھر کے سارے اہم ممالک نے عجیب و غریب رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ تاثر یہ دیا جا رہا ہے جیسے سارا تصور پاکستان کا ہے جو دہشت گردی کو ہوا دینے اور جنگ کے شعلے بھڑکانے میں مصروف ہے۔ بھارت جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ پاکستان کے پیدا کردہ محرکات کا فطری رد عمل ہے بلکہ اس میں مجبوری کا عنصر بھی شامل ہے۔ ساری غضبناک نگاہوں کا مرکز پاکستان۔ امن، شانتی اور ماحول کو سازگار بنانے کا سارا بوجھ پاکستان کے کندھوں پر، بھارت کی خوشنودی خاطر کے لئے اپنے اصولی موقف کی تراش خراش کرنے کا ناروا مطالبہ پاکستان سے۔ طالبان کو سپرد خاک کرنے کے بعد مجاہدین کشمیر کی تجہیز و تکفین کی نامطلوب خواہش پاکستان سے۔ جارحیت کے عریاں مظاہرے کے سامنے محض حفاظتی اقدامات کرنے پر بھی صبر و تحمل کی تلقین پاکستان کو۔ اور وہ جو جنوبی ایشیا کا ”امریکہ“ بننے کے زعم میں مبتلا پاکستان کے وجود کو نابود کرنے کے جنون میں ہلکان ہوا جا رہا ہے۔ کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں کہ تمہاری آنکھوں سے شعلے کیوں برس رہے ہیں؟ دنیا کے اسی رویے سے بھارت کو شمل رہی ہے اور وہ آپے سے باہر ہوا جا رہا ہے۔

برطانیہ کے وزیر خارجہ نے حافظ محمد سعید اور دیگر کارکنوں کی گرفتاری کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہمارے وزیر خارجہ سے کہا ہے کہ ”برطانیہ جہادی گروپوں کے خلاف اٹھائے جانے والے پاکستانی اقدامات کا خیر مقدم کرتا ہے اور اس حوالے سے مزید اقدامات کی حوصلہ افزائی کے علاوہ زور دیتا ہے کہ پاکستان بھارت کے ساتھ مذاکرات کرے۔“

تازہ تازہ نوٹیل امن پرائز حاصل کرنے والے کوئی عمان فرماتے ہیں ”ہم پاکستانی حکام کی جانب سے اب تک اٹھائے گئے اقدامات کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس طرح کے اقدامات خطے میں کشیدگی کم کرنے میں مدد دیں گے۔“

جارج بش کے تمام تر بیانات کا ہدف صرف صدر مشرف ہیں۔ دباؤ ڈالنے کے سارے حربے صرف انہی پر آزمائے جا رہے ہیں۔ کسی بھی ٹھوس ثبوت کے بغیر انہوں نے جیش محمد اور لشکر طیبہ کو بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کا مجرم قرار دے ڈالا ہے۔ وہ ایسا کرخت اور کھردرا لب و لہجہ اختیار کر رہے ہیں جسے تلقین کے بجائے تنبیہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ٹیکساس میں صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا ”یہ مثبت بات ہے کہ پاکستانی صدر دہشت گردوں کے خلاف کریک ڈاؤن کر رہے ہیں۔ میں وزیراعظم واجپائی کے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔ اگر کوئی بھارتی پارلیمنٹ کی طرح امریکی کانگریس پر حملہ کرے تو مجھے بھی اتنا ہی غصہ آئے گا۔ صدر مشرف، حافظ محمد سعید سے پہلے جیش محمد کے لیڈر کو بھی گرفتار کر چکے ہیں اور ہم صدر کے ان اقدامات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“ قدر کی یہ نگاہیں شرق و غرب سے اٹدی چلی آرہی ہیں اور ہم پر مسلسل تحسین و آفرین کے لالہ و گل برسار ہی ہیں۔ بھارت دنیا کے اس رویے کو اپنی سفارتی کامیابی سے تعبیر کرتے ہوئے اپنے اسلوب کی تلخی اور لہجے کی زہرناکی میں پیہم اضافہ کر رہا ہے۔ کھٹنڈو روانہ ہونے سے ایک دن قبل آتشیں ماحول کی حدت کو ”کم“ کرنے کے لئے بھارتی وزیراعظم واجپائی نے آریہ سماج کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ”بھارت دہشت گردی کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لئے تیار ہے۔ پاکستان بھی اسی انجام سے دوچار ہوگا جس انجام سے افغانستان دوچار ہو چکا ہے۔“

آخر عالمی دباؤ کا سیلاب بلا صرف اسلام آباد ہی کی طرف کیوں بڑھا چلا آ رہا ہے؟ دنیا ہماری نرم گفتاری، ہماری مصلحت آمیزی، ہماری ملائمت، ہماری امن پسندی اور ہماری صلح جوئی کو کیا معنی پہننا رہی ہے؟ شاید یہ تاثر قوی ہو گیا ہے کہ ہم مضبوطی سے زمین پر پاؤں جما کر کھڑے رہنے اور تیز ہواؤں کے سامنے اپنے اصولی موقف پر ڈٹے رہنے کا عزم و حوصلہ کھو بیٹھے ہیں۔ وجہ کچھ بھی ہو ہمارے حالیہ اقدامات کو گریز پائی بلکہ پسپائی پر محمول کیا جا رہا ہے۔ بیرونی ذرائع ابلاغ اس پہلو کو بھی نمایاں کر رہے ہیں کہ بھارت کو رعایتیں دینے کا پاکستان میں اتنا رد عمل بھی نہیں ہوا

جتنا طالبان کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کرتے وقت ہوا تھا۔ اس سے یہ مفہوم نکالا جا رہا ہے کہ پاکستانی عوام بھی شاید یہی کچھ چاہتے ہیں۔

اس سوال کا جواب بہر حال تلاش کرنا ہوگا کہ بیرونی دباؤ کے سامنے ہماری قوت مدافعت کمزور کیوں پڑ گئی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ داخلی محاذ کا فاتحانہ پن، حکومت کے لئے خارجی محاذ پر سب سے بڑی کمزوری بن چکا ہو؟ سیاسی حکومتیں خارجی دباؤ سے معاملہ کرتے وقت درجنوں جواز پیدا کر لیتی ہیں۔ داخلی محاذ پر مورچہ زن قوتیں، انہیں کم از کم حیلہ سازی کا موقع ضرور فراہم کر دیتی ہیں۔ عوام کا دباؤ، پارلیمنٹ کا دباؤ، مخالف سیاسی قوتوں کا دباؤ، مستحکم قومی اداروں کا دباؤ، میڈیا کا دباؤ، فوج کا دباؤ، یہ ڈھیر سارے داخلی دباؤ، خارجی دباؤ کی مشرور یلغار کے سامنے حکومتوں کا موثر دفاعی ہتھیار بن جاتے ہیں۔ وہ رعایتیں دیتے وقت بھی لڑھکنے کے بجائے زینہ زینہ نیچے اترتی ہیں۔ داخلی قوتوں کے سامنے اپنی کمزوری کا احساس اور بطور ہتھیار اس کمزوری کا اظہار انہیں خارجی پریش برداشت کرنے کی صلاحیت اور بہتر سودا بازی سے بہرہ مند کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو اب دہی کے احساس سے بے نیاز، ہر نوع کے داخلی دباؤ سے آزاد اور اپنے آپ کو ناقابل تسخیر حد تک قوی سمجھنے والی حکومتوں کے پاس کوئی ایک بھی ایسی دلیل باقی نہیں رہتی جو خارجی دباؤ کے سامنے ان کا دفاعی ہتھیار بن سکے۔ جسے ڈھال بنا کر وہ دوسروں کی غضبناکی کسی قدر کم کر سکیں۔

[04-01-2002]

جرم ضعیفی

ایک محترم قاری نے مجھ سے عجب مطالبہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں ”میری آپ سے گزارش ہے کہ یا تو آپ ”نوائے وقت“ میں لکھنا چھوڑ دیں یا پھر مجھے کوئی ایسا اخبار بتائیں جو ”نوائے وقت“ جیسا ہو۔ مجھے کوئی دوسرا ”نوائے وقت“ نہیں ملے گا مگر آپ کو بہت سے اخبار مل جائیں گے۔ کسی زمانہ میں ”زمیندار“ پڑھتا تھا یا پھر اب عرصہ دراز سے ”نوائے وقت“ پڑھ رہا ہوں۔ میری آپ سے گزارش کا سبب یہ ہے کہ افغانستان اور عالم اسلام کے حالات پر آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ پڑھ کر اتنا روچکا ہوں کہ اب میری بوڑھی اور کمزور آنکھوں میں رونے کی سکت ہے نہ آنسو۔ ”زمیندار“ کے حوالے سے آپ کو میری عمر کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ طالبان کے دور میں آپ کے دورہ افغانستان کے واقعات اور موجودہ دور میں شمالی اتحاد اور کولیشن کے کرتوت پڑھ کر کوئی سنگدل بھی اپنے آنسوؤں پر ضبط نہیں کر سکتا۔ ملا عمر کے قندھار چھوڑنے کا نقشہ ”مرد جری“ میں جو آپ نے کھینچا ہے، اسے پڑھ کر ایسی کیفیت طاری رہی کہ قلم کی زبان سے بیان نہیں کر سکتا۔ 16 دسمبر کا ”عید مبارک“ رہی سہی کسر پوری کر گیا اور میں آپ سے یہ درخواست کرنے پر مجبور ہو گیا۔ صدیقی صاحب! یہ کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ افغانستان کے بعد (خاک بدہن) پاکستان پر بھی آپ کو ایسے ہی کالم نہ لکھنے پڑ جائیں۔ اس وقت ابتلاء کا دور ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانوں کے گناہ معاف فرمائیں۔“

میرے پاس اسی نفس مضمون کے سینکڑوں خطوط کا ایک انبار جمع ہو گیا ہے۔ ان کے علاوہ ای میل اور ٹیلی فون پر رابطہ کرنے والے احباب بھی اسی سے ملتے جلتے جذبات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ میں شعوری کوشش کرتا ہوں کہ دل کی شریانون سے چھیڑ چھاڑ کرتے وقت ”اوپن ہارٹ سرجری“ سے گریز کروں لیکن کانپتے ہاتھوں کی گرفت میں نہ آنے والا نثر بے قابو ہو کر خود

ہی اپنا راستہ بنانے لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چین کی ویرانی سے پہلو بچا کر کسی ایسی پگنڈی کی طرف نکل جاؤں جس میں لالہ و گل نہ سہی، گھاس کی کچھ ہری پتیاں ہی نظر آجائیں لیکن آنکھیں سنگریزوں کی چھن سے سلگنے لگتی ہیں تو قلم شگوفے کھلانا بھول جاتا ہے۔

حادثے، سانحے اور ایسے ایک سے نہیں ہوتے۔ بعض ناگہانی افتاد کی طرح یکنخت آن گھیرتے ہیں اور آتش فشاں کا لاوا سنہلنے ہی نہیں دیتا۔ بعض دستک دے کر داخل ہوتے ہیں۔ بعض کے قدموں کی چاپ برسوں پہلے سے سنائی دینے لگی ہے۔ ناگہانی افتاد کا زخم بڑا کاری ہوتا ہے لیکن اس کا ”اچانک پن“ ہی اس کا مرہم بن جاتا ہے۔ سنہلنے کا محدود وقت دینے والے عذاب بھی کسی حد تک قابل برداشت ہو جاتے ہیں لیکن برسوں سے سنائی دینے والی آہٹیں اور سالہا سال پر پھیلے خدشات بھی مزاحمت کا جذبہ اور مدافعت کا احساس بیدار نہ کر پائیں تو حساس دلوں کی دھڑکنوں کا غیر متوازن اور آنکھوں کا بے خواب ہونا یقینی ہے۔ یہ کرب اس وقت اور بھی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے جب ناسازگار موسموں کے سامنے دیوار کھڑی کرنے کی سبیل نکالنے کے بجائے چین بندی کے ذمہ داروں پر رضا کارانہ خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو جائے اور وہ طوفان کو بھی اپنی حکمت کاری کا شاہکار سمجھ کر دستِ قاتل کو دستِ مسیحا سمجھنے لگیں۔ اذیت اور بھی اعصاب کش ہونے لگتی ہے جب پاکستان کی روح تخلیق میں رچی بسی قدریں، روایتیں، مروتیں، محبتیں اور چاہتیں بھی خس و خاشاک کی طرح آگ میں جھونک دی جائیں اور سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آنے لگے۔

آج میں اندوہ کی کسی کہانی سے گریز کا پختہ ارادہ کئے بیٹھا تھا لیکن ایک سادہ و معصوم سی خبر نے سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ خبر یہ ہے کہ ”پاکستان میں افغانستان کے سابق سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کو گرفتار کر کے پشاور پہنچا دیا گیا ہے۔ انہیں گزشتہ روز اسلام آباد میں ان کی رہائش گاہ سے گرفتار کیا گیا۔ مقامی پولیس، انتظامیہ کے افسروں اور اہلکاروں کی بھاری نفری نے ان کے گھر پر چھاپہ مارا۔ ان کے اہل خانہ نے بی بی سی کو بتایا کہ ملا ضعیف کو چلتے وقت اپنا موبائل فون ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن اب تک انہوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ اہل خانہ کے مطابق سرکاری اہلکار بدھ کو بھی آئے تھے اور کہا تھا کہ ملا ضعیف تین گھنٹے کے اندر اندر پاکستان چھوڑ کر افغانستان چلے جائیں۔ سفارتی ذرائع کے مطابق اقوام متحدہ کے کمشنر برائے مہاجرین (یو این

اچھی سی آر) نے بھی ملاضعیف کو افغان مہاجر کے طور پر پاکستان میں قیام کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا ہے۔ دریں اثناء یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ملاضعیف کی طرف سے ”سیاسی پناہ“ کی درخواست پر حکومت پاکستان نے کیا حتمی فیصلہ کیا ہے۔“

میرا ملا عبدالسلام ضعیف سے کوئی رسمی تعلق ہے نہ رشتہ نہ دوستی نہ میل جول۔ میں نے اس کے بارے میں کوئی حکم بھی صادر نہیں کیا۔ لیکن خبر پڑھنے کے بعد سے میرا دل اس ناکردہ گناہ کی الجھت سے پھنسا جا رہا ہے۔ گردن ندامت کے بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی ہے۔ سوچوں کا ایک گرداب ہے کہ میرے اعصاب کو آہنی شکنجے میں کس رہا ہے۔ وہ سادہ و درویش، فقیر منش سا شخص شاید افغانستان دکھلیا جا چکا ہو۔ شاید شمالی اتحاد کے منچلے لشکری اس کی ڈاڑھی سے کھیل رہے ہوں۔ ممکن ہے وہ پشاور ہی کے کسی عقوبت خانے میں ایف بی آئی کے چر کے کھارہا ہو۔ ممکن ہے اسے صرف ”انڈرویئر“ پہنا کر یو با جانے والے کسی جہاز میں پھینک دیا گیا ہو۔ کچھ بھی ہو، وہ میرا کیا لگتا ہے؟ لیکن نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے ٹھنھرتی رات کے آخری پہرے، تیز بارش اور برفباری کے دوران اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہو۔ ایک عجیب سا نفسیاتی روگ مجھے قطعی لا تعلق سے مسئلے میں الجھا رہا ہے۔ میں اتنی سی بات بھی نہیں سمجھ رہا کہ جو ملا بھی ہو، ضعیف بھی ہو، عبدالسلام جیسا اسلامی لاحقہ اس کے نام کا حصہ بھی ہو، جس کے کندھے پر چادر، سر پر پگڑی اور چہرے پر ڈاڑھی آراستہ ہو، وہ کسی بھی بھٹی کا ایندھن بن سکتا ہے۔ جرم ضعیفی بہر حال مرگ مفاجات کی سزا پاتا ہے۔

میں اپنے بزرگ قاری اور بہت سے دوسرے کرم فرماؤں سے معذرت چاہتے ہوئے التجا کروں گا کہ وہ فولاد کے دلوں اور پتھر کی آنکھوں کا اہتمام کر رکھیں۔ ابھی عشق کے کئی امتحان باقی ہیں۔ وہ کس کس کی جلا وطنی پر آنسو بہائیں اور کس کس کی جواں مرگی کا ماتم کریں گے؟

[05-01-2002]

پاکستانیت

جب احوال و معاملات مستظلاً ایک ہی رنگ روپ اختیار کر لیں اور واقعات ایک ہی انداز سے ظہور پذیر ہونے لگیں تو ”تکرار“ سے گریز مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک ہی طرح کے مسائل پر ایک ہی طرح کے تبصروں سے پہلو بچانے کی شعوری کوشش کے باوجود کچھ دائروں سے باہر نکلنا ممکن نہیں رہتا۔

برادر م عباس اطہر نے گزشتہ روز امریکہ میں قید پاکستانیوں کا ذکر کیا ہے جو اپنی جیبوں میں سبز رنگ کا پاکستانی پاسپورٹ رکھنے کے باوجود بے ننگ و نام اجنبیوں کی طرح زندان خانوں میں بند ہیں یا تھانوں میں پیشیاں بھگت رہے ہیں۔ کئی ایک کی افسوسناک کہانیاں اخباروں کی زینت بن چکی ہیں۔ زیر عتاب پاکستانیوں کی صحیح تعداد اب تک معلوم نہیں ہو سکی۔ پاکستانی سفارت خانے کے ذرائع کا کہنا ہے کہ ”11 ستمبر کے بعد سے اب تک دو سو پاکستانی قید ہیں۔“ حیرت ہے کہ ان کے کھل کو انف کا بھی علم نہیں ہو سکا۔ ان میں سے کم و بیش چالیس، گیارہ ستمبر کے واقعات کے حوالے سے زیر حراست ہیں۔ ڈیڑھ سو سے زائد امیگریشن کی الجھنوں کا شکار ہیں۔ ایک انیس سالہ نوجوان پاکستانی صرف اس لئے جیل میں سڑ رہا ہے کہ اس نے ایک ایسے دفتر کی فیکس مشین استعمال کی تھی، جسے 11 ستمبر کے حملوں کا ایک ملزم محمد عطا بھی استعمال کرتا رہا تھا۔ کئی دن حراست میں رہنے اور اذیتیں سہنے والے تیس پاکستانی رہائی پاتے ہی وطن واپس آ گئے ہیں۔ درجنوں خاندان خوف و ہراس کی عمومی فضا اور امریکہ کے غیر انسانی رویوں سے تنگ آ کر پاکستان کی راہ لے رہے ہیں۔ ایف بی آئی جن پانچ ہزار مسلمانوں کو تفتیشی مراحل سے گزار کر اذن رہائی دے چکی ہے ان میں بھی ایک بڑی تعداد پاکستانیوں کی تھی۔

آج ایک اور اذیت ناک خبر کھمنڈو سے آئی ہے جہاں ایک پاکستانی سفارت کار سراج احمد

سراج کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ جعلی کرنسی کے کسی نام نہاد کیس کا بہانہ بنا کر سراج کی گرفتاری اور تشدد کا یہ واقعہ عین اس دن پیش آیا جس دن سارک ممالک کے تمام سربراہ صدر پرویز مشرف سمیت کھٹمنڈو میں موجود تھے۔ نیپال کی طرف سے رسمی معافی تلافی کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ پاکستان کے ایک معزز سفارت کار کو بھرے میلے میں تماشا بنانے کا مکروہ خیال کس دماغ سے پھوٹا اور عالمی میڈیا کے سامنے پاکستان کی رسوائی کا سوانگ رچانے کا حوصلہ کس نے کیا؟

اس سے قبل بھارت ایک پاکستانی سفارت کار کو تشدد کا نشانہ بنانے کے بعد ملک چھوڑنے کا حکم دے چکا ہے اور پاکستانی ہائی کمشنر کی حرکات و سکنات پر ناروا پابندیاں لگا کر مسلسل تذلیل کر رہا ہے۔ ادھر افغانستان میں ہزاروں پاکستانی المیوں کی چتا میں جل رہے ہیں۔ یہ بحث بے محل ہے کہ وہ کس سے پوچھ کر وہاں گئے تھے؟ ان کے ذہنوں میں جہاد کا تصور کس نے راسخ کیا اور ان کے دلوں میں کٹ مرنے کی امنگ کس نے بیدار کی؟ بنیادی حقیقت یہ ہے کہ وہ پاکستانی ہیں۔ وہ اس نظریے کے وارث ہیں جو پاکستان کی روح تخلیق ہے اور اس مٹی کے فرزند ہیں جس میں ایسے ہی سر پھروں کے لہو کی مہک رچی بسی ہے۔ ان کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا گیا اور مسلسل ہو رہا ہے، اس کے تذکرے سے بھی جگر خون ہوتا ہے۔ ان کی راہ دیکھتی ماؤں کی آنکھیں تیزی سے بے نور ہو رہی ہیں۔ ان کے باپ، سالوں کا سفر مہینوں اور دنوں میں طے کرتے بڑھاپے کی منزلوں سے گزرتے، موت کی دہلیز تک آن پہنچے ہیں۔ ان کی بہنیں، بیویاں اور ان کے بچے، مسلسل آزار کی صلیب پر لٹکے ہوئے ہیں۔ افغانستان جانے والے پاکستانیوں نے یقیناً اسے اپنی غیرت کے لئے ایک چیلنج سمجھا ہو گا کہ امریکہ، برطانیہ، فرانس، آسٹریلیا، چین، جاپان، بنگلہ دیش، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، عراق، لبنان اور شام کے مسلمان، افغانستان تک آن پہنچے ہیں تو وہ بڑوں کی اس آگ سے کیسے لاتعلقی رہیں؟ مان لیجئے کہ وہ غلطی پر تھے کہ انہوں نے وقت کی آواز پر کان دھرنے اور اسے سمجھنے میں ٹھوکر کھائی۔ وہ بھول گئے کہ زندگی جیسی نعمت کو ایک "لا حاصل جنوں" کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔ وہ "سب سے پہلے پاکستان" کی افادیت کو سمجھے بغیر ایمان اور یقین کی پکار پر لبیک کہہ اٹھے۔ ان ڈھیر سارے گناہوں کے باوجود وہ پاکستانی ہیں۔ دشت ظلمت میں بے چارگی کی موت مر جانے والوں کی میتیں تو اپنے دیس آنے دیجئے۔ جو اس قیامت سے بچ کر زخم زخم

جسموں کے ساتھ سرحد تک آگئے ہیں ان پر اپنے پھانگ تو بند نہ کیجئے۔ انہیں بے شک گرفتار کیجئے اور اسی نوع کے انصاف کی بھی میں ڈال دیتجئے جس نوع کا انصاف امریکہ نے متعارف کرایا ہے لیکن اپنی مٹی سے دور کی زمینوں پر انہیں بے بسی اور کسمپرسی کی آگ میں تو نہ جھونکتئے۔ ”پاکستانی“ کو رسوا تو نہ ہونے دیتجئے۔

امریکی کولیشن کا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہم نے چودہ کروڑ پاکستانیوں کو بھی امریکہ کی تحویل میں دے دیا ہے۔ وہ جہاں بھی ہیں، ان کے حقوق کی نگہداشت، ان کی عزت و آبرو کا تحفظ، انہیں دیار غیر میں تماشگری سے بچانا اور ان کے لئے پوری قوت سے آواز اٹھانا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ خود پاکستان کے اندر غیر ملکی ٹیمیں پاکستانیوں سے باز پرس کرتی پھریں اور بیرون ملک پاکستان کا حوالہ رکھنے والے منہ چھپاتے پھریں تو یہ کسی فرد کی نہیں، ریاست کی کمزوری ہے۔ یہ احساس ہی بڑا اذیت ناک ہے کہ کوئی بھی ملک اور کوئی بھی ادارہ، کسی بھی پاکستانی کے ساتھ جو سلوک چاہے روا رکھ سکتا ہے، اس اطمینان کے ساتھ کہ حکومت پاکستان اپنے کسی شہری کی کسی تذلیل کا کوئی نوٹس نہیں لے گی۔ اتنا کچھ لکھنے کے بعد میں نے بی بی سی پر صدر مشرف کے دوستانہ مصالحتی کے جواب میں واجپائی کے زور عمل کا جو منظر دیکھا، وہ اس تاثر کو مزید قوی کر گیا کہ ”پاکستانی“ جنس ارزاں ہوتی جا رہی ہے۔

[06-01-2002]

دوستی کا ہاتھ

دوستی کا ہاتھ، دوستی کے جذبے سے تھا ماما جائے تو کدورتیں مٹانے اور جذبہ اخلاص کے ساتھ ایک نئے عہد بہاراں کی بنیاد ڈالنے کا ذریعہ بن سکتا ہے اور اگر دوستی کے ہاتھ کو گہرے پانیوں میں ڈبکیاں کھاتے دشمن کا ہاتھ سمجھ کر عزت کے ساتھ جھٹک دیا جائے تو آنے والے وقت کی وحشتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔

صدر شرف نے یقیناً نیک توقعات اور اچھی تمناؤں کے ساتھ پیش قدمی کا ایک مشکل فیصلہ کیا۔ اس طرح کے مصافحے کسی وقتی ابال یا ہنگامی جذباتی رد کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ ان کے پیچھے غور و فکر اور حکمت و مصلحت کا ایک مکمل دفتر ہوتا ہے۔ کسی ملک کے سربراہ کا ہاتھ، ایک شخص کا نہیں، ایک آزاد خود مختار اور غیرت مند قوم کا ہاتھ ہوتا ہے اور اس ”ہاتھ“ سے معاملہ کرتے وقت یہ پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ اس کے اثرات و نتائج کیا ہوں گے۔ بھارتی وزیر اعظم واجپائی کے مشہور دورہ لاہور سے قبل میاں نواز شریف نے کابینہ کے سینئر رفقہاء کا اجلاس بلا کر ان کے سامنے یہ سوال رکھا تھا کہ جناب واجپائی کے انداز استقبال کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ گھنٹوں کی بحث کے بعد طے پایا تھا کہ جب واجپائی بس سے اتریں گے تو نواز شریف آگے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملائیں گے۔ ”جھمی“ ڈالنے کے تصور کو مسترد کر دیا گیا تھا۔ واجپائی بس سے اترے تو دونوں بازو پھیلا کر ”جھمی“ ڈالنے کے انداز میں آگے بڑھے نواز شریف نے طے شدہ پلان کے مطابق ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ گرجوشی سے مصافحہ ہوا۔ نواز شریف مصافحے سے فارغ ہو کر معزز مہمان کا تعارف، پہلو میں کھڑے ایک سینئر پاکستانی عہدیدار سے کرانے لگے تو واجپائی نے موقع غنیمت جانتے ہوئے جھمی ڈال لی۔ آج بھی اگر اس ”ویڈیو“ کو دیکھا جائے تو بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جس طرح نواز شریف صرف مصافحہ کرنے کا فیصلہ لے کر آئے تھے اسی طرح واجپائی نے بھی جھمی ڈالنے

کے مینڈیٹ کے ساتھ سرزمین پاکستان پر قدم رکھا تھا۔

اس اعتبار سے صدر مشرف کے مصافحے کو بھی پاکستان کی سوچی سمجھی حکمت عملی سے تعبیر کرنا چاہئے جس کا مقصد بھارت کو یہ پیغام دینا تھا کہ پاکستان کشیدگی کے موجودہ ماحول میں بھی معاملات کو باہمی مذاکرات اور اچھے جذبے کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ صدر مشرف نے مصافحے سے قبل اپنی تقریر میں کہا کہ ”میں بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی طرف مخلصانہ اور حقیقی دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ آئیے مل کر جنوبی ایشیاء میں امن، ہم آہنگی اور ترقی کا سفر شروع کریں۔“

صدر مشرف کی پیش رفت پر وزیراعظم واجپائی نے جس بوجھل دل اور سپاٹ چہرے کے ساتھ ہاتھ آگے بڑھایا وہ پوری کہانی بیان کر رہا ہے۔ یہ کہانی صدیوں پرانی ہے اور جنوبی ایشیاء کی سرزمین اس کہانی کے سارے کرداروں اور سارے منظروں سے اچھی طرح واقف ہے۔ سابق صدر جناب محمد رفیق تارڑ بیرون ملک سے آنے والے معزز مہمانوں سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ”ہندو کی ذہنیت کو صرف برصغیر کا مسلمان ہی سمجھتا ہے“ وہ یہ جملہ بھی اکثر دہراتے تھے کہ ”ہندو برہمن بہترین ماتحت اور بدترین حکمران ہے“ بھارت اور ہندو کے بارے میں قائم کی گئی یہ رائے صدیوں پر محیط تجربے کا نچوڑ ہے اور سارک کانفرنس نے ایک بار پھر اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ صرف طاقت کی زبان سمجھنے والے بھارت سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ ہمارے جذبہ خیر سگالی کا کوئی مثبت جواب دے گا۔ امریکہ نے طاقت اور رعونت کے جس مہلک منشور کو رواج دیا ہے وہ ہندو کی نفسیات سے گہری قربت رکھتا ہے۔ بھارتی قیادت یہ تہیہ کئے بیٹھی ہے کہ وہ اس بہار آفریں موسم کو بے ثمر نہیں جانے دے گی۔ عالمی طاقتیں ہماری ”کولیشن نوازی“ کو کتنا ہی کیوں نہ سراہیں، کیسے کیسے مرصع الفاظ میں خراج تحسین کیوں نہ پیش کریں، ان کے دلوں میں اسلام اور پاکستان کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں۔ القاعدہ اور طالبان قیدی یا ملاحظہ کیے جیسے قیمتی تحائف وصول کرنے پر امریکہ ہمیں شاباش تو ضرور دے سکتا ہے لیکن اپنے وسیع تر مفادات اور دروس مقاصد کے لئے بھارت کی خفگی مول نہیں لے سکتا۔ یہ بات طے ہے کہ دینی جماعتوں کو غیر موثر کرنے، جہادی تنظیموں کی گردن دبوچنے، اسلام کے حرکی تصور کے خاتمے اور ایٹمی صلاحیت کو ناکام ڈالنے کے حوالے سے بھارت اسرائیل، امریکہ، برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک کی سوچ ایک ہے۔ ان

کے نقشے میں صرف ایسا پاکستان ہی فٹ آتا ہے جو کھل طور پر بے بال و پر ہو کر جنوبی ایشیا میں امریکی عزائم کا کارندہ بن کر موجود ہے۔ اسی ہزار کشمیریوں کے قاتل کا ہاتھ تھام لینے کے باوجود ہم عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار نہیں کر سکتے اور تمام تر سفارتی اخلاقیات کو ٹھکرا کر بھی بھارت ٹونی بلیر کی نظر میں سلامتی کونسل کی رکنیت کا ”اہل ترین“ امیدوار ہے۔

فوج اور سیاست یکجا ہو جائیں..... دفاع وطن اور سیاسی مصلحت آمیزی کے تقاضے ایک ہی ادارے کے سر آئیں، جنگ کی تیاری اور جنگ سے گریز کی حکمت کاری ایک ہی فیصلہ ساز قوت کو کرنا پڑے تو بعض قباحتوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ صدر مشرف کے اخلاص نیت میں کلام نہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ سفارتی مصلحتیں، تعلقات عامہ کی نزاکتیں اور بین الاقوامی رائے عامہ کی حکمتیں سیاسی عناصر ہی کو زیب دیتی ہیں۔ ان کے مصافحے اور ان کی چھیاں معنی و مفہوم کی سوسو پرتیں رکھتی ہیں۔ سرحدوں کے پاس بان ہاتھ ملاتے نہیں، پنچہ لڑاتے ہی اچھے لگتے ہیں۔

[07-01-2002]

تماش بینوں کی بھینٹ

پاکستان قدم رنجہ فرمانے سے ایک دن قبل برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیر نے اٹل بھاری واجپائی کے ساتھ ایک اعلاسیے پردستخط ثبت فرمائے ہیں جو کہتا ہے کہ ”ہم دہشت گردی سے تعاون کرنے والوں کی شدید مذمت کرتے ہیں۔ دہشت گردوں کو مالی وسائل فراہم کرنے، انہیں تربیت دینے اور ان کی مدد کرنے والے، دہشت گردی کے جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ان جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو ہر قیمت پر انصاف کے حوالے لے کیا جانا چاہئے۔“

نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ٹونی بلیر نے کہا ”جو کچھ کیا جاتا چاہئے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ دہشت گردی کی کارروائیاں، چاہے وہ کسی بھی نوعیت کی اور کسی بھی شکل میں ہوں مکمل طور پر ختم کی جانی چاہئیں۔ اس معاملے میں ادھورے اقدامات کی کوئی گنجائش نہیں۔ جب ایک مرتبہ یہ بات واضح ہوگئی کہ واقعی دہشت گردی کا قلع قمع کر دیا گیا ہے تو مجھے یقین ہے کہ بھارت با معنی مذاکرات کے لئے تیار ہوگا۔“ اس سے تین دن پہلے بنگلہ دیش کے دورے کے لئے ڈھا کہ ایئر پورٹ پر قدم رکھتے ہی ٹونی بلیر صاحب نے فرمایا ”جی ہاں! ہم پاکستان سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ دہشت گردوں کے خلاف موثر کارروائی کرے اور بھارت سے اس بات کے خواہش مند ہیں کہ وہ جس حد تک بھی ممکن ہو کشیدگی میں کمی لائے۔“ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول، بی بی سی کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں ”ہمارے خیال میں پاکستان اور بھارت کے درمیان حالیہ بحران کے خاتمے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کو دہشت گرد تنظیموں کے خلاف کارروائی کے لئے کہا جائے۔ صدر مشرف پہلے ہی یہ کام کر رہے ہیں لیکن وہ اس سے زیادہ بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ مزید اقدامات کریں گے۔“

مقتدر عالمی لیڈروں کے یہ بیانات اس امر کا ثبوت ہیں کہ ساری قربانیوں، بھرپور جذبہ

ایثار، تمام تر وفا کیشی، اور کمال درجے کی اطاعت گزاری کے باوجود ہم دشت تہائی میں بے یار و مددگار کھڑے ہیں۔ اب ہمیں اپنی حکمت عملی ترتیب دیتے وقت اپنے ”اکیلے پن“ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ ماضی میں ہم خود فریبی کے کئی جان لیوا زخم کھائے ہیں۔ جب ہمارے وجود کا قلعہ زمین بوس ہو رہا تھا تو فصیلوں پر بیٹھے خوش گمانوں کی نظریں سمندروں کی لائٹنای ویرانیوں میں امریکی بحری بیڑے تلاش کر رہی تھیں۔ موجودہ صورت حال کو بھی صدر مشرف 1971ء کے آشوب سے تشبیہ دے چکے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دشت بے اماں میں دور دور تک کوئی نخلستان دکھائی نہیں دیتا۔ کشمیر کا معاملہ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم میں یوں الجھا دیا گیا ہے کہ اصل مسئلے کی ڈور کا سرا مل نہیں رہا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ سارک کانفرنس کے زعماء کی تقریروں، غیر رسمی گفتگوؤں، پریس کانفرنسوں اور اعلامیوں میں کہیں ”کشمیر کا لفظ ڈھونڈ“ نکالوں لیکن ناکام رہا۔

گزشتہ کچھ عرصے سے بھارت مسلسل یہ راگ الاپ رہا ہے کہ جب تک ”سرحد پارے دہشت گردی“ کا سلسلہ بند نہیں ہو جاتا، پاکستان کے ساتھ مذاکرات نہیں کئے جاسکتے۔ وہ کشمیر کی تحریک حریت کو اس کے تاریخی، سیاسی، نظریاتی اور جغرافیائی پس منظر سے کاٹ کر مسئلے کے حل کے لئے نتیجہ خیز مذاکرات کے بجائے سرحد پار دہشت گردی ختم کرنے کی شرط لگاتا چلا آیا ہے۔ ہمارے لئے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ آج دنیا کی تمام موثر طاقتیں اور ان کی باجگوار ریاستیں بھارتی موقف کی ہموار بن چکی ہیں۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ بھارت کی سات لاکھ فوج (جو پاکستان کی مجموعی فوج سے بھی زیادہ ہے) پچھلے بارہ سال سے کشمیریوں کا قتل عام کر رہی ہے۔ انسانی حقوق کی پامالی، درندگی کی اتھاہ پستیوں تک آن پہنچی ہے۔ بستیاں قبرستانوں میں بدل گئی ہیں اور اتنی ہزار شہداء کی قبریں بربریت کی داستانیں کہہ رہی ہیں۔ بھارت اقوام متحدہ کی قراردادوں کو فرسودہ اور ناکارہ کہہ کر مسترد کر چکا ہے۔ اس کے باوجود وہ ہر خطا اور گناہ سے پاک ہے۔ مصمصویت کی ردا اور مظلومیت کی قبلیٹے، پاکستان کی طرف انگلی اٹھائے، دہائی دے رہا ہے کہ مجھے اس کی ”دہشت گردی“ سے بچاؤ اور دنیا اس کی دہائی پر لبیک کہتی نہ صرف لپکتی چلی آرہی ہے بلکہ بھارت کی آواز میں آواز ملا کر ہم سے کہہ رہی ہے۔ ”پہلے دہشت گردی ختم کرو پھر اگلی بات ہوگی۔“

ہمارے پاس دہشت گردی نام کی کوئی شے نہ تھی نہ ہے، لیکن جابر تھانیدار کے خوف سے اپنی

”محنت مشقت کی کمائی“ اور جان سے زیادہ عزیز اٹانے کو ”مال مسروقہ“ مان کر نہ صرف ایک ناکردہ جرم کا اعتراف کر رہے ہیں بلکہ اپنوں کی نگاہوں میں بے اعتبار اور غیروں کی نظر میں فتنہ شعا قرار پارہے ہیں۔

”امر کی کولیشن“ کی آغوش کی حرارت اور گداز اپنی جگہ، یہ کہنے میں کیا ہرج ہے کہ ”دنیا کے منصفو! آؤ بھارت کو ہمارے ساتھ بٹھاؤ، بیک وقت دہشت گردی کے خاتمے اور مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل کو ایجنڈے پر لاؤ۔ نئے کشمیریوں کو مشکلیں کس کرسات لاکھ سفاک درندوں کی ”کھرنی“ میں ڈال دینے کے بعد کون سا مسئلہ کشمیر اور کہاں کے مذاکرات؟ کشمیر میں جذبہ حریت کا الاؤ ایک بار ٹھنڈا پڑ گیا تو راکھ کے ڈھیر سے کوئی چنگاری تلاش کرنے اور سلگانے میں جانے کتنے برس لگ جائیں۔

لیپا پوتی جاری رہے گی۔ ٹوٹی بلیئر تحسین دستاں میں کوئی بجلی نہیں کریں گے۔ ایک عدد بے ضرر سا اعلامیہ یہاں بھی جاری ہو جائے گا۔ لیکن سچ یہی ہے کہ ہم بھرے میلے کا ساتھ دینے کے باوجود بھرے میلے میں تباہ کھڑے ہیں۔ ہمیں ہر قدم اٹھاتے وقت اپنے وقار اور اپنی دستار کا تحفظ خود کرنا ہوگا۔ میلہ تو بس تماش بینوں کی بھیڑ ہے۔

[08-01-2002]

پام ہاربر اور مٹا چینا

امریکیوں نے سرکاری طور پر بتایا ہے کہ اس کا القاعدہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس کا نام بھی مسلمانوں جیسا نہیں تھا۔ اس نے کبھی اسلامی تعلیمات سے آگاہی کی کوشش کی نہ کسی اسلامی مرکز میں گیا۔ طالبان کے فلسفہ فکر سے اس کی آشنائی تک نہ تھی۔ اسامہ بن لادن اور ملا عمر سے اس کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ لشکر علیہ کے حافظ محمد سعید اور جمیش محمد کے مسعود اظہر کا نام بھی اس نے نہیں سنا تھا۔ افغانستان میں قائم ”دہشت گردی“ کا کوئی کیپ اس نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ امریکہ نے جن سینکڑوں تنظیموں اور افراد کے گلے میں دہشت گردی کی تختیاں لٹکار رکھی ہیں، ان سے کسی ایک سے اس کا تعارف تک نہ تھا۔

امریکی ریاست فلوریڈا کے قصبے پام ہاربر کا پندرہ سالہ چارلس بشپ، اسلامی بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے مفہوم سے کلی طور پر نا بلد تھا۔ ایسٹ لیک ہائی سکول میں نویں جماعت کا یہ ہونہار طالب علم ذہین بھی تھا اور خوب رو بھی۔ وہ کسی بھی اعتبار سے ایٹارل نہ تھا۔ اس کے اساتذہ اور والدین کو اس سے کوئی شکایت نہ تھی۔ کھیل کود اور ہوا بازی کا شوق رکھنے والا یہ نو عمر لڑکا کبھی ایسی صحبت میں نہیں پڑا جو اس کے بڑوں کے لئے باعث تشویش ہوتی۔

ہفتہ 5 جنوری کو وہ اپنی دادی کے ہمراہ گھر سے نکلا اور سینٹ پیٹریس برگ کلیئر فائر انٹرنیشنل ایئرپورٹ پہنچا جہاں وہ گزشتہ گیارہ ماہ سے ہوا بازی کی تربیت لے رہا تھا۔ اس نے معمول کے عین مطابق اپنے انٹرکمز کو سلام کیا جس نے اسے جہاز پر چلنے اور انتظار کرنے کے لئے کہا۔ چارلس، دادی کو الوداع کہہ کر چار سیٹوں والے سیدنا 172 طیارے کی کاک پٹ میں جا بیٹھا اور چند لمحوں بعد جہاز رن وے پر دوڑاتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ علاقے میں موجود فوجی تنصیبات کے نگہبان چونکا ہو گئے۔ ایک غیر قانونی ٹیک آف نے ہر طرف خوف و ہراس کی لہر دوڑادی۔ چند ہی منٹ میں بشپ کا طیارہ میکڈلی ایئر فورس بیس کے اوپر پہنچ گیا جہاں افغانستان میں ”انصاف کی

فرمانروائی“ کے لئے سرگرم، امریکی سینٹرل کمانڈ کے دفاتر واقع ہیں۔ فوری طور پر ایک قریبی قوسٹل گارڈ نیلی کاپٹر کو حکم ملا کہ اس طیارے کا راستہ روکو۔ چند ہی منٹوں میں تیز رفتار نیلی کاپٹر نے سینٹا کو جالیا اور اسے اپنا رخ موڑنے کے لئے کہا۔ نیلی کاپٹر نے محفوظ لینڈنگ کے لئے رہنمائی کی لیکن سینٹا ایک طے شدہ راستے پر آگے بڑھتا رہا جیسے اس کی کمان کسی کہنہ مشفق پائلٹ کے ہاتھوں میں ہو۔ اس دوران ایئر فورس کے ایک قریبی ہوائی اڈے سے دو ایف 15 جیٹ لڑاکا طیارے چڑیا جتنے سینٹا کو روکنے کے لئے فضا میں بلند ہوئے۔ نیلی کاپٹر مسلسل مزاحمت کرتا رہا۔ اس کے پائلٹ لیفٹیننٹ پیٹرک کا کہنا ہے ”یہ بتانا مشکل ہے کہ لڑاکا کیا سوچ رہا تھا لیکن طیارہ یقیناً اس کے قابو میں تھا اور وہ شعوری طور پر کسی طے شدہ ٹارگٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔“ نیلی کاپٹر کے معاون پائلٹ بیکر نے صحافیوں کو بتایا کہ وہ ”سیدھا نشانہ باندھ کر آ رہا تھا۔“ ابھی ایف 15 اس تک پہنچ بھی نہ پائے تھے کہ ہشپ نے طیارہ ٹمپا میں واقع بینک آف امریکہ کی بیالیس منزلہ پر شکوہ عمارت سے جا ٹکرایا۔ چھوٹا سا سینٹا عمارت کی 26 ویں اور 29 ویں منزل کے قلب میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا۔

ہفتہ وار تعطیل کے سبب عمارت خالی تھی۔ کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ کھلوانا سا طیارہ عمارت پر بھی کوئی کاری ضرب نہ لگا سکا، نہ آگ بھڑکی، نہ دھماکہ ہوا۔ پندرہ سالہ پائلٹ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے گہری نیند سو گیا۔ اس کی دادی اسے لینے آئی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی لیے سفر پر نکل گیا ہے۔ ایف بی آئی کی ٹیم پہنچی تو نوخیز ہشپ کی جیب سے ایک خط برآمد ہوا۔ ”میرا کسی دہشت گرد تنظیم سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اسامہ بن لادن کے ساتھ ہمدردی اور 11 ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر حملے کرنے والوں سے اظہارِ عقیدت کے طور پر اپنی جان دے رہا ہوں۔“

جس دن پام ہاربر کے پندرہ سالہ چارلس ہشپ نے اسامہ بن لادن سے اظہارِ ہمدردی کے لئے جان دی اور گیارہ ستمبر کے حملوں کی یاد میں اسی نوع کا ایک ”تمثیلیچہ“ پیش کیا، عین اسی دن افغانستان میں خوست کے ایک ویران سے گاؤں ”مناچینا“ کے چودہ سالہ بچے نے اسلحہ سے لدے پھندے ایک امریکی کمانڈو کا سینہ چھلنی کر دیا۔ ریاست نیکیاس کے علاقے سان اتونیو کا 31 سالہ سارجنٹ ناتھن راس جنمپ مین اپنے ساتھیوں کے ہمراہ عرب طالبان کی قبروں کی تصویریں بنا رہا تھا کہ کسی قریبی ٹیلے کی اوٹ میں چھپے چودہ سالہ افغان بچے نے

اچانک رانفل کا فائر کھول دیا۔ چمپ مین وہیں ڈھیر ہو گیا۔ سی آئی اے کا ایک اہلکار شدید زخمی ہوا۔ دو افغان معاونین کو بھی زخم آئے۔ 25 رکنی امریکی ٹیم بچے کا تعاقب کرنے کی بجائے فرار ہو گئی۔ اس شام سے امریکی طیارے علاقے پر مسلسل بمباری کر رہے ہیں۔ بھرپور کوششوں کے باوجود زردان قبیلے کے جرگے نے ٹھوس شواہد نہ ہونے کے باعث بچہ امریکیوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

”پام ہاربر“ اور ”مٹاچینا“ کے دونوں عمر بچوں کے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ ایک جدید ترین سکول میں تعلیم حاصل کرنے والے زندگی کی تمام تر سہولیات سے بہرہ مند، مراعات یافتہ طبقے کے بچوں کی طرح ہوا بازی کے شائق، ایک آسودہ امریکی خاندان کے خوشحال بیٹے کا ایک تباہ حال ملک کے فاقہ کش، ان پڑھ اور خستہ جاں افغانی بچے سے کیا رشتہ و تعلق ہو سکتا ہے۔ لیکن کون ہے جو ہزاروں میل دور بیٹھے ہوؤں کے دلوں میں ایک جیسے جذبے، ایک جیسے اشتعال اور ایک جیسے انتقام کے بیج بوری ہے؟

بے پناہ عسکری ٹیکنالوجی اور لامحدود مشینی قوت سے بستیوں کو تو رابورا بنانے والوں نے کبھی سوچا ہے کہ کچھ قلعے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کبھی تخیل نہیں کتنے جا سکتے؟ اسامہ بن لادن کی تلاش میں ہلاکان ہونے والوں نے کبھی غور کیا ہے کہ ظلم و نا انصافی کی آگ کے بطن سے کونپلیس کس طرح پھوٹی، جن کس طرح لہلہاتے اور اسامے کس طرح وجود میں آتے ہیں؟

”پام ہاربر“ اور ”مٹاچینا“ کے فاصلے معدوم ہو جائیں اور ہزاروں ٹن گولہ بارود کی غار نگری کے باوجود، مشرق سے مغرب تک، اباہیلوں کی طرح پر پھڑ پھڑاتے، ننھے ننھے بچے، فرعونیت کے قلعوں پر کنکر یاں برسانے لگیں تو اپنے گریبان میں جھانک لینے میں کیا ہرج ہے؟

[10-01-2002]

امتحان کی گھڑی

ایک معرکہ سر ہو چکا ہے۔ جو عالمی میڈیا ڈیورٹمنٹ لائن پر افغانستان کی طرف رخ کئے کھڑا تھا اس نے اچانک اسلام آباد اور نئی دہلی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ 11 ستمبر کو ہم عالمی کولیشن کی جس نئی سنوری بٹھی پر سوار ہوئے تھے، تیز ہوئیں اس کا سارا ہار سنگھارا اڑا کر لے گئی ہیں۔ ہماری بلائیں لینے والی بارات کسی اجنبی قبیلے کی طرح ہمیں گھیرے کھڑی ہے اور کہا ر آراستہ پیراستہ دہن کی پانگی اٹھائے نئی دہلی کی راہ پر چل پڑے ہیں۔ یہ بات 11 ستمبر کو بھی اتنی ہی واضح تھی جتنی آج ہے کہ اسامہ کا بہانہ بنا کر شکاریوں کا جو قافلہ ہمارے پڑوس میں اترا ہے، اس کی آگلی شکار گاہ کشمیر ہوگی۔ اگر کسی کے ذہن میں یہ خوشنما تصور تھا کہ اب کی بار موسم کے سارے شیریں پھل ہماری جھولی میں پڑیں گے اور برسوں کی نا آسودہ آرزوؤں کی کھیتی ہری ہو جائے گی۔ وہ شاید نئی رت کے نئے تیوروں سے مایوس ہوئے ہوں لیکن معاملات کو ماضی کے تلخ تجربات کی روشنی میں دیکھنے والوں کو معلوم تھا کہ کواکب وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں اور بازی گر کھلا دھوکا دینے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

اب جب کہ شکاری عین ہمارے گھر کے صحن میں رقص کر رہے ہیں، ہمارا سب کچھ ان کی دسترس میں ہے اور ہم اپنی آبرو کے تحفظ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، کوئی نہیں جو آگے بڑھ کر امریکہ اور برطانیہ سے کہے کہ ہمیں رسوا کرنے کے بعد ہماری عمر بھر کی کمائی پر تو ہاتھ نہ ڈالیں۔ ابھی تو ہم اپنی افغان پالیسی کی جو انہرگی کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئے کہ کشمیر پالیسی کی گردن پر چھری چلانے اور بھارتی عزائم کے قدموں تلے اپنی قومی حیثیت کا سرخ قالین بچھانے کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ کھنڈو میں صدر مشرف کا مصافحہ ہمارے ہاں استحسان و خراج کے کیسے ہی سنہری حاشیوں میں کیوں نہ سجایا جائے، بھارت اسے اپنی عسکری بالادستی اور سفارتی کامرانی سے تعبیر کر رہا ہے۔ ٹوٹی بلیمہ تشریف لائے تو ہمیں ”دہشت گردی“ ختم کرنے ورتہ سنگین نتائج کی دھمکی دے کر چلے گئے۔

جارج بش امریکہ میں بیٹھ کر کہتے ہیں ”صدر مشرف کو دہشت گردوں کے خلاف ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے۔“ کون پاؤل، بھارتی وزیر داخلہ ایڈوانٹی کو پہلو میں کھڑا کر کے فرماتے ہیں ”پاکستان بھارت میں دہشت گردی کرنے والوں کے خلاف فوری اقدام کرنے“ وہ واشنگٹن پوسٹ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں ”جنگ کو نالاشا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ چین نے اس معاملے میں غیر جانبدار رہنے کا یقین دلایا ہے“ ہمیں باور کرایا جا رہا ہے کہ ہم مکمل طور پر بے دست و پا ہو چکے ہیں۔ کشیدگی کے ان اعصاب شکن لمحات میں چینی وزیر اعظم کا دورہ بھارت ہمارے لئے بہر طور اچھا اشارہ نہیں۔ کون پاؤل نے منگل کو فون پر صدر مشرف سے بات کی۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ باقاعدگی سے فون کرتے اور کشیدگی ختم کرنے کے لئے امکانات پر تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان رچرڈ باؤچر کا کہنا ہے کہ ”حالات انتہائی سنگین ہیں اور صدر مشرف کی تقریر کا شدت سے انتظار ہو رہا ہے“ اس تقریر کا بھید کھلنے میں نہیں آ رہا کہ اس کی ضرورت کے محسوس ہوئی؟ کون اس کے نفس مضمون کے خدو خال تراش رہا ہے؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کا مخاطب کون ہے؟ صدر سے ملاقات کرنے والے امریکی سینٹرز نے اس تقریر کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا ہے اور عالمی ذرائع ابلاغ نے کچھ اس نوع کی توقعات کے تاج محل کھڑے کئے ہیں کہ دل ابھی سے بیٹھے جا رہے ہیں۔

یہ تقریر امریکہ اور برطانیہ کی دھمکیوں سے فیض پاتی، بھارت کی برسوں پر محیط تشنہ آرزوؤں کو آسودگی عطا کرتی یا اہل پاکستان کے دل داغ داغ پر کوئی نیا چہرہ لگاتی ہے، اس کا اندازہ بہت جلد ہو جائے گا۔ سامنے کی حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ ایک نازک موڑ پر دم سادھے کھڑی ہے اور فیصلے کا سارا بوجھ ایک فوجی حکمران کے کندھوں پر ہے۔ ماضی کے ایسے ہی لمحات کی طرح آج بھی جمہوری ادارے نابود ہیں۔ عوام کی تمناؤں اور جذبوں کی ترجمانی کرنے والی آوازیں گنگ ہیں یا خوف اور مصلحت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔

ایک بات طے ہے ”اگر تاریخ کا دھارا بدل ڈالنے والی“ یہ تقریر، امریکہ، برطانیہ اور بھارت کی توقعات پر پورا اترتی ہے تو اہل وطن اپنے آپ کو ایک طویل اور کٹھن آزمائش کی دہلیز پر کھڑا سمجھیں..... اور اگر یہ تقریر پاکستانیوں کی جھلسی تمناؤں کے لئے ابرنو بہار بن کر آتی ہے، تو بھی ایک کڑے امتحان کو ناگزیر جانیں۔

آگ، نمرود اور اولاد ابراہیم کی موجودگی میں، امتحان کو کب تک ٹالا جاسکتا ہے؟

[11-01-2002]

خود اذیتی

کوہاٹ کے سابق رکن قومی اسمبلی جناب جاوید ابراہیم پراچہ کی باغ و بہار اور ڈبنگ شخصیت سے کسی بھی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔ میرے دوستوں اور کرم فرماؤں میں سے ہیں اس لئے یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ جب وہ عشق و جنوں کے دشت پر خار میں جا نکلتے ہیں تو سامنے کی ٹھوس اور اٹل حقیقتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ تجربے اور مشاہدے کا وسیع خزانہ رکھنے کے باوجود وہ ایک طفل شیر خوار کی طرح کبھی کھیلنے کو چاند مانتے اور کبھی سین پت جھڑ میں تازہ گلابوں کے لئے مچھلے لگتے ہیں۔ ان دنوں بھی ان پر جیتانی جنوں کی کچھ ایسی ہی کیفیت ظاہری ہے۔ طالبان اور القاعدہ کے لاوارث قیدیوں کے لئے خواہ مخواہ ہلکان ہو رہے ہیں۔ کبھی قانون، کبھی انصاف، کبھی انسانی حقوق اور کبھی اسلامی اخوت کے نام پر مختلف دروازوں پر دستک دے رہے ہیں۔ ”کوئی ہے“ کی صدا، صحرا کی گونج بن کر پلٹ پلٹ کر آرہی ہے اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ خلق خدا ان کے جذبوں کے ہم رکاب اور ان کے جنوں سے ہم قدم ہے۔

اگر وہ اسلام آباد شریف لا سکتے یا مجھے کوہاٹ بلا سکتے ہوں تو میں انہیں بتاؤں کہ وہ اجنبی اور گم نام لوگوں کے لئے اتنے مضطرب نہ ہوں۔ نہ ان سے کوئی رشتہ نہ قرابت داری، نہ زبان کا حوالہ، نہ نسل نہ قبیلے کا تعلق۔ ہزاروں سینکڑوں میل دور سے افغانستان آنے والے ”دہشت گردوں“ کے لئے اپنے قیمتی وقت، سرمائے اور وسائل کی قربانی دینا کہاں کی دانش ہے؟ یوں بھی علم و حکمت کی ارفع ترین بلندیوں پر فائز دنیا کو جو جمہوریت، آزادی اور انسانی حقوق سے بارے میں بے حد حساس ہے ان ”وشیوں“ سے کوئی ہمدردی نہیں۔ کتوں اور بلیوں کے حقوق کے لئے تنظیمیں بنانے اور جنگلی درندوں کے تحفظ کے لئے ضابطے وضع کرنے والے اتر طالبان اور القاعدہ کو وحشرات الارض سے بھی حقیر و کتر سمجھ رہے ہیں تو یقیناً اس میں کوئی حکمت اور منطق ہوگی۔

اگلے دن جناب اشفاق احمد، ٹیلی ویژن پر خطبہ دیتے ہوئے بتا رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی جاندار مخلوق میں انسان بھی شامل ہیں اور حیوان بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ چرند و پرند اور حیوانات، جان رکھتے ہیں جبکہ انسان کے اندر روح ہوتی ہے۔ اشفاق صاحب کے خیال میں جاندار یا جانور، دوسرے جانوروں کی ہلاکت و مظلومیت دیکھ کر بھی چارے کی کھرلی پر منہ مارتا رہتا ہے جبکہ انسان سر پریدہ لاشوں کے ہجوم میں بیٹھ کر اطمینان و سکون کے ساتھ ایک نوالہ بھی نہیں لے سکتا۔ لاہور جانا ہوا تو میں ماڈل ٹاؤن کی ”داستان سرائے“ میں اشفاق صاحب سے پوچھوں گا کہ کیا امریکہ انسانوں سے خالی ہو گیا ہے؟ وہ تو علم کا بادشاہ، حکمت کا شہنشاہ، سائنس کا تاجدار اور ٹیکنالوجی کا شاہسوار ہے۔ وہ کس طرح انسان کشی سے لذت کشید کر سکتا ہے؟ دو چار دن قبل اخبارات میں ایک شیرنی اور چھوٹے سے ہرن کی تصویر چھپی تھی۔ شیرنی مادرا نہ شفقت سے لہریز نظروں کے ساتھ پہلو میں گھڑے چھوٹے سے ہرن کو دیکھ رہی ہے۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ شیرنی نے ایک عرصے تک اس ہرن کو پناہ میں لئے رکھا۔ اشفاق صاحب کے فلسفے پر یقین کیا جائے تو روح، بے عاری ایک درندے کے روئے کو کیا نام دیا جائے اور تہذیب کے ان پیشواؤں کے طرز عمل کو کس عارضے سے تعبیر کیا جائے جو زندہ انسانوں کو، جانوروں اور درندوں سے روار کھے جانے والے سلوک کا مستحق بھی نہیں سمجھتے۔

تازہ ترین مثال القاعدہ اور طالبان قیدیوں کی قدھار سے کیوبا کے سمندروں میں ”گوانٹانامو“ نامی امریکی بحری اڈے پر منتقلی ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے بتایا ہے کہ قدھار کے بندی خانے میں قید، تین سو اکان قیدیوں میں سے بیس منتخب قیدیوں کو امریکی جیٹ ٹرانسپورٹ طیارے کے ذریعے گوانٹانامو منتقل کرتے وقت ”مناسب حفاظتی تدابیر“ اختیار کی گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیاریاں اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ پھر دو قیدیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ زنجیروں سے باندھ دیا گیا۔ ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیاں باندھ دی گئیں۔ ان کے کانوں میں روٹی ٹھونس دی گئی پھر انہیں جہاز کی سیٹوں کے ساتھ جکڑ دیا گیا۔ تقریباً بیس گھنٹے کے سفر کے دوران انہیں حرکت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں ”ستر پوشی“ کے لئے مخصوص لباس دیا گیا۔ ان کی دائرہیاں صاف کر دی گئیں پھر انہیں تیز خواب آور دواؤں کے انجکشن دیئے گئے۔ گوانٹانامو میں ان کے لئے کھلے آسمان کے نیچے بجرے بنائے گئے ہیں۔ ”ایلمرے“ نامی اس کیمپ میں سو

قیدیوں کی گنجائش رکھی گئی ہے جو بہت جلد دو سو بیس تک پہنچادی جائے گی۔ ہر قیدی الگ پنجرے میں ہوگا۔ ”فلڈ لائٹس“ رات بھر روشن رہیں گی۔ قیدی زمین پر پچھی چٹائی پر سونیں گے اور بارش کی صورت میں پنجرے کے اندر نہا بھی سکیں گے۔ ممکن ہے ان بیس قیدیوں نے اپنے میزبانوں سے کہا ہو کہ اس ہستی میں ہماری جان پہچان کا ایک شخص پہلے سے موجود ہے۔ اس کا نام ملاضعیف ہے۔ اس کے پنجرے کا کچھ اتہ پتہ ہو تو ہمارا اسلام پہنچا دو۔

اب دنیا کے ہر ضابطے اور ہر قانون کی گرفت سے آزاد جزیرہ نمائے گوانٹانامو پر امریکی عدالتیں لگیں گی۔ ”مجرم“ سزا پائیں گے۔ پتہ نہیں ان کی قبریں کہاں بنیں گی؟ ایک ٹیلی ویژن نیٹ ورک نے یہ خبر بھی دی ہے کہ ”گوانٹانامو“ کے سمندری ساحل خونخوار شارک مچھلیوں کے لئے بہت مشہور ہیں۔ پلوں کے نیچے سے نہ جانے کتنا پانی بہہ چکا ہے۔ داستان سرانے کا بوڑھا ”داستان گو“ ابھی تک ”جان اور روح“ کے فرق کی نزاکتیں بیان کر رہا ہے۔ کوباٹ کا آشفہ مزاج پراچہ دکھیں دیتا اور آوازیں لگاتا پھر رہا ہے۔ انہیں اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ 11 ستمبر کے بعد وجود میں آنے والی دنیا نے اخلاقیات کا ہر قرینہ اور انسانیت کا ہر ضابطہ بدل ڈالا ہے۔ زندہ رہنا ہے تو دنیا کو جارج بوش کی آنکھ سے دیکھنے اور ٹونی بلینز کے دل سے محسوس کرنے کا ہنر پیدا کیجئے۔ خود اذیتی کے ان زیاں کار مشغلوں سے کیا حاصل؟

[12-01-2002]

www.KitaboSunnat.com

ایک سوال

تقریر تو ہو چکی۔ اس کے کیا اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں؟ یہ جاننے کے لئے آنے والے دو چار دن ہی کافی ہوں گے۔ آگے کی بات کل۔

فی الحال مسئلہ بھارت کا ہے جس کے ساتھ ایک جہان بختی، ہمدردی، خیر۔گالی، رفاقت اور اپنائیت کا اظہار کر رہا ہے۔ زمانے بھر کی محبتیں اس پر نچھاور ہو رہی ہیں اور وہ گربہ مسکین بنا سوسے بہا رہا ہے۔ کوئی اس کے آنسو پونچھ رہا ہے، کوئی تسلی دے رہا ہے۔ کوئی تخیل کی تلقین کر رہا ہے۔ کوئی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے مبر سے کام لینے کی نصیحت کر رہا ہے۔ بھارت جواں سال بیوہ کی طرح اجڑی مانگ، ویران کلائیوں اور سیاہ ماتھی لباس کے ساتھ نڈھال ہوا جا رہا ہے اور ساری دنیا اسے پُرسادے رہی ہے۔ اس کے وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی امریکہ کے دورے پر ہیں۔ عجب اتفاق ہوا کہ جب وہ صدر کی مشیر قومی سلامتی کنڈولیزا رائس سے ملاقات کر رہے تھے تو اچانک جارج بش ادھر آ نکلے۔ ایسے عجیب و غریب اتفاقات کئی دوسرے بھارتی لیڈروں کے حصے میں بھی آچکے ہیں۔ جسونت سنگھ دوسرے اس خوشگوار تخیر کا مزا چکھ چکے ہیں۔ جب بھی کوئی دوسرے درجے کا بھارتی اہلکار امریکہ جاتا ہے اور سفارتی آداب کے سبب صدر سے اس کی ملاقات ممکن نہیں ہوتی تو صدر بش خود وائٹ ہاؤس کی بھول بھلیوں میں مزگشت کرتے اس کمرے میں آ نکلتے ہیں جہاں بھارتی اہلکار اپنے کسی ہم منصب سے مصروف گفتگو ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ بھی یہی ہوا۔ ایل کے ایڈوانی نے زخمی ملاقات کا آغاز ہی کیا تھا کہ جارج بش دھڑام سے دروازہ کھول کر اندر آ گئے اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے بھارتی وزیر داخلہ کو تسلی دی۔ اظہار ہمدردی کیا، کچھ یقین دہانیاں کرائیں۔ چنانچہ ملاقات سے فارغ ہوتے ہی ایڈوانی صاحب نے اخبار نویسوں کو مڑوہ سنایا کہ ”صدر بش نے موجودہ بحران میں بھارت کو اپنی تائید و حمایت کا یقین دلایا ہے۔“

ادھر کولن پاول نے بھی بھارت سے کہا ہے کہ وہ صبر سے کام لے۔ کم از کم صدر مشرف کی تقریر کو غور سے سن لے اور اس کے بعد کسی اگلے اقدام کا فیصلہ کرے۔ امریکی وزارت خارجہ کے ترجمان نے بھی ایسی ہی تلقین فرمائی ہے۔ ٹونی بلیر نے بھی بھارت کو یقین دلایا ہے کہ ”تقریر“ اس کے دل پر درد کی تسکین کا سامان بن جائے گی۔ اگر بھارت کی نمکساری اور دلداری کرنے والی دنیا، اسی تک محدود رہتی تو درگزر کیا جاسکتا تھا۔ ہو یہ رہا ہے کہ سب کی خشگیں لگائیں ہم پر لگی ہیں اور سب کے ہاتھ ہمارے گریبان پر ہیں۔ تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ بھارت کو انتہائی مجبوری کی حالت میں اپنی اتنی بڑی فوج کو متحرک کرنا پڑا ہے اور شاید مجبوری و معذوری کی اس کیفیت میں اسے پاکستان پر حملے کی کڑوی گولی بھی لگانا پڑ جائے۔ پچھلے کئی سالوں سے حالات کے اسی جبر کے سبب بھارت کو بادل ناخواستہ بعض کارروائیاں کرنا پڑی ہیں۔ کئی بستوں کو راکھ کا ڈھیر بنانا پڑا۔ یہ امر مجبوری کئی عصمتوں کو برباد کرنا پڑا۔ دل پر پتھر رکھ کر لگ بھگ اتنی ہزار انسانوں کے سینے چھٹی کرنا پڑے اور اب عین ممکن ہے کہ پاکستان پر حملہ کرنے اور ایٹم بم آزمانے کا زخم بھی کھانا پڑے۔

پاکستان اس صورتحال میں ایک مجرم کی طرح منہ چھپاتا پھر رہا ہے۔ اپنا گریبان چھڑانے کے لئے ایک ایک کر کے اپنی ساری جبینیں خالی کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے گھر کے اندر والی تجوری میں رکھا اثاثہ بھی ڈھیر کرنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ مطالبہ صرف ایک ہی ہے کہ ”ہمارا گریبان چھوڑ دو“ آج صبح ایک زیر تعمیر گھر میں کام کرتے ایک مزدور نے سینٹ کی بوری ایک طرف رکھتے ہوئے مجھ سے عجیب سا سوال کیا ”سرحی! ہماری حکومت یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ بھارت کی فوجیں واپس چلی جائیں“ میں نے کہا ”اس لئے کہ ہم امن پسند لوگ ہیں اور جنگ نہیں چاہتے۔“ ”وہ تو ٹھیک ہے، جی پر جنگ تو بھارت چاہتا ہے نا۔ اور اگر بھارت ہم کو لٹکا رہا ہے تو ہم کیوں ڈر رہے ہیں؟“ میں نے ایک مصنوعی قببہ لگا کر یہ تاثر دیا کہ تم جیسے جاہل کو کیا منہ لگاؤں۔ لیکن سوال اپنی جگہ موجود رہا۔ جب بھارت جنگ چاہتا ہے تو ہم کیوں مرے جا رہے ہیں؟ ہماری قیادت کے ہر چھوٹے بڑے اہلکار کا سارا زور اس بات پر کیوں ہے کہ ”بھارت اپنی فوجیں ہٹالے؟“ بھارت کی فوجوں کو اپنی سرحدوں سے دور رکھنے کے لئے ہم تقریروں، تقریروں اور تعبیروں کے رنگین غبارے کیوں چھوڑ رہے ہیں؟ ہمارا موقف تو یہ ہونا چاہئے کہ ”ہاں۔ ہم جنگ نہیں چاہتے۔ لیکن اگر بھارت اپنی فوجیں ہماری سرحدوں پر لگا کر اور اپنی بندوق ہماری کپٹی

پر رکھ کر ہم سے شرائط منوانا چاہتا ہے تو ہم ایک ادنیٰ ترین رعایت سے بھی انکار کرتے ہیں۔ ہم وسیع تر ملکی مفاد کے لئے جن اقدامات کا ارادہ رکھتے ہیں انہیں فی الحال ملتوی کر رہے ہیں تاکہ یہ تاثر نہ ملے کہ ہم بزدل قوم ہیں اور بھارت سے خوفزدہ ہو کر منت سماجت پر اتر آئے ہیں۔ بھارت چونکہ لڑنے آیا ہے اس لئے یہ حساب بے باق کر لے۔“

اس تاثر کی حدیں کہ ہم بہر طور جنگ نہیں چاہتے، بزدلی اور بے حیثی سے جا ملتی ہیں۔ اگر ہمارا سارا زور بیان جنگ ٹالنے کے لئے ناروار عاصتوں اور نامطلوبہ پسپائیوں تک محدود رہا تو نہ جنگ ٹلے گی اور نہ ہمارے سروں پر کوئی دستار سلامت رہے گی۔ آبرو بہر حال جان سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔

[13-01-2002]

جہاد اکبر (1)

تقریر کی لذت سے کس کے دل پر کتنی شبنم گری؟ کس نے تسکین قلب کی کتنی سرشاری سمیٹی، کس کے سوکھے دھانوں پر کتنا ایندھن برسا اور کس کی بے قراری کو قرار آیا؟ اس کا اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ یہ تقریر کتنے ذہنوں میں دوسوں اور اندیشوں کی نئی فصل بو گئی، کتنے دلوں کی دھڑکنیں غیر متوازن کر گئی، کتنی آنکھوں کے خواب چھین لے گئی اور کتنے اہل درد کو زخموں کی تازہ سوغات دی گئی، اس کا گوشوارہ بھی جلد مرتب ہو جائے گا۔

امریکہ اور مغرب نے اس تقریر کو خوش آمدید کہا ہے اور ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا“ کے انداز میں اس کی پذیرائی کی ہے۔ صدر بوش نے اسے بڑی توجہ اور انہماک سے سنا۔ فوراً بعد ان کی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداروں نے اسے ”Good Speech“ یعنی ”اچھی تقریر“ قرار دیا اور توقع ظاہر کی کہ اس سے جنوبی ایشیا فوجی تناؤ سے نکل آئے گا۔ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے کہا کہ ”صدر مشرف نے پاکستان کے اندر اور باہر دہشت گردی کے خاتمے کا عزم ظاہر کر کے ایک دلیرانہ اور اصولوں پر مبنی قدم اٹھایا ہے۔“ دفتر خارجہ کی طرف سے جاری ہونے والے بیان میں کولن پاول نے مزید کہا کہ ”امریکہ ہمیشہ محمد اور لشکر طیبہ پر پابندی کے تدابیر کو خارج تحسین پیش اور دہشت گردی کے خلاف صدر مشرف کے دونوں اعلانات کا مقدم کرتا ہے۔ ہم نے بطور خاص صدر کے اس عزم کو نوٹ کیا ہے کہ پاکستان کسی طور، کشمیر سے کہیں پر بھی دہشت گردی برداشت نہیں کرے گا۔“ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیر نے صدر کی تقریر پر اپنے رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے اسے ”جرات مندانہ“ قرار دیا۔ ٹین ڈاؤنگ سٹریٹ سے جاری ہونے والے بیان میں ٹونی بلیر نے کہا کہ ”ہم ہر قسم کی دہشت گردی کو مسترد اور اس کی مذمت کرنے کے اعلان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم صدر کے اس عزم کو بھی خوش آمدید کہتے

ہیں کہ وہ پاکستانی حدود کے اندر کسی بھی دہشت گردی کے خلاف سخت کارروائی کریں گے۔“ یورپی یونین کے سکیورٹی چیف جیویر سولانا (Javier Solana) نے اپنے بیان میں کہا کہ ”میں صدر مشرف کے ان اقدامات کا خیر مقدم کرتا ہوں جو انہوں نے دہشت گردی کے خاتمے کے لئے اٹھائے ہیں۔“ چین، جرمنی، روس اور متعدد دوسرے ممالک نے بھی اسی نوع کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

اور وہ جس کے لئے یہ ساری بزم طرب سجائی گئی ابھی تک منہ بسور ہے بیٹھا ہے۔ جزوی طور پر بعض اقدامات پر ہم ولایت مثبت رد عمل کے باوجود اپنی خوئے بد میں کوئی تبدیلی لانے پر آمادہ نہیں۔ جسوزت سنگھ نے سپاٹ پتھر لیے لہجے میں صدر مشرف کے اقدامات کو اپنی سفارت کاری اور خارجی دباؤ کا نتیجہ قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ ”ہمیں اعلانات کی نہیں عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔“ جسوزت سنگھ نے نکتہ اٹھایا کہ کشمیر کی تحریک حریت کو دہشت گردی تسلیم کر کے پاکستان نے ہمارا موقف مان لیا ہے۔ طنز سے بھرے لہجے میں بار بار ”جنرل ایکسی لینسی“ کا خطاب دہراتے ہوئے انہوں نے فوجیں ہٹانے یا کشیدگی میں کمی لانے کے کسی اور اقدام سے انکار کر دیا۔ کشمیر کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کو فرسودہ اور لایعنی قرار دے کر مسئلہ کشمیر کو شملہ معاہدے اور اعلان لاہور کے شکنجے میں کس دیا۔ ٹالشی یا کسی بھی تیسرے فریق کی مداخلت کو ہمیشہ کے لئے مسترد کر دیا۔

بھارت کا یہ رد عمل بتا رہا ہے کہ وہ بھرپور سفارتی دباؤ برقرار رکھے گا اور عسکری پریشر میں بھی کمی نہیں لائے گا۔ بہت جلد واضح ہو جائے گا کہ امریکہ کا روئے سخن اب کس کی طرف ہوتا ہے اور وہ کس نوع کا لب و لہجہ اختیار کرتا ہے۔ اتنا وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ہم شاید ”سربازاری رقص“ کے بعد بھی یار و لدا کو منانہ پائیں۔

مکتب و مسجد کے حوالے سے جن اصلاحات کا اعلان کیا گیا ہے، ان پر خیال آرائی ہوتی رہے گی لیکن بالعموم انہیں مثبت ہی قرار دیا جائے گا۔ دینی مدارس کی ملک گیر تنظیم ”دفاق المدارس“ نے تعمیری تجاویز کو ہمیشہ کھلے دل کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ میں ذاتی طور پر ایسے کئی مدارس سے آگاہ ہوں جہاں جدید عصری علوم اور کمپیوٹر کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اور یہ سلسلہ مسلسل پھیل رہا ہے۔ مساجد کے حوالے سے ضابطہ بندی میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ فرقہ واریت اور

دہشت گردی کی بیخ کنی کے سارے اقدامات بادی اہلکس میں قومی مفاد میں ہیں۔ پاکستانی قوم کا شعور ان کی مخالفت نہیں کرے گا۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے کہ علمائے کرام کی بھاری تعداد اور ان کی تنظیمیں عمومی طور پر ان اقدامات کو سراہیں گی۔ یہ سارے اعلانات ایک نہایت ہی سازگار اور خوشگوار ماحول میں اس طرح بھی ہو سکتے تھے کہ صدر مشرف علماء کے جھرمٹ میں ہوتے اور تمام مکتبہ ہائے فکر کے رہنماؤں کی تائید و حمایت کے ساتھ ان اصلاحات کا اعلان کرتے۔ عمومی اتفاق رائے کا اہتمام کرنے کا معتبر راستہ چھوڑ کر، ان اقدامات کو عالمی دباؤ اور بھارتی پریشر کے کھاتے میں ڈالنا اچھی حکمت کاری کا مظاہرہ نہیں۔

پانچ تنظیموں پر پابندی لگانے کا عمل واضح طور پر خارجی عوامل کا مرہون منت ہے اور اسے طے شدہ معمولات کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ جیش محمد اور لشکر طیبہ کا رشتہ جہاد کشمیر سے تھا۔ بھارت نے انہیں براہ راست مجرم قرار دے رکھا تھا۔ امریکہ نے پہل کرتے ہوئے ان پر پابندی لگائی اور اب ہم نے بھارت کے مطالبے پر صا د کر دیا ہے۔

اندرون ملک منافرت سے پاک ایک روشن خیال ذہنی، فکری اور مذہبی فضا کی تخلیق کے لئے صدر مشرف کے سارے اقدامات کو بھارت نے ”داخلی معاملہ“ قرار دے ڈالا ہے۔ اس کی خوشنودی اور کولیشن کے بڑوں کی دلجوئی کے لئے ہم اپنے تند و تیز جذبوں کے پرکاث کر جس ”جہاد اکبر“ کی طرف لوٹ آنا چاہتے ہیں، وہ اسے کوئی اہمیت دینے پر آمادہ نہیں۔ ہمارے مرنے پر بھی راضی نہ ہونے والے سنگمر کے تقاضوں کا پیٹ جانے کب اور کیسے بھرے گا۔

[14-01-2002]

جہاد اکبر (2)

صدر مشرف کی تازہ تقریر کا حتمی مسودہ شاید 12 جنوری کی سہ پہر کو تیار ہوا ہو لیکن اس کے نفس مضمون کے تقریباً تمام اہم نکات چار ماہ قبل، 11 ستمبر کو ہی طے پا گئے تھے۔ اب خبر ناموں میں جہادی اور دیگر اسلامی تنظیموں کے مراکز سر بہمہر کرنے کی جو جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں اور ان کے دفاتر پر چھا پوں ماور ان کے متعلقین کی گرفتاری کی جو تفصیل بیان کی جا رہی ہے، اس کی پیش بینی اور پیش گوئی انہی کالموں میں کی جا چکی ہے۔ یہ مان لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ ہم نے جس خشوع و خضوع کے ساتھ دہشت گردی کے خاتمے کی عالمی مہم میں شمولیت کی اور جبر و قہر کے ایک ناقابل دفاع وار کو اپنی سیاسی و سفارتی ہنرمندی سے تعبیر کر بیٹھے، اسے بہر حال اس موڑ تک آنا تھا۔ جس لمحے ہم نے مصلحت، حکمت، تقاضائے وقت اور نظریہ ضرورت کی دلیل کے سہارے طالبان کا سینہ چھلنی کرنے والی بندوق کے لئے اپنا کندھا پیش کر دیا، اسی لمحے ہم نے اس دستاویز پر بھی دستخط کر دیئے تھے کہ اب یہ کندھا ہر استعمال کے لئے حاضر ہے۔

عصبيت اور جانبداری کو جھٹک کر صورت حال کا معروضی جائزہ لیں تو بات ششے کی طرح واضح ہو جاتی ہے۔ ہم یہ سوچ کر مطمئن اور مسرور تھے کہ گیارہ ستمبر کو امریکی خوشنودی کی جوڑین برصغیر کے پلیٹ فارم پر رکھی تھی ہم کمال جا بکدستی سے اس پر سوار ہو گئے ہیں لیکن بھارت پوری دوڑ لگانے کے باوجود پائیدان تک بھی نہیں پہنچ پایا۔ ہم نے اقتصادی خوشحالی، سیاسی کامرانی، نارتی مقبولیت، کشمیر کا زکی سر بلندی اور ایٹمی صلاحیت کے تحفظ کی ساری خوش گمانیاں اس مغروضے پر قائم کیں کہ بھارت کی گاڑی ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئی ہے اور ہم مریخ خلأق بن چکے ہیں۔ یہ مغروضہ درست ثابت نہیں ہوا۔ ایک ایک کر کے گنتے جائیے۔ بھارت اور پاکستان دونوں ایٹمی قوتیں ہیں لیکن جنس بازار صرف ہمارا پروگرام بنا۔ 13 دسمبر کو بھارتی پارلیمنٹ پر حملے کے بعد صرف بھارت کے موقف کو پذیرائی ملی۔ جارج بش نے سب سے پہلے اس کا رشتہ 19

ستمبر اور ستمبر میں فلسطینیوں کے خود کش حملوں سے جوڑا۔ امریکہ نے بلا تاخیر جیش محمد اور لشکر طیبہ کو دہشت گرد تنظیمیں قرار دے ڈالا۔ ہم تصویر حیرت بنے یہ سب کچھ دیکھتے رہے اور بھارت نے آگے بڑھ کر توہین آمیز سفارتی جارحیت کے پیہم حملے شروع کر دیئے۔ سب نے بھارت کو حق بجانب قرار دیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی فوجیں ہماری سرحدوں پر آئینٹھیں اور واہجائی نے جارج بش کے سے فرعونی لہجے میں اعلان کیا ”ہم پاکستان کا حشر افغانستان جیسا کریں گے“ دنیا پھر بھی اس کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑی رہی۔

پھر تقاضا ہوا کہ ”پاکستان خیر چاہتا ہے تو“ کر اس بارڈر میز رازم“ ختم کرے۔ جیش محمد اور لشکر طیبہ سمیت جہادی تنظیموں پر پابندی لگائے۔ جہاد کشمیر کی عسکری پشت پناہی سے دستبردار ہو جائے۔“ ہمارا نقطہ نظر معلوم کئے بغیر امریکہ اور برطانیہ نے وہی راگ الا پنا شروع کر دیا۔ ٹیلی فون کالوں کا تانتا بندھ گیا کہ ہم وہ کرگزریں جو بھارت کہہ رہا ہے۔ پھر ایک تقریر کی نوید دے کر بھارت سے کہا گیا کہ وہ تسلی رکھے اور صبر سے کام لے۔ تقریر ہو گئی۔ شرق و غرب کا کوئی ملک ایسا نہیں جس نے اس تقریر کو خراج تحسین پیش نہ کیا ہو، یہاں تک کہ خود بھارت کو بھی ”مخاطب پذیرائی“ کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی بھارت کی گردن تنی ہوئی ہے۔ اب وہ اعلانات کو عملی اقدامات میں ڈھالنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ پھر ان اقدامات کی حقیقی افادیت کا جائزہ لیا جائے گا۔ پھر ہماری کارکردگی پر فتویٰ صادر ہوگا۔ سیدھا سادہ حساب یہ ہے کہ بھارت نے کوئی ایک بھی مثبت پیش رفت نہیں کی اور ہم قدم بہ قدم پسپا ہو رہے ہیں۔

بی بی سی کے مبصر نے کہا ہے کہ ”چندہ ہس سال پہلے ایک فوجی حکمران نے پاکستان کو جو سمت دی تھی، آج ایک دوسرا فوجی حکمران اسے مکمل طور پر دوسری سمت دے رہا ہے۔“ ان دونوں حکومتوں کے درمیان آتی جاتی سیاسی حکومتوں کو اپنے طور پر نئے کوئی مستحکم پالیسی بنانے کی اجازت ملی اور نہ ہی وہ پہلے سے موجود کسی پالیسی کا ناک نقشہ تبدیل کر سکیں۔ اگر انہوں نے کسی منزل یا سمت کے تعین کی جسارت کی تو انہیں گھر کی راہ دکھا دی گئی۔ اسلامی عسکریت، ایک مخصوص ماحول اور آب و ہوا میں پروان چڑھی۔ اس کا سارا الزام جنوں زدہ مولوی پر لگا دینا نا انصافی ہوگی۔ اگر ہم نے سچائی کا سامنا کرنے اور خلوص دل سے ملک کو ایک نیا رخ دینے کا عزم کر لیا ہے تو مسئلے کے حقیقی اسباب و محرکات سے چشم پوشی مناسب نہ ہوگی۔ جس طبقے کو آج مظہون کیا جا رہا ہے اس

کی نقش گری میں کس نے کیا کردار ادا کیا اور اس کے بازوئے صف شکن کی رگوں میں کون کون لہو بہن کر رواں رہا؟ کون ہے جس نے کئی برسوں سے ”تراشیدم، پرستیدم، شکستم“ کا مشغلہ اپنا رکھا ہے؟ صدر نے ”رٹ آف دی گورنمنٹ“ یعنی حکومت کے حکم و اختیار کو ہر قیمت پر نافذ کرنے کے عزم کا اعلان فرمایا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ”بین الاقوامی ایٹوز پرسیٹنڈ لینا کسی ایکہ فرد، ادارے یا سیاسی جماعت کا نہیں، حکومت کا کام ہے۔“ اصولی طور پر یہ باتیں سو فیصد درست ہیں لیکن ”رٹ آف دی گورنمنٹ“ کو موثر اور محترم بنانے کے لئے ”رٹ آف دی کانسٹی ٹیوشن“ کو یقینی بنانا ضروری ہوتا ہے۔ بلاشبہ تمام بین الاقوامی اور داخلی مسائل پر حتمی موقف حکومت وقت ہی اختیار کرتی ہے لیکن اگر وہ عوام کی اجتماعی قوت کی مظہر، منتخب جمہوری علامت ہو تو اس کے فیصلے زیادہ معتبر ٹھہرتے ہیں۔

”جہاد اکبر“ کی فضیلت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن اسے ”جہاد اصغر“ سے گریز کا بہانہ بہر حال نہیں بننا چاہئے۔ اسوہ رسول ﷺ سے تو یہی سبق ملتا ہے کہ جہاد اصغر سرحدوں پر کھڑا پکار رہا ہو تو جہاد اکبر خود بخود ساقط ہو جاتا ہے۔

[15-01-2002]

اک ذرا صبر

جی تو یہ چاہتا ہے کہ بے نام و نشان وادیوں میں گم ہو جانے والوں کو بھول جاؤں۔ یہ جان لوں کہ وہ کسی جابر جادوگر کے طلسم کا شکار ہو کر پتھر کے ہو گئے ہیں۔ اب کسی سرائے میں حسن بانو کے عشق میں آہیں بھرتے ”منیر شامی“ سے کسی حاتم طائی کی ملاقات ہوگی۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر منیر شامی کے سوالوں کا جواب تلاش کرنے کٹھن راستوں پر نکلے گا۔ ”حمام باؤ گرد“ کا جادو توڑنے کے بعد ممکن ہے وہ ”خلیج گوانا نامو“ کی طرف جائے اور کھلے آسمان تلے آہنی پنجروں میں بند انسانوں کو دیکھ کر انہیں رہائی دلوانے کا عزم کرے۔ لیکن تب تک جانے کتنی قیامتیں گزر جائیں۔ ممکن ہے اکیسویں صدی کا سامری، منیر شامی کو بھی گائے بھینس بنا کر ملاضعیف کے پڑوس والے پنجرے میں ڈال دے۔

امریکہ اور یہودیوں کے زیر اثر میڈیا اس غیر انسانی سلوک پر پردہ ڈال رہا ہے جو قندھار سے گوانا نامو پہنچائے جانے والے قیدیوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا ہے۔ اس درندگی کا نشانہ بالخصوص افغانی، پاکستانی اور عرب قیدی بن رہے ہیں جن کے بارے میں یقین کر لیا گیا ہے کہ وہ بے نام و نسب لوگ ہیں۔ نہ ان کا کوئی وطن ہے، نہ شناخت، نہ کوئی بستی، نہ کوئی شہر نہ کوئی شہریت۔ سنا ہے پاکستانیوں کا ایک ”ریوز“ کوہ ہندوکش کی اترائیوں میں بنے کسی ”باڑے“ میں بھی پڑا ہے۔

امریکہ جیسے مرکز علم و فضل، امیر تہذیب و تمدن اور سالار حکمت و فن ملک کے قائدین کرام اور جدید علوم سے آراستہ عالی نسب عوام نے ایک ایسا انسانی سرکس سجا رکھا ہے جس کے تذکرے سے پتھر کے زمانے کے انسانوں کو بھی پسینہ آجائے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں دبے دبے لفظوں میں بولنے لگی ہیں لیکن ”نکار خانے“ میں کوئی ان کی سننے والا نہیں۔ نیویارک میں قائم ”ہیومن رائٹس و اوج“ نامی تنظیم نے کہا ہے کہ امریکہ ضابطوں اور قاعدوں کے اندر رہے۔ تنظیم کے سینئر عہدیدار

کہتے تھے راتھ (KENNATHRATH) نے کہا ہے کہ ”ہمیں ان قیدیوں کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے جو ہم دوسروں کے ہاتھوں امریکی قیدیوں کے ساتھ چاہتے ہیں۔“ امریکن مسلم کونسل نے قیدیوں کی ڈاڑھیاں صاف کر دینے پر شدید تنقید کی ہے لیکن امریکیوں نے جواز پیش کیا ہے کہ جو میں پڑ جانے کے خدشے کے پیش نظر تمام قیدیوں کی گھنٹی داڑھیاں صاف کر دی گئیں۔ اس تک پچاس قیدی قندھار سے گوانٹانامو کے ایکس رے کیپ میں لائے جا چکے ہیں اور کم و بیش پانچ سو مزید قندھار ائر پورٹ کے بندی خانے میں انتظار کر رہے ہیں۔ ”ایکس رے کیپ“ لائے جانے والے قیدیوں میں ایک برطانوی قیدی بھی ہے جس کے بارے میں جان کر برطانوی حکومت اچانک سرگرم ہو گئی ہے۔

کولیشن کا اہم رکن اور صدر بٹش کا کنفٹس بردار ہونے کے سبب برطانیہ شعوری طور پر کوشش کرتا ہے کہ امریکہ کے خلاف کسی نوع کا حرف شکایت اس کے ہونٹوں پر نہ آئے۔ لیکن برطانوی قیدیوں کا علم ہونے کے بعد امریکہ میں برطانوی سفارت خانہ متحرک ہو گیا ہے اور سرکاری طور پر امریکہ سے کہا ہے کہ وہ برطانوی شہری کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرے اور سفارتی عملے کو اس سے رابطے کا موقع فراہم کرے۔ برطانوی وزارت خارجہ کی خاتون ترجمان نے کہا ہے کہ ”ہم نے امریکہ سے پوری تفصیلات مانگ لی ہیں اور یہ بھی پوچھا ہے کہ مزید کتنے برطانوی قیدی کہاں اور کس حال میں ہیں؟ لندن میں قائم ایمنسٹی انٹرنیشنل نے کہا ہے کہ قیدی کسی بھی نوعیت کے ہوں ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک اور این جی او، فیئر ٹرائلز ابراڈ (FAIR TRIALS ABROAD) کے ڈائریکٹر سٹیفن جیکوبی نے الزام لگایا ہے کہ ”امریکہ بین الاقوامی قانون کی کھلی خلاف ورزی کر رہا ہے“ انہوں نے کہا کہ ”میں اگلے چند دنوں میں یورپی پارلیمنٹ سے خطاب کر کے تمام یورپی ممالک پر زور دوں گا کہ وہ امریکہ کے اس غیر انسانی طرز عمل کا نوٹس لیں۔ یہ پوری کولیشن کی اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ امریکہ کو سرعام انسانی حقوق پامال کرنے کی اجازت نہ دے۔“ برطانیہ کی اس سرگرمی کو دیکھتے ہوئے امریکہ نے سرکاری طور پر یقین دلایا ہے کہ مذکورہ برطانوی قیدی سے اچھا سلوک کیا جا رہا ہے اور برطانیہ کو کوئی شکایت پیدا نہیں ہوگی۔

”ایکس رے کیپ“ کے ایک قیدی جان واکر (عبدالحمید) کے بارے میں امریکی انٹرنی

جنرل نے اعلان کیا ہے کہ اس پر عام امریکی عدالت میں، عام قانون کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا اور اسے کسی فوجی ٹریبونل کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ نیشنل سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں کیا گیا جس میں وزارت دفاع، وزارت خارجہ اور جسٹس ڈیپارٹمنٹ کے نمائندوں نے شرکت کی۔ چونکہ بیس سالہ جان واکر امریکی شہری ہے اس لئے اسے خصوصی سلوک کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ اب وہ گوانٹانامو کی سرزمین بے قانون کے بجائے ورجینیا کی ڈسٹرکٹ کورٹ کے سامنے پیش ہوگا۔ اگر اس پر عائد کئے گئے سارے الزامات ثابت ہو گئے تو بھی اسے زیادہ سے زیادہ عمر قید کی سزا ہو سکتی ہے۔

میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ کیوبا کا سمندر، امریکی کیمپ، اس کیمپ کے آہنی پنجرے، ان پنجروں کے سنگلاخ فرش پر پڑے بے ریش قیدی، پنجروں کے ارد گرد خاردار تاروں کا گھنا جنگل، سب کچھ بھول جاؤں لیکن یہ سخت جان قیدی خوابوں اور خیالوں میں بھی ہتھیار ڈالنے پر آمادہ نہیں۔

عرب قیدیوں کے وارث اپنے طور پر معلومات جمع کر رہے ہیں۔ طالبان کا قانونی وارث ”شہابی اتحاد“ ہے جس کے اپنے عارض و رخساران قیدیوں کے لبو کے مرہون منت ہیں۔ رہے پاکستانی..... تو ان کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں کہ وہ کہاں کہاں پڑے ہیں۔ علم ہو بھی جائے تو ہم محذور ہیں۔ بس وہ کچھ دن اور صبر کر لیں۔ انشاء اللہ جہاد اکبر، کی عظیم ذمہ داریوں سے فارغ ہوتے ہی ہم ان کی خیر خبر لینے آئیں گے۔

[18-02-2002]

اصلاحات

حکمرانی اپنے ساتھ ”خود انکشافی“ کا جوہر بھی لاتی ہے۔ صاحب حکومت پر اچانک انکشاف ہوتا ہے کہ وہ بے پناہ ذہنی و فکری صلاحیتوں کا مالک ہے اور قدرت نے اسے تاریخ کا دھارا موڑ دینے کے مینڈیٹ کے ساتھ اس منصب جلیلہ پر فائز کیا ہے۔ اس کے دسترخوان کے خوشہ چیں، اس کی ذات میں ایسی ایسی لائٹنی خصوصیات اور لافانی صفات تلاش کر لیتے ہیں جو خود حکمران کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ رفتہ رفتہ وہ ملک کی ترقی و خوشحالی، بقا و سلامتی اور استحکام و استقلال کو اپنی ذات کے ساتھ وابستہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ قوم کی عظمت و سر بلندی کی تمام روشن صفتیں اسے اپنے ماتھے سے طلوع ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ دل کی گہرائی اور خلوص کی پختگی کے ساتھ اپنے آپ کو نائزیر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسے اپنے حاشیہ خیال سے بھونٹے افکار اور ان افکار سے نمونپاتی اصلاحات ایک عظیم انقلاب نو کا دیا چاچہ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ کروڑوں انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اسے محض حشرات الارض دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اپنی اصلاحات کی راہ میں مزاحم قوتوں کو، پوری نیک نیتی کے ساتھ، ملک کا عدار اور قومی مفادات کا دشمن خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ معاملہ کسی خاص نظام، طریق انتخاب یا واردات کے ذریعے کرسی نشین ہونے والوں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جو بھی جس انداز سے بھی آیا، اس نے اپنے آپ کو اوتار جانا اور اصلاحات اس اعتماد کے ساتھ متعارف کرائیں جیسے وہ کسی ”صحیفے“ کی صورت میں نازل ہوئی ہوں۔ گزشتہ نصف صدی پر محیط تاریخ میں شخصی اور سیاسی حکمرانوں نے اپنے اپنے طور پر قوم کا مقدر بدلنے کی بڑی کوششیں کیں لیکن ہر ”انقلاب“ ایک نیا بحر ان دے گیا۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

سیاسی حکمرانوں کا ”زعم مسیحائی“ بہر حال کچھ حدوں کے اندر رہتا ہے۔ وہ نہ پارلیمنٹ کو پس پشت ڈال سکتے ہیں نہ رائے عامہ کو اور نہ شمشیر برہنہ بننے پر پس کو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں اپنی من پسند اصلاحات کا ناقوس بجاتے وقت ملک کے سب سے مضبوط ادارے کی حساسیت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ آئین میں کسی بھی نوع کی ترمیم کرتے وقت وہ بہر حال طے شدہ طریقہ کار کے پابند ہوتے ہیں اور اس بات کا امکان موجود رہتا ہے کہ ان کی خواہشات پارلیمنٹ میں پذیرائی نہ پاسکیں۔ شریعتِ مل کا معاملہ ہمارے سامنے ہے۔

فوجی حکمرانوں کی اصلاحات اور ان کے نتیجے میں ہونے والی آئینی ترمیم زیادہ مستحکم اور پائیدار ہوتی ہیں۔ وہ کسی ضابطے کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ ہر قسم کے پریشور اور ہر نوع کی مشاورت سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے افکار بلند اور جبلت انقلاب کی بدولت ایسی ”دور رس اصلاحات“ کی بنیاد رکھتے ہیں کہ آنے والی پارلیمنٹ بھی ان کی بے ادبی نہیں کر سکتی اور اگر کوئی کرے تو خود عبرت کا نشان بن جاتی ہے۔ آئین میں سات ترمیم تو بھٹو مرحوم کے دور میں ہو گئیں۔ لگ بھگ اتنی ہی 1988ء کے بعد کی سیاسی حکومتوں نے کر ڈالیں لیکن جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں کی جانے والی آٹھویں ترمیم کو بجا طور پر ”ام الترمیم“ یعنی تمام ترمیموں کی ماں کہا جاسکتا ہے۔ یہ ترمیم 1973ء کے آئین کی حقیقی روح قرار پا چکی ہے۔ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو، دونوں دودو بار اس سوارخ سے ڈسے گئے اور جب انہوں نے مومنانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے تیسری بار ڈسے جانے کے خطرے کا سدباب کر دیا تو آٹھویں ترمیم کی سخت جان روح نے بہ اندازہ گرشب خون مارا۔ پہلے تو گستاخی کا ارتکاب کرنے والے ناہنجار صرف حکومتوں سے خارج ہوتے تھے۔ اب کے ملک سے بھی نکال دیئے گئے۔

این آر بی کی طرف سے انتخابی اصلاحات کا جو خاکہ سامنے آیا ہے اس کا نفاذ بنیادی آئینی ترمیم کے بغیر ممکن نہیں لیکن فوجی حکومتیں اصلاحاتی پیکیج کے لئے کسی سہارے کی محتاج نہیں ہوتیں۔ اس کا پر جوش جذبہ اصلاح خود بخود حکمتِ عملی کے پیکر تراشا، قواعد کی شکل پاتا، فرمان کا روپ دھارتا اور اطلاق کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ قومی اسمبلی کی نشستوں میں اضافہ، امیدواری کے لئے گریجو ایشن کی شرط، خواتین اور میکونو کریش کے لئے خصوصی نشستیں، مخلوط طرز انتخاب اور جزوی طور پر مناسب نمائندگی کے بارے میں کوئی نعرہ تسمین بلند کرے یا صدائے

احتجاج، کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بہت سے دوسرے ثمرات کی طرح اصلاحات کو بھی نئے موسم کی سوغات سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے۔ احتجاج، ٹکراؤ، تصادم اور مزاحمت سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ انتخاب کی منزل تک صبر شکر سے کام لینے اور پتہ مار کر ہر تلخ گھونٹ خندہ پیشانی سے پی جانے کی ضرورت ہے۔ سیاستدانوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ دو تہائی اکثریت کی حامل مضبوط و مستحکم جمہوری حکومت کا دفتر لپٹنے کے لئے نوابزادہ نصر اللہ خاں جیسے مرد بزرگ کی ایک مرل سی زقند بھی کافی ہوتی لیکن فوجی حکومت کے سنگ خارہ سے جمہوریت کے چند قطرے کشید کرنے کے لئے بھی کوہکن کا جگر چاہئے۔

بہتر یہی ہے کہ اکتوبر 2002ء تک این آر بی کا ہر فرمان مقدس جانتے ہوئے اسے من و عن قبول کر لیا جائے۔ آئین کے تقدس، مثالی جمہوریت یا اس نوع کے دوسرے خرخشوں سے دل جلانے اور اپنی منزل کھوئی کرنے سے کیا حاصل؟ یوں بھی یہ وہ موسم نہیں جب پارلیمنٹ کے اتفاق رائے سے منظور ہونے والی دستوری ترامیم ”شاہراہ دستور“ کا خس و خاشاک بنا دی جائیں۔ جلسوں کے جلوے، جلوسوں کا جل تھل، ریلیوں کی ریل پیل اور دھرنوں کے دھارے اس طرح کے موسموں میں اچھے نہیں لگتے۔ آخر کبھی نہ کبھی جمہوری حکومت تو بننی ہی ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

[19-01-2002]

قدھار کا نوآباد قبرستان

ملا یا محمد اخوند بھی ایک خونخوار ڈیزی کٹر کا نشانہ بن گیا اور مجھے خبر ہی نہ ہوئی۔ خبر کون دیتا؟ افغانستان میں امن و انصاف اور جمہوری اقدار کا بول بالا ہے۔ برسوں بعد مہذب دنیا کے بڑے بڑے راہنما کاہل کا دورہ کر رہے ہیں۔ حامد کرزئی پچھے بدل بدل کر مرصع انگریزی میں انہیں خوش آمدید کہہ رہا ہے۔ کروڑوں ڈالر کے خمد اکاؤنٹس واگزار ہو رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی، علم و حکمت اور ترقی و خوشحالی کے سحر میں مبتلا اہل پاکستان کو اس بات سے کیا واسطہ کہ طالبان سے محروم افغانستان کس حال میں ہے؟ لیکن معتبر امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اپنی ایک مفصل رپورٹ میں بتایا ہے کہ قدھار کے کوچہ بازار اداس ہیں اور لوگ ابھی تک اپنے مرد جری کو نہیں بھولے۔ گئے دنوں کی یادیں انہیں اب بھی ستاتی اور خون کے آنسو رلاتی ہیں۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ شہر سے ذرا دور، ایک گلی کے سرے پر کبھی ایک وسیع میدان ہوتا تھا لیکن اب وہ تازہ قبروں سے بھر گیا ہے۔ یہ قبریں عربوں، پاکستانیوں اور یار غیر سے آنے والے ان "دہشت گردوں" کی ہیں جو پچھلے دو تین ماہ میں امریکی انصاف کی بھینٹ چڑھ گئے۔ نئی نوپلی 74 قبروں میں سوئے ان اجنبیوں کو کبھی غیریت اور تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ وہاں ہمہ وقت ایک جشن کا سماں رہتا ہے۔ لوگ اپنے بیمار بچوں اور عزیزوں کو لے کر یہاں جمع ہوتے، مغفرت کی دعائیں مانگتے، قبروں پر رکھے چھوٹے چھوٹے خوبصورت گول پتھروں کو نسخہ شفا جان کر اپنے جسوں سے مس کرتے اور نیک پاک روحوں کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ دن طلوع ہوتے ہی قدھار کے لوگ اس مقدس قبرستان کا رخ کرتے، سنگ ہائے مزار کو بوسے دیتے اور تسکین پاتے ہیں۔ نوعمر لڑکوں کے غول پاس پڑوس کی گلیوں میں گھات لگا کر کھڑے رہتے ہیں۔ جونہی کوئی غیر ملکی تصویریں بنانے اس قبرستان میں آتا ہے، اس پر نامعلوم سمتوں سے پتھروں کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔

ایک عرب ”دہشت گرد“ کی قبر کے سر ہانے بیٹھے، پینسٹھ سالہ بوڑھے، شیر محمد نے روتے ہوئے کہا ”یہ ساری قبریں میرے بچوں کی ہیں۔ ساری کی ساری۔ میرا اور ان کا رشتہ اللہ اور اس کے رسول نے قائم کیا ہے۔“

قدحار میں تین ہزار امریکی سپاہیوں کی موجودگی کے باوجود امن و امان کی صورت حال انتہائی تشویشناک ہے۔ گہرے خوف کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ کسی کی جان محفوظ ہے نہ مال۔ مختلف دارالارز کے مسلح دستے دعدا تے پھر رہے ہیں۔ گورنر گل آغا فرعونیت اور بربریت کی علامت کے طور پر مشہور ہے۔ پینتیس سالہ عبدالہادی کا کہنا ہے ”ہمیں آزادی یقیناً اچھی لگتی ہے لیکن جان اور مال کا تحفظ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ طالبان کے زمانے میں ہم اور ہماری عورتیں بلا خوف و خطر جہاں جی چاہے آتے جاتے تھے۔ چاہے دن ہو چاہے رات۔ اب ہم اپنی کلاشکوفیں اپنے سر ہانے رکھ کر سوتے ہیں۔ اب ہم موسیقی سن سکتے اور ڈازھیاں منڈوا سکتے ہیں لیکن گانوں سے پیٹ نہیں بھرتا۔ کوئی ہم سے پوچھے کہ انتہا پسندی بہتر ہے یا بے یقینی اور عدم استحکام؟ تو ہم کہیں گے ”انتہا پسندی۔“

میرولیس ہسپتال کے نرسنگ سکول کی ایک طالبہ نے کہا ”طالبان کے زمانے میں ہمارے سکول کی لڑکیاں پردے میں رہتی تھیں۔ انہیں ایسی بسوں میں لایا جاتا تھا جن کی کھڑکیوں پر بھی پردے تھے۔ موسیقی اور پارٹیوں کی بھی اجازت نہ تھی۔ اب سکول کے اندر کا ماحول کافی کھلا ہے لیکن باہر کے حالات انتہائی خوفناک ہیں۔ ہم بے حد پریشان ہیں۔ چاروں طرف مسلح غنڈے پھر رہے ہیں اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ اٹھارہ سالہ نرس طالبہ فاطمہ نے کہا ”مجھے ان بددوق برداروں سے نفرت ہے۔ میں تو صرف پڑھنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی عمر میں طالبان کے دور سے زیادہ مستحکم اور اچھا دور نہیں دیکھا۔“ ”انتہا پسندی“ کے اس دور میں، میں کسی خوف و خطر کے بغیر پڑھ سکتی تھی۔ اب ایسا نہیں۔“ ”مجھے ”واٹسٹن پوسٹ“ ہی کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ ملایا محمد انونڈ بھی شہید ہو گیا۔ اس کی قبر بھی قدحار کے اسی نوآباد قبرستان میں ہے جس پر مختلف رنگوں کے تھوٹے بڑے پتیلی پتھر رکھے ہیں۔ قبر کے آس پاس لکڑی کے کھمبوں پر گولے نارنی والے رنگارنگ پتوں کا جھرمٹ ہے۔ ایک بڑے بڑے پرچم پر پشتون زبان میں لکھا ہے ”یہ یار محمد خان انونڈ کی آخری آرام گاہ ہے۔ اس نے بچپن ہی سے مذہبی تعمیرات صل

کی..... وہ سال ہا سال تک روسیوں سے لڑتا رہا..... اس نے قید و بند کی سختیاں جھیلیں..... وہ سنگت میزائل چلانے کے فن میں یکتا تھا..... اس نے طالبان کے ساتھ مل کر اسلام دشمنوں کے خلاف جہاد کیا..... اس نے ہرات میں بیس مدرسوں کی بنیاد رکھی..... وہ کافروں سے لڑتا ہوا شہید ہو گیا..... اللہ اس کی مغفرت کرے۔“

ملا یار محمد خان اخوند کا سرخ و سپید چہرہ اس طرح میری نگاہوں کے سامنے ہے جیسے وہ ابھی مجھ سے مل کر رخصت ہوا ہو۔ سات سال قبل فریبی مائل جسم والے گورے چھپے پنھان نے ہرات کے ائر پورٹ پر ہمارا استقبال کیا تھا۔ تب وہ ہرات کا گورنر تھا۔ باغ آزادی کے وسیع سبزہ زار میں فرشی نشست پر رات کا کھانا اس نے ہمارے ساتھ کھایا تھا۔ کم کم بولنے والے اس مجاہد کا نشانہ بلا کا تھا۔ اس نے سنگت میزائلوں، توپوں، ٹینکوں اور آر پی جی گنوں کی مدد سے روس کے اکیس طیارے مار گرانے کا ریکارڈ قائم کیا تھا۔ جب روسیوں نے دھاوا بولا تو اس کی عمر پچیس چھبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ گھر سے نکلا اور پھر گھر کا راستہ بھول گیا۔ برسوں مولوی نبی محمد محمدی کی حرکت انقلاب اسلامی اور مولوی یونس خالص کی حزب اسلامی کے پرچم تلے لڑتا رہا۔ ایک جبری اور زور آور کمانڈر کی حیثیت سے اسے زبردست شہرت حاصل ہوئی۔ سنگناخ پہاڑوں میں کھو جانے والے دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کا چہرہ گلزار ہو رہا تھا۔ باغ آزادی میں محفل جمی تھی کہ مجھے ایک ضروری ٹیلی فون کرنے گورنر ہاؤس جانا پڑا۔ ملا یار محمد نے اپنی واسکٹ کی جیب سے ٹیلی فون کے بکسے کی چابی نکال کر میرے حوالے کی۔ درجنوں نیزھی میٹھی گلیوں سے گزرنے کے بعد میں جس کوارٹرنما مکان میں پہنچا وہ گورنر ہاؤس تھا۔ نہ کوئی گارڈ، نہ سپاہ، نہ پرچم، نہ نیزہ بردار، نہ دربان نہ نگہبان۔ چھیالیس سال کی عمر میں شہادت پانے والا یہ مجاہد قندھار کے نئے قبرستان میں ”مانوس اجنیوں“ کے کندھے سے کندھاملائے گہری نیند سو رہا ہے۔ ”بتان رنگ دخوں“ سے پاک یہ قبرستان قندھار والوں کی آماجگاہ ہے۔ وہ ساری قبروں پر جھاڑو لگاتے، سب کو خوبصورت پتھروں کی مالائیں پہناتے، سب کو پرچموں سے سجاتے، سب کے لئے دعائیں مانگتے، سب کی پاک روجوں کی خوشنودی چاہتے ہیں لیکن عرب نوجوانوں کی قبریں انہیں بہت زیادہ عزیز ہیں۔ ریزھا کھینچنے والے بوڑھے شیر محمد نے کہا ”یہ میرے رسول ﷺ کے گھر سے آئے ہوئے مہمان تھے۔“

[20-01-2002]

جبر و اختیار (1)

سابق وفاقی وزیر اور معروف دانشور جناب مشاہد حسین نے ادارہ نوائے وقت ریشن کے زیر اہتمام پروگرام ”ایٹو آف دی ڈے“ میں تقریر کرتے ہوئے بعض اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ انہوں نے فوجی اور سول حکومتوں کی کارکردگی کا بھی مختصراً موازنہ کیا ہے اور قومی معاملات کے حوالے سے وسیع تر مشاورت پر زور دیا ہے۔ اسی سے ملتا جلتا مطالبہ اے آر ڈی نے بھی اپنے حالیہ اجلاس میں کیا ہے لیکن آج کل کچھ اس طرح کے ہیں کہ حکومت ایک طے شدہ پالیسی پر سختی سے کاربند رہنے کا پختہ ارادہ کئے بیٹھی ہے اور رویے تبدیل ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ رویوں میں تبدیلی کی دو ہی ممکنہ شکلیں ہیں۔ ایک یہ کہ قوم کی اجتماعی دانش جب کسی نتیجے پر پہنچے تو مقتدر قوتیں اپنی محدود بصیرت کو انا کا مسئلہ بنا کر اس دانش کے تقاضوں کا راستہ نہ روکیں۔ فطری عوامل کو فطری انداز سے بروئے کار آنے اور منطقی نتائج تک پہنچنے میں مدد دیں۔ دوسرا محرک غیر اختیاری اور جبری نوعیت کا ہوتا ہے۔ یہ محرک، قوموں کی زندگی کے کسی اہم موڑ پر اچانک سامنے آکھڑا ہوتا ہے اور گریز و فرار کے سارے راستے بند کر دیتا ہے۔ کڑی آزمائش کی اس گھڑی میں نازک مزاج قوتوں کو بھی اپنی انا کی کلفی جھکانا پڑ جاتی ہے اور دل پر پتھر رکھ کر ایسے فیصلے کرنا پڑ جاتے ہیں جن کا عام حالات میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ہم ان مراحل سے کئی بار گزر چکے ہیں۔ مشرق پاکستان میں جو اضطراب سال ہا سال پرورش پاتا رہا، اس کا حقیقت پسندانہ ادراک کرنے اور جرأت مندانہ اقدامات اٹھانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی۔ چھوٹے چھوٹے مطالبات کو حب الوطنی اور قومی مفاد کے ترازو میں اس طرح تو لا گیا کہ ذرا سی کم وزنی، غداری قرار پائی۔ ایک عشرے پر محیط مارشل لاء نے سیاسی جذبات و احساسات کو اس طرح کچلا کہ محاذ آرائی اور تصادم کے سوا ساری راہیں مسدود ہو گئیں۔ 1970ء

میں جو کچھ ہوا اسے صرف مجیب الرحمن کے بے چلک رویے، ذوالفقار علی بھٹو کی ہوس اقتدار اور اندرا گاندھی کی خوئے بد کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ یہ برسوں پر محیط ان غیر سیاسی اور غیر حکیمانہ رویوں کا منطقی نتیجہ تھا جو ایک آمرانہ نظام کی آغوش میں پلتے رہے۔ جو معاملات افہام و تفہیم، ایک دوسرے کے نقطہ نظر کے احترام اور اپنی اپنی انا کی قربانی سے طے پا سکتے تھے، وہ تلووار زنی کا بہانہ بن گئے۔ یہاں تک کہ قائد اعظم کا پاکستان دولخت ہو گیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ جس وقت ڈھاکہ کے پٹنن میدان میں پاک فوج ہتھیار ڈال رہی تھی اس وقت صدر جنرل یحییٰ خان قوم کو ایک نیا آئین عطا کرنے کی تقریر دلہندہ بری کی مشق فرما رہے تھے۔

سقوط ڈھاکہ کی المناک داستان ایک ایسے افسانے کی طرح بھلا دی گئی جس کا کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور جسے محض تفریح طبع یا ضیافت فکر کا سامان خیال کیا جاتا ہے۔ گاڑی تو چل پڑی لیکن گاڑی بانوں کے تیور نہ بدلے۔ سقوط ڈھاکہ کے محرکات و اسباب اور نتائج و اثرات کی تفصیلات افق تا افق پھیلی ہوئی ہیں لیکن ایک بات ہر محرک پر حاوی ہے کہ سیاسی مسائل بندوق سے حل نہیں کئے جا سکتے۔ مقبول سیاسی قیادتوں کو نابود کر کے پائیدار جمہوری نظام قائم نہیں کیا جا سکتا اور شفاف عوامی رائے کی اجلی قبا میں اپنی مرضی و منشا کے پیوند نہ لگائیں، چاہے وہ ریشم کے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ سقوط ڈھاکہ کے قومی المیے کا عنوان حلی ہے لیکن ہماری دشت نور دی کا عالم آج بھی وہی ہے۔ وہی پاؤں، وہی کانٹے، وہی آبلہ پائی۔

11 ستمبر کو امریکہ اپنی تاریخ کا المیہ خیال کرتا ہے لیکن یہ دن پاکستان کے نظریاتی خمیر اور قومی ضمیر کے لئے بھی کسی المیے سے کم نہیں۔ تاویلات کو ایک طرف رکھئے۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ کسی دل میں بھی اطمینان و سکون اور کسی ذہن میں بھی سرخوشی کی کیفیت پیدا نہیں کر رہا۔ خود صدر مشرف ان خوفناک نتائج کا بھیا تک نقشہ قوم کے سامنے رکھ چکے ہیں جو امریکی کولیشن کا حصہ نہ بننے کی صورت میں ہمارا مقدر بنتے۔ یہ آہنی جبر کے نتیجے میں اختیار کیا جانے والا راستہ ہے۔ ان سوالوں کا جواب سوچنے کا وقت ہی نہ تھا کہ ہمارے کون کون سے قومی اہداف پر کس کس نوع کی ضرب لگتی ہے۔ جداگانہ نظریاتی تشخص کس کس کرب سے دوچار ہوتا ہے۔ افغان پالیسی اور کشمیر کا زپر کیا گزرتی ہے اور اس قومی بانگین میں کتنی دراڑیں پڑتی ہیں جو آج تک بھارت کے سامنے ہر پاکستانی کا سرمایہ افتخار تھا۔

یہ ہماری قومی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ تلخیوں کا جو زہر ہمارے حلق سے اتر رہا ہے اور جسے ہم اپنے چہرے کے تاثرات کے ذریعے شہد سے زیادہ شیریں اور لذیذ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، درحقیقت ہمارے سروں پر لگتی تنگی تلوار کا کرشمہ ہے۔ شدید نوعیت کے خارجی دباؤ اور جبر کے تحت ہم بعض نامطلوب اقدامات پر مجبور ہو گئے ہیں لیکن داخلی طور پر کیفیت مختلف ہے۔ حکومت کسی جبر، دباؤ، ہلکی سی تشویش بلکہ ذرا سی خفگی کے احساس سے بھی بے نیاز ہے۔ دینی جماعتیں سیلابی ریلے سے بچاؤ کی فکر میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ سیاسی محاذ پر سکوت مرگ طاری ہے اور عوام لاطعلق کا لحاف اوڑھے سو رہے ہیں۔ اس داخلی صورتحال کی سازگاری نے حکومت کو ایسی راہ پر ڈال دیا ہے جو نئے مسائل کے گھنے جنگل کو نکلتی ہے۔ قومی معاملات کے اہم حصے کو خارجی جبر کے سپرد کرنے اور اسی جبر کی ڈکٹیشن پر بعض ناگوار اقدامات کرنے پر مجبور حکومت، داخلی سیاسی آئینی، تہذیبی اور معاشرتی منصوبہ بندی کے لئے اپنے آپ کو ہر نوع کے جبر یا جوابدہی سے آزاد خیال کرتی ہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح معاملات کا ایک حصہ اس نے خارجی جبر کے سپرد کر دیا ہے، بالکل اسی انداز میں معاملات کا ایک حصہ وہ اپنے جبر کی دستبرد میں رکھنا چاہتی ہے۔ گویا اس نے قومی اصلاح کے جذبہ بے اختیار شوق کو اپنے انداز و اسلوب کے مطابق پوری قوت سے نافذ کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

[21-02-2002]

جبر و اختیار (2)

حالات و واقعات کا جبر ”کاتب تقدیر“ کی طرح ایسے فیصلے رقم کرتا یا کرائے چلا جاتا ہے جن میں کسی طرح کی تراش خراش کسی کے بس میں نہیں ہوتی۔ جب اس جبر کے ڈانڈے خارجی محرکات سے ملتے ہوں تو بے چارگی اور بھی بڑھ جاتی ہے لیکن جن مسائل کے بارے میں کوئی دکھائی دینے والا جبر نادر و اموجود نہیں ہوتا، ان کی نزاکت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کر دینا چاہئے کہ جواب طلبی یا باز پرس کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ آزادانہ اختیار، ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ ہوتا ہے جسے سہارنے کے لئے بے پناہ صبر و تحمل اور زبردست توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

پاکستان داخلی اعتبار سے پھر ایک دور ہے پر کھڑا ہے۔ آئین موجود ہے لیکن موثر نہیں۔ ملک اسلامی جمہوریہ ہے لیکن ”اسلام“ اصلاحات کی کنکھالی میں پڑا ہے اور ”جمہوریت“ نئے تجربات کی بھٹی میں سلگ رہی ہے۔ سیاسی جماعتیں حکومت سے فاصلے پر کھڑی ہیں اور عوام کے جذبہ و احساس کی سچی ترجمانی کرنے والا کوئی فورم موجود نہیں۔ ملک کے ایک اہم اور بنیادی ادارے کی حیثیت سے فوج کے کردار کو نظر انداز کرنا یقیناً حقیقت پسندی نہیں۔ پاکستان مستقلاً جس طرح کی صورتحال سے دوچار چلا آ رہا ہے، اس کا اولین تقاضا ہے کہ فوج اپنی بھرپور توجہ ملکی دفاع پر مرکوز رکھے اور اس کی توانائیوں کی ایک ایک رمت اس مقدس فریضے کے لئے وقف ہو۔ پاکستان کے عوام کی بھرپور اکثریت فوج کے ساتھ ذہنی و جذباتی وابستگی رکھتی ہے اور یہ تعلق ہی فوج کی قوت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔ سیاست کی آلائشیں فوج کی بیروں سے جتنی دور رہیں، اتنی ہی یہ وابستگی پختہ اور مضبوط تر ہوتی ہے۔

ہماری آئینی تاریخ تلخ تجزیوں سے بھری پڑی ہے۔ پہلا آئین ایک مارشل لاء کی نذر ہوا۔ دوسرا آئین دوسرے مارشل لاء نے ہڑپ کر لیا۔ تیسرا آئین قائد اعظم کے پاکستان کے طے سے

برآمد ہوا۔ سقوط ڈھاکہ کے گہرے دکھ اور قومی تاریخ کی سب سے افسوسناک ہزیمت سے پیدا ہونے والے احساس غم نے 1973ء کے آئین کو عمومی اتفاق رائے کا جامہ پہنایا۔ گویا ہم بہت بڑے زیاں اور بہت بڑی قربانی کے بعد ایک متفقہ آئین کی منزل مراد تک پہنچے لیکن آدھے ملک کی قیمت پر حاصل کیا جانے والا یہ تیسرا آئین، تیسرے مارشل لاء نے الماری میں مقفل کر دیا اور آج بھی کسی تہہ خانے کے تاریک گوشے میں پڑا یہ آئین، اکیسویں صدی کے سورج کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔

فوج خلوص دل سے اصلاح احوال کے جو عزائم رکھتی ہے، ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں لیکن بہتر ہوگا کہ ماضی کے تجربات کو پیش نظر رکھا جائے۔ مولانا مودودی مرحوم نے ایک دفعہ فرمایا تھا ”ہمارے حکمران پرانی غلطیاں نہیں دہراتے، وہ نئی غلطیاں کرتے ہیں۔“ مولانا کو رخصت ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں اور شاید نئی غلطیوں کی گنجائش بھی تمام ہو چکی ہے لہذا خدشہ ہے کہ پھر سے انہی غلطیوں کو دہرانے کا عمل شروع نہ ہو جائے جو سیاسی عدم استحکام، جمہوری اداروں کی غارتگری اور قومی تشخص کے ضعف کا سبب بنتی رہی ہیں اور ایک مستحکم دستوری نظام کو بار بار جھٹکے دے رہی ہیں۔ مولانا ہی کا قول ہے کہ ”غلطی کبھی بانجھ نہیں رہتی۔ وہ مسلسل بچے دیتی رہتی ہے۔“ یوں لگتا ہے کہ ماضی کی کثیر العیال غلطیوں کی اولاد اب جوان ہو کر نسل کشی کے قابل ہو چکی ہے اور ہمارے قومی امور چاروں طرف سے ان کے زرعے میں ہیں۔

پاکستان کے عوام جمہوری نظام کا سب سے نحیف عنصر خیال کئے جاتے ہیں۔ ان کی آزادانہ مرضی و منشا کو آزاد فضا میں پھولنے پھولنے کا موقع کبھی میسر نہیں آیا۔ اس کے اسباب سب کے سامنے ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ جمہوری عمل کی بحالی کو اکھاڑ پچھاڑ سے الگ رکھتے ہوئے عوام پر اعتماد کیا جائے اور انہیں کسی قدغن کے بغیر یہ دستوری حق دیا جائے کہ وہ اپنے حکمران خود چنیں اور مسلمہ جمہوری روایات کے تحت خود ہی ان کا محاسبہ کریں۔ پسند کے سیاستدانوں کی سرپرستی، پسند کے انتخابی اتحادوں کی صورت گری، پسند کی آئینی ترامیم، پسند کے الیکشن کمیشن، پسند کے انتخابی قواعد اور پسند کے نتائج کا پرانا کھیل ترک نہ کیا گیا تو ساری آلائشیں جوں کی توں موجود رہیں گی۔ اگر قواعد و ضوابط کا مقصد کچھ کا راستہ بند اور کچھ کی راہیں کھلے کر بنا ہوا تو آنے والا وقت ہمیں اسی آشوب کی دلدل میں دھکیل دے گا جس سے نکلنے کی تگ و دو کی جارہی ہے۔ انتخابی

اصلاحات کے عمل کو سیاسی عناصر کی مشاورت سے دور رکھا گیا تو افہام و تفہیم کی وہ فضا پیدا نہیں ہو سکے گی جو ایک ہموار، پائیدار اور سازگار جمہوری عمل کے لئے ناگزیر ہوتی ہے۔ گملوں میں لگائی گئی پیٹری کبھی تناور درخت نہیں بنتی۔ اسے زرخیز مٹی اور فطری آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔

اگر ہم نے خارجی جبر کے تحت بعض تلخ اور ناگوار ذائقوں کو گوارا بنا لیا ہے تو کسی داخلی جبر کا انتظار کئے بغیر قومی تقاضوں کے بارے میں بھی حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کر لینا چاہئے سب کچھ ”کاتب تقدیر“ کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے بجائے خود اپنی تقدیر سازی پر کھلے دل و دماغ کے ساتھ توجہ دینی چاہئے۔ ”کاتب تقدیر“ کا حکم بھی یہی ہے۔

شعوری اور اختیاری فیصلوں کو زیادہ سے زیادہ معقول، زیادہ سے زیادہ قابل قبول، اور زیادہ سے زیادہ معتبر بنانے کیلئے تھوڑی سی چلک، تھوڑی سی فراخ قلبی اور تھوڑی سی وسعت نظر، پاکستان کا مقدر سنوار سکتی ہے۔ یہ سبق بہر حال نہیں بھولنا چاہئے کہ غلام گردشوں کا طواف کرنے والے سیاستدان، نا اور دوسروں کی گردنیں اڑا کر اپنا قد اونچا کرنے والے ”رہنما“ بھنور میں پھنسی کشتی مارے تک لانے کے بجائے اس کا بوجھ بن جاتے ہیں۔

حجی اور مخلصانہ حکمت کاری کا مرکزی نکتہ صرف ایک ہی ہونا چاہئے۔ ”عوامی رائے کے آزادانہ اظہار کے منصفانہ مواقع فراہم کرنا اور اس کے فیصلے کو دل و جان سے تسلیم کر لینا۔“

[22-01-2002]

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

www.KitaboSunnat.com

اپنی پسند کا جواب تراشنے کی بے پناہ صلاحیت رکھنے کے باوجود اپنے آپ سے یہ سوال پوچھتے رہنے میں کوئی ہرج نہیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟

بھارت 11 ستمبر کے بعد سے سفارت کاری کی فتنہ پرور حسینہ کے خدوخال سنوارنے اور اسے عالمی توجہ کا مرکز نگاہ بنانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ یہ کوششیں ایک منصوبہ بند پلان کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ یکم اکتوبر کو سفارت کاری کی اس دہن کے رخسار سری نگر اسمبلی پر حملے کے غازے سے آراستہ کئے گئے۔ 13 دسمبر کو اس کے ماتھے پر نئی دہلی کی واردات کا جھومر بجایا گیا اور 22 جنوری کو اس کی مانگ میں کول کتہ کے ڈرامے کا سینڈور بھرا گیا۔ ابھی بہت کچھ ہونا ہے۔ ابھی تو اس کے ہاتھوں میں مہندی رچے گی، اس کی آنکھوں میں کاہل بے گا اور اس کی پلکوں پر ستارے جھللائیں گے۔

مان لینا چاہئے کہ ہماری انقلاب آفریں قیادتوں نے وسیع تر اصلاحات اور اپنے من پسند فلسفہ حکمرانی کے زیر اثر جو کچھ کیا، اس نے ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے کو تباہ کر دیا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں شاہراہیں، پل، ڈیم، کارخانے، فلاحی ادارے اور دفاعی منصوبے سیاست زدگی کا شکار ہو کر برسوں بچ و تاب کھاتے اور اکثر جاں بحق ہو جاتے ہیں، اسی طرح قومی عظمت و سر بلندی کے ضامن ادارے بھی کوئی کار خیر کرنے کے بجائے ٹوٹ پھوٹ کا شکار اور خود اپنی بقاء کے مسئلے سے دوچار رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہم خسارے میں ہیں۔ کشمیر ہماری اس بے حکمتی کا شاہکار ہے۔ بھارت ہزاروں عصمتیں غارت کرنے، اسی ہزار انسانوں کے سینے چھلنی کرنے اور انسانی حقوق کی بدترین پامالی کے باوجود ”دہشت گردی“ کا شکار ہے اور ہم کشمیر کا مضبوط ترین مقدمہ رکھتے ہوئے بھی بے چارگی سے تماشائے اہل کرم دیکھ رہے ہیں۔ مذمت بھی کرتے ہیں تو اس ہڑبڑاہٹ کے ساتھ کہ کوئی دوسرا بازی نہ لے جائے۔ کول کتہ کے ڈرامے کے سارے عناصر

ترکیبی بھی طے شدہ انداز میں جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ امریکن سینٹر پر حملہ اور بھارتی سیکورٹی گارڈز کی ہلاکت کا سین لکھنے والے ”سکرپٹ رائٹر“ نے بڑی مہارت کے ساتھ بھارت اور امریکہ کو بیک وقت ہدف بنا کر، پاکستان کو دونوں کے مشترکہ مجرم کے طور پر کٹھرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔

نئی دہلی میں کاہینہ کی سیکورٹی کمیٹی نے ایک ہنگامی اجلاس میں سرکاری ردعمل کے نقوش تیار کئے ہیں۔ وزیر داخلہ ایل کے ایڈوانی نے فرمایا ہے کہ ”واردات کا کھرا ایسی مسلم دہشت گرد تنظیموں تک جاتا ہے جو پاکستانی انٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کی گود میں پروان چڑھ رہی ہیں۔“ انہوں نے مزید کہا ہے کہ ”امریکن سینٹر پر حملے سے واشنگٹن اور نئی دہلی کے درمیان دہشت گردی کو کچلنے کے لئے تعاون اور اشتراک عمل میں مزید اضافہ ہوگا۔“ بھارتی وزارت خارجہ کا کہنا ہے کہ ”واردات کے پیچھے دہلی میں مقیم فرحان عرف آفتاب ملک نامی شخص کا ہاتھ ہے جس کا تعلق حرکت جہاد اسلامی اور حرکت المجاہدین سے ہے اور یہ دونوں تنظیمیں آئی ایس آئی کے زیر اثر ہیں۔“ نائب وزیر داخلہ آئی ڈی سوامی نے فرمایا ہے کہ ”ہمارا اندازہ ہے کہ اس طرح کے واقعات کے پیچھے بھارت کے خلاف پر کسی وارلڈ نے والوں کا ہاتھ ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ مشرف کے اعلان کے بعد صورت حال بہتر ہو جائے گی لیکن انسوس ایسا نہیں ہوا۔“

ذرا صورت حال ملاحظہ فرمائیے۔ امریکہ کا ”شاہ دماغ“ ہنری کھنجر، دس اہم مفکرین کے ساتھ بھارت میں بیٹھا امریکہ کے نیو ورلڈ آرڈر کی نوک پلک سنوار رہا ہے۔ پاک ہند بارڈر کو سیل کرنے اور بھارتی موقف کے مطابق ”پاکستانی مداخلت کاروں“ کا راستہ بند کرنے کے لئے سینٹر امریکی مشیروں کی ایک اور ٹیم نئی دہلی میں بیٹھی ہے۔ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے امریکی وزارت خارجہ کے کوآرڈینیٹر فرانس ٹیلر (Francis Taylor)، بھارت کے مشیر سلامتی برچیش مشرا سے ملاقاتوں میں مصروف ہیں۔ ایف بی آئی کے ڈائریکٹر رابرٹ ملر (Robert Mueller) نے بھی نئی دہلی میں ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ درجنوں امریکی کارپردازان کے ہمراہ ہیں۔ انڈیوی ایس جوائنٹ ورکنگ گروپ (JWG) شب و روز کام کر رہا ہے۔ پاکستان سے مطلوب بیس افراد کی فہرست اس کے ایجنڈے پر ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ پاک بھارت کشیدگی کے نقطہ عروج پر چینی وزیراعظم نے بھارت کا چھ روزہ دورہ کیا اور دہشت

گردی کے خاتمے کے لئے اپنے بھرپور عزم کا اظہار کیا۔ اسرائیل کے لئے بھارت ”خالہ کا گھر“ بن چکا ہے۔ امریکہ اور اسرائیل دونوں بھارت سے فوجی معاہدے کر رہے ہیں۔ مشترکہ مشقیں ہونے والی ہیں۔ روس پوری طرح بھارت کے پہلو میں کھڑا ہے۔ برطانوی وزیر اعظم کا دورہ جنوبی ایشیا اپنی کہانی خود سنار ہا ہے۔ کولن پاول اپنے لب و لہجہ کی تمام تر نزاکتوں کے باوجود دل کی دھڑکنیں چھپانہیں پار ہے۔

کیا عجب تماشہ ہے؟ دنیا بھر کا کوئی ملک ایسا نہیں جو بیک وقت امریکی عزائم کا دست و بازو بھی ہو، عالمی کولیشن کا سرگرم رکن بھی ہو اور اسے خود اپنے آپ سے لڑنے پر بھی مجبور کیا جا رہا ہو۔ یوں لگتا ہے جیسے اسامہ اور طالبان قصہ پارینہ بن چکے۔ اب پاکستان کا کس بل نکالنے کی نئی مہم کا آغاز ہو چکا ہے جس کی فرنٹ لائن سٹیٹ بھارت ہے۔ بھارت کی لٹکار، دو غلے دوستوں کی پکڑ، اپنوں کا پیار سب کا مطلوب و مقصود ایک ہی ہے کہ ہم اچھے بچے بن جائیں۔ بھارت وقفوں وقفوں سے ڈرامے کر رہا ہے اور دنیا اس کی ہمدردی میں اٹھ چلی آ رہی ہے۔ سفارت کاری کی فتنہ پرداز دلہن بن سنور رہی ہے اور ایک عالم کی نگاہیں خیرہ ہو رہی ہیں۔ لیکن ہم کہاں کھڑے ہیں؟

[24-01-2002]

”نیویارک زندہ باد“

جارج بش کا انصاف معر کے پہ معر کے سر کرتا، انسانی بستیوں، راگیروں کے قافلوں، ریڈ کراس کے مراکز، خوراک کے گوداموں، اقوام متحدہ کے ذخیروں، مہاجرین کے کیمپوں، نمازیوں سے بھری مسجدوں، قلعہ جنگلی کے تہہ خانوں اور تورا بورا کے غاروں سے ہوتا ہوا قندھار کے میر واعظ ہسپتال تک آن پہنچا ہے۔ پیر کی بیخ بست صبح ابھی پہاڑوں سے بہت دور کھڑی تھی اور ٹھہرتی رات اپنا سامان سفر سینے کی تیا ریاں کر رہی تھی جب دنیا کی سب سے ہولناک عسکری قوت نے قندھار کے ہسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کرائے کے افغان سپاہیوں کی اوٹ میں امریکی میرین دستے دبے پاؤں آگے بڑھے۔ زخموں اور قاتلوں سے نیم جاں چھ قیدی اپنے کھر درے بچھونوں پر پڑے تھے۔ ان میں سعودی عرب، یمن، سوڈان اور الجزائر کے علاوہ آسٹریلیا سے آیا ہوا ایک نو مسلم مجاہد بھی شامل تھا۔ گذشتہ کئی ہفتوں سے امریکہ کی شیردل سپاہ نے ان کا دانہ پانی بند کر رکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ القاعدہ کے ان جنگجوؤں کے پاس ہتھیار تھے اور کچھ نے دھماکہ خیز مواد اپنے جسموں سے باندھ رکھا تھا۔ انہوں نے زخمی ہونے کے باوجود ہتھیار ڈالنے اور اپنے آپ کو امریکیوں کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اپنے وارڈ میں اس طرح قلعہ بند ہو گئے کہ اگر ہمیں پکڑنے کی کوشش کی گئی تو ہم اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے لیکن جہاد کے بانگ پر آج نہیں آنے دیں گے۔

تب دنیا کی واحد سپر پاور نے فیصلہ کیا کہ ایک ہسپتال میں پڑے چھ مضمحل، زخمی، نڈھال اور فاقدہ زدہ انسانوں کو فتح کیا جائے۔ ریڈ کراس کے نمائندے کا کہنا ہے کہ امریکیوں نے پیشگی اطلاع کے بغیر اس طرح کا کوئی اقدام نہ کرنے کا پختہ یقین دلایا تھا لیکن اسے یہ اطلاع ہسپتال میں خوفناک دھماکوں کے ذریعے ملی۔ قندھار رپورٹ کے بیس کیمپ پر متعین امریکی سپاہ کے

افسر رابطہ میجر رابر کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

دم توڑتی رات کے آخری لمحات میں گل آغا شیرازی کے سپاہیوں کو ڈھال بناتے ہوئے امریکی سوراخوں نے ہسپتال پر دھاوا بول دیا۔ مجاہدین سے کہا گیا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔ ہتھیار نہ ڈالنے کی قسمیں کھائے قیدیوں نے خود سپردگی کی ذلت سے انکار کر دیا۔ آخری سانس کو ایک دو سانسوں کے فاصلے پر دیکھتے ہوئے بھی انہوں نے لڑتے ہوئے جان دینے کا فیصلہ کیا۔ جب امریکی گن شپ ہیلی کاپٹر بھی ہسپتال پر منڈلانے لگے تو ایکشن شروع ہوا۔ اس وقت صبح کے پونے چار بجے تھے۔ وارڈ کی کھڑکیوں سے ہینڈ گرنیڈ پھینکے جانے لگے۔ خود کار ہتھیاروں سے درود یوار چھلنی ہونے لگے۔ جو ابی فائرنگ سے اندازہ ہوا کہ قیدی سخت جان ہیں۔ فضا پیہم دھماکوں سے لرزنے لگی۔ سیاہ دھواں رات کی چادر اوڑھ کر اوپر اٹھنے لگا لیکن بھڑکتے شعلوں نے امریکی فتح کی خبر دور دور تک پہنچا دی۔ یہ رقص ابلیسی 9 گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہا۔ جس وقت قندھار کی اواس مسجدوں سے نماز ظہر کی اذانیں بلند ہو رہی تھیں، 6 قیدی آزاد ہو کر کھلی فضاؤں میں پراشتاں تھے اور امریکہ فتح حاصل کر چکا تھا۔ قیدیوں کے جسموں کے اجزاء، ہسپتال کے فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ خون کی لکیریں اس طرح ایک دوسرے میں جذب ہو رہی تھیں کہ سعودی، سوڈانی، یمنی، الجزائر اور آسٹریلوی کی پہچان مشکل تھی۔ سب لکیروں کا رنگ ایک سا، سب کی خوشبو ایک جیسی۔

میر واعظ ہسپتال دنیا کا پہلا شفا خانہ ہے جس میں داخل مریضوں پر ہیلی کاپٹروں اور خود کار ہتھیاروں کے ذریعے یلغار کی گئی۔ یہ پہلا ہسپتال ہے جس میں پڑے چھ مریضوں کو بھوک اور پیاس سے مارنے کے لئے کئی ہفتوں سے سپرہ لگا تھا۔ امریکی حیران تھے کہ یہ پھر بھی زندہ ہیں۔ بہت دیر بعد پتہ چلا کہ میر واعظ ہسپتال کی چھوٹی سی مسجد کا بوڑھا پیش امام، امریکی کولیشن کے عزائم کو ناکام بنا رہا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح روکھی سوکھی روٹی کے چند ٹکڑے اور پانی کا ایک آدھ پیالہ دور دریس سے آئے بیمار مہمانوں تک پہنچا دیتا۔ اس وقت امریکی قوت و حشمت کو لٹکانے والا بوڑھا پیش امام قندھار میں پرامریکیوں کی قید میں ہے۔

انسانی اخلاقیات اور تہذیبی اقدار کے ادنیٰ ترین معیار کو بھی بری طرح روندنے والا امریکہ اب بھی پاکباز ہے۔ وہ اب بھی مہذب دنیا کا پیشوا اور انسانی حقوق کا پاسبان ہے۔ قلعہ جنگلی کا

خونی کھیل قصہ ماضی بن چکا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں تھوڑا بہت کسمانے کے بعد خاموش ہو چکی ہیں۔ میر واعظ ہسپتال کے غیر انسانی الیے پر بھی کوئی احتجاج نہیں ہوگا۔ دنیا خونِ مسلم کے بارے میں زیادہ حساس نہیں اور اگر آگہ قتل امریکہ کے ہاتھ میں ہو تو زبانیں ویسے ہی گنگ ہو جاتی ہیں۔ ہسپتال پر حملہ کرنے والے امریکیوں نے اپنے سروں پر پٹیاں باندھ رکھی تھیں جن پر لکھا تھا ”نیویارک زندہ باد۔“ یوں لگتا ہے جیسے چھین اسلامی ممالک کی تنظیم او آئی سی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہیں۔ وہ گوانٹانامو کے ایکس رے کیپ کے کسی پنجرے میں آکڑوں بیٹھی ہے اور اس کے ماتھے پر بھی پٹی بندھی ہے جس پر لکھا ہے ”نیویارک زندہ باد۔“

اس کے باوجود مرنے والوں کے لئے رونے والوں کی کمی نہیں۔ رحیم اللہ یوسف زئی نے بتایا ہے کہ کرم انجمنی میں ملیشیا کی فائرنگ سے جاں بحق ہونے والے عرب قیدیوں کی قبریں رنگا رنگ پر جموں سے جھی، زیارت گا ہیں بن چکی ہیں۔ قندھار کے قبرستان کا بھی یہی عالم ہے۔ آج کے اخبارات میں خبر آئی ہے کہ قندھار کے لوگوں نے سفید اور سبز رنگ کے بڑے بڑے جھنڈے تیار کر لئے ہیں اور ایک سخت پتھر ملی چٹان کے دامن میں مانوس اجنبیوں کی قبریں تیار کر رہے ہیں۔

ظلم ڈیزی کٹرہوں، میزائلوں، توپوں، طیاروں اور گن شپ نیلی کاپڑوں کے زور پر اپنا سکہ جماتا ہے۔ وہ اپنے ماتھے پر زندہ باد کی رنگا رنگ پٹیاں سجانے کے باوجود ایک عالم کی نفرتوں کا ہدف ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن رسوائیوں کی چٹا میں جل کر خاکستر ہو جاتا اور اپنے پیچھے عبرت کی کہانیاں چھوڑ جاتا ہے۔

[31-1-2002]

دینی مدارس کی ضابطہ بندی

صدر پرویز مشرف نے لاہور میں دو اہم اور نامور دینی جامعات کا دورہ کیا اور یہ سٹلن دینے کی کوشش کی کہ حکومت ان مدارس کے خلاف کوئی بغض نہیں رکھتی بلکہ وہ انہیں زیادہ کارگر اور جدید عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی تمنا ہی ہے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں بھی اس بات پر زور دیا کہ حکومت دینی مدارس کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے البتہ ان میں زیر تعلیم طلباء و طالبات کے لئے زندگی کے زیادہ امکانات اور وسعت فکر و نظر کی خواہش مند ہے۔ ایک ننھے ننھے بچے کے ساتھ ان کی ایک تصویر بھی شائع ہوئی ہے جو اس تاثر کی علامت ہے کہ حکومت ان بچوں کو عزیز جانتی اور ان کی بہتر نشوونما چاہتی ہے۔

اس سے دو دن قبل بعض اخبارات میں ایک اور نوع کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ یہ کسی دینی مدرسے کے ایک کلاس روم کی تصویر ہے۔ طلباء رطلوں پر رکھے قرآن پاک کی تلاوت کر رہے ہیں۔ ان کے سروں پر سفید ٹوپیاں ہیں اور چہروں پر نورانی شفق کھلی ہوئی ہے۔ انہیں تجوید و قرأت کی تعلیم دینے والے معلم ایک گوشے میں کھڑے ہیں۔ تصویریں آوازوں سے محروم ہوتی ہیں لیکن مجھے فرشتوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی ہے۔ اس ملکوتی ماحول کے بچوں کی کراخت چہروں والے دو پولیس مین نظر آرہے ہیں۔ ایک پولیس والا ایک معصوم بچے پر جھکا ہوا کچھ نوٹ کر رہا ہے۔ تصویر کے کپشن میں بتایا گیا ہے کہ پولیس دینی مدارس میں زیر تعلیم بچوں کے کوائف جمع کر رہی ہے۔

شاید نئے معمولات کے تیز رو دھارے میں ہچکولے کھاتے پاکستان میں یہ معمول کی کارروائی ہو لیکن مجھے اس تصویر نے دکھی سا ردیا۔ دینی مدارس یا کسی بھی ادارے اور نظام کی اصلاح ضرور ہونی چاہئے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ درسی نصاب کی تراش خراش کا عمل بھی جاری رہنا چاہئے۔ اصولی طور پر یہ بات درست ہے کہ فرقہ واریت اور تنگ نظری کی خاردار باڑیں

لگانے والوں کی حوصلہ شکنی ہونی چاہئے۔ زیر تعلیم طلباء و طالبات کی رجسٹریشن اور دیگر کوائف مرتب کرنے اور اس سارے نظام کو باضابطہ بنانے میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ میری معلومات کے مطابق تو یہ عمل کافی پہلے سے جاری ہے۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ مسالک کے چاروں ”وفاق المدارس العربیہ“ اپنے اپنے اداروں کا مکمل ریکارڈ رکھتے ہیں جو حکومت کے پاس بھی ہے۔ یہی وفاق و قافو قناصاب میں ترمیم و اضافہ بھی کرتے رہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان انتظامی اداروں نے مدارس کی ضابطہ بندی کا کڑا انتظام رائج کر رکھا ہے اور ان کی تحویل میں چلنے والا کوئی ایک ادارہ بھی عسکری دہشت گردی کی کوئی تربیت گاہ نہیں رکھتا۔ یہ ادارے جیسے بھی ہیں اور جس معیار کے بھی ہیں ہماری دینی، تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی روایات کے امین ہیں۔ انہوں نے دینی علوم کی توسیع و اشاعت میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں۔ ”مولوی“ کو کتنا ہی مطعون کر لیا جائے۔ وہ معاشرے کی ایک اہم اکائی ہے جس نے جہالت زدہ بستیوں کے اندر بھی کسی نہ کسی حد تک علم و عرفان کی شمع روشن کر رکھی ہے۔

ہمارے ان دیہات میں بھی جہاں کوئی سرکاری سکول نہیں، مساجد اور گھروں کے اندر مولوی اور اس کے اہل خانہ قرآن کی تعلیم دیتے اور ایک نوع کی خواندگی کا نور پھیلاتے ہیں۔ اصحاب صفہ کی روایات کا امین یہ قاعدتاً شعار قبیلہ انتہائی کٹھن حالات میں کام کر رہا ہے۔ حکومت کی تجویروں سے انہیں کبھی کچھ نہیں ملا۔ ان کے لئے اچھی عمارتیں تعمیر کرنے، ضروری سہولتوں سے آراستہ کلاس رومز بنانے، معیاری اقامت گاہوں کا انتظام کرنے اور انہیں قومی اثاثہ جان کر ان کی سرپرستی کرنے کے لئے حکومتوں نے کچھ نہیں کیا۔ اہل خیر کے خاموش چندوں پر چلنے والے ان فاقہ مست مدارس نے دینی شعور کے فروغ کے لئے اپنے محدود دائرے کے اندر قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔

یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہئے کہ یہ دور سپیشلائزیشن کا ہے۔ ایک خاص سطح کے بعد طلباء و طالبات تعلیم و تربیت کے خصوصی پیشہ ورانہ دائروں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ کوئی انجینئر، کوئی ڈاکٹر، کوئی آرکیٹیکٹ، کوئی معلم۔ اسی طرح اگر کچھ لوگ قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر علوم دینیہ میں سپیشلائزیشن کرنا چاہتے ہیں تو ان پر ایسے علم کا بوجھ لادنے سے کیا حاصل جو ان کے دائرہ تخصص سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ جس طرح بی اے، بی ایس سی کی سطح تک اسلامیات اور

مطالعہ پاکستان کی واجبی سی تعلیم کو کافی سمجھا جاتا ہے، اسی طرح دینی مدارس میں ابتدائی طور پر انگریزی، سائنس، ٹیکنالوجی، کمپیوٹر اور دیگر علوم حاضرہ کی ایک معقول حد تک تعلیم ضرور ہونی چاہئے لیکن دینی علوم کی اعلیٰ سطحوں میں ان زوائد کو قرآن و حدیث اور تفسیر و فقہ کا لازمی حصہ بنا دینا زیادتی ہے۔ دینی مدارس کی بہت بڑی تعداد پہلے ہی ان ضروریات سے آگاہ ہے اور متعلقہ وقاق بڑی ہوشمندی سے اس معاملے پر توجہ دے رہے ہیں۔

بات دور نکل گئی۔ میں جس تصویر کا تذکرہ کر رہا تھا وہ ذوق سلیم رکھنے والے ہر شخص کو ناگوار گزری ہوگی۔ پولیس کے ساتھ جرائم کی بیخ کنی، مجرموں کے گوشوارے مرتب کرنے اور قانون شکن عناصر کے کوائف جمع کرنے کا تصور وابستہ ہے۔ دینی مدارس کے فرشتوں جیسے معصوم حفاظ قرآن اور معلمین حدیث و فقہ، ان کی گرفت میں دکھائی دیں تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ یہ کام کسی سے بھی لیا جاسکتا ہے۔ وزارت مذہبی امور کے ملازمین، محکمہ اوقاف کے اہلکار، ضلعی انتظامیہ کا عملہ، سکول کے اساتذہ، کوئی بھی ہو سکتا ہے۔

مجرموں کی پناہ گاہوں پر چھاپے مارنے اور بد معاشوں کے ”بستے“ مرتب کرنے والی پولیس کو دینی مدارس سے دور رکھیں۔ جس کسی عالی دماغ نے اس کام کے لئے پولیس کا انتخاب کیا ہے، وہ حکومت اور دینی مدارس کے درمیان خلیج کو وسیع کرنا اور عوام کے ذہنوں میں بدگمانی کے بیج بونا چاہتا ہے۔

[01-02-2002]

بھارت کا کرخت لہجہ

نازک مزاج شاہاں ملاحظہ فرمائیے!

بھارتی وزیراعظم اٹل بھاری واجپائی فرماتے ہیں کہ ”بھارت کشمیر کے کسی حصے کو پاکستان کے حوالے نہیں کرے گا۔ ہم نے بھگوان کی مدد سے اپنے پڑوسی ملک کو اتنی مشکل میں ڈال دیا ہے کہ بہت جلد دہشت گردی کے خلاف بین الاقوامی مہم پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر میں ہوگی جہاں دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ ہیں پاکستان کشمیر کا واویلا چھوڑ دے۔ کشمیر صدیوں سے ہندوستان کے ساتھ ہے اور مستقبل میں بھی رہے گا۔“ بھارتی وزیراعظم نے کمال رعونت سے کہا کہ پاکستان کے ساتھ مذاکرات خارج از امکان ہیں۔ انہوں نے پاکستان میں امریکی افواج کی موجودگی کو پورے خطے کے لئے نامناسب قرار دیا اور دو نوک انداز میں کہا کہ ”جب تک امن بحال نہیں ہوتا، بھارت کی فوجیں بدستور سرحدوں پر تعینات رہیں گی۔“

بھارت کے مزاج میں یہ برہمی کیوں آرہی ہے اور اس کے لہجے کا کھر درا پن کیوں بڑھتا جا رہا ہے؟ اس کا جائزہ لینے کے لئے حالات و واقعات پر سرسری نگاہ ہی کافی ہے۔ 11 ستمبر کے بعد جوئی دنیا وجود میں آئی ہے وہ ہزاروں سال والی اس دنیا کا نیا جنم ہے جس میں اصول، نظریے، عدل، اخلاقیات اور تہذیب کے سارے قرینے طاقتوروں کے مزاج سے پھوٹتے تھے اور بھینس خود بخود اس کے تھان پر آکھڑی ہوتی تھی جس کے ہاتھ میں لانچی دیکھتی تھی۔ صدیوں کا سفر بٹے کر کے جدید دور تک پہنچنے والا انسان پوری طرح مہذب تو نہ ہو سکا لیکن برہنہ طاقت آزمائی اور قوت کے مکروہ مظاہرے کے لئے اسے کئی بہانے تراشنے پڑتے تھے۔ دو عالمی جنگوں کے بعد یہ احساس زیادہ پختہ ہوا کہ انسانیت کشی کوئی زیادہ دلپسند مشغلہ نہیں۔ جبر، استحصال اور جارحیت کی حوصلہ شکنی نے احترام انسانیت کے تصور کو احیاء بخشا۔ اسی تازہ فکر کے بطن سے اقوام متحدہ نے جنم لیا۔ ظلم و زیادتی کا سلسلہ تو نہ رکالیں ڈھنائی اور رعونت اس قدر بے لباس نہ رہیں

کہ گھن آنے لگے۔

11 ستمبر کو نیویارک اور واشنگٹن میں جو کچھ ہوا وہ تو سب کے سامنے ہے لیکن یہ جاننے میں وقت لگے گا کہ اس کے پس منظر میں کون تھا اور کس نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو توپ کے دبانے کے سامنے کھڑا کر دیا؟ اس ڈرامے کے نتیجے میں امریکہ نے ایسا رد عمل اختیار کیا جس میں انسانی اقدار اور تہذیبی حسن کا شائبہ تک نہ تھا۔ افغانستان کو جس بری طرح جدید فوجی مشینری کے ذریعے چلا گیا اور انسانی اقدار کی جس گھناؤنے انداز میں عصمت دری کی گئی، اس نے ایک عالم کو حیران و ششدر کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکی رویتے نے ساری مہذب دنیا کو خوفزدہ کر دیا اور خوف کی یہ زرد چادر ابھی تک اقوام عالم کے فکرو احساس پر تہی ہوئی ہے۔ پاکستان بھی اسی خوف کے زیر اثر ایک ایسی راہ پر چل نکلا جس کے کسی سنگ میل، کسی موز، کسی چیخ و غم اور کسی پڑاؤ پر اس کا کوئی اختیار نہیں۔ خوف و دہشت کی اسی کیفیت نے اسلامی ممالک کو بھی اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ ”سب سے پہلے پاکستان“ کے انداز میں ہی مراکش سے انڈونیشیا تک سب سے پہلے مصر، سب سے پہلے لبنان، سب سے پہلے اردن، اور سب سے پہلے ملائیشیا، وغیرہ کی صدائیں اٹھ رہی ہیں۔ 11 ستمبر کے بعد سامراج کا سورج نئی آب و تاب کے ساتھ بام تارخ پر طلوع ہوا ہے جو نوآبادیاتی فکر کے حامل ہر ملک کو اپنے ایلہی عزائم کی تکمیل پر ابھار رہا ہے۔ جن اقدامات کے لئے طاقتور قوموں کو بھی سوسو بہانے تراشنے پڑتے تھے اور انہیں رو بہ عمل لاتے وقت دنیا بھر کی ملامت کا احساس پتھر جیسی پیشانیوں کو بھی عرق آلو کر دیتا تھا، اب وہ سب کچھ کھلے بندوں ہو رہا ہے اور اس اجتہاد جے کے غلیظ کھیل کو ”دہشت گردی کے خلاف مہم“ کا مقدس نام دے دیا گیا ہے۔ طاقت کی اس بے مہار خود سری کے سامنے دنیا ہم سادھے بیٹھی ہے اور سامراج، کولیشن کے سبک خرام گھوڑے پر سوار بگشت دوڑے چلا جا رہا ہے۔

اٹل بھاری و اجپائی، کے ایل ایڈوانی، جارج فرنینڈس اور جسونت سنگھ کا بھارت، 11 ستمبر کے بعد جنم لینے والی دنیا کا فرزند ہے جو حق و انصاف کی تمام قدروں کو بے رحمی سے روندنا ایک غیر اصولی اور غیر اخلاقی موقف کی بنیاد پر ہمیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔ وہ اپنے جو ہر تخلیق کے اعتبار سے ہی عیاری اور مکاری کے فریب کارانہ رویوں کا نمونہ رہا ہے جسے 11 ستمبر کے بعد جنم لینے والی حیا

باختہ آب و ہوانے اور زیادہ تقویت بخشی ہے۔ اس بھارت کے حضور پیشکشوں، معاہدوں، رعایتوں، مصافحوں، معانقوں، ملاقاتوں اور مداراتوں کے نذرانے چڑھانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے سامراجی ذہن اور برہمنی سوچ کو ٹیکل ڈالنے کے لئے تو انا، پر عزم، جرأت منداناہ اور دو ٹوک موقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں خوش گمانیوں کو جھٹلا کر اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ امریکہ اور مغرب، بھارت کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ لیپا پوتی کی ساری کوششوں اور ہماری شان میں کہے جانے والے آئے دن کے قصیدوں کے باوجود ہماری حیثیت کو لیشن کے طہلی کے سوا کچھ نہیں۔ شاید امریکہ کی حد تک تو ہم ”بے سرا“ ہونے کا خطرہ مول نہ لے سکیں لیکن بھارت کے بارے میں ہمیں اپنے حالیہ طرز عمل پر ضرور نظر ثانی کرنی چاہئے۔ واجپائی کی شرائط اور مطالبات کے سامنے پلکدار رو یہ اختیار کرنے کا نتیجہ صرف یہی نکلا ہے کہ بھارت سرعام ہماری تضحیک اور توہین پر اتر آیا ہے۔ کیا واجپائی کا تازہ انداز کلام اس امر کا تقاضا نہیں کرتا کہ ہم زیادہ جرأت منداناہ، باوقار اور وجیہہ طرز عمل اختیار کریں۔ امریکہ کے جبر کے سامنے جھکنا مجبوری تھی لیکن بھارت کی حضوری ہمارے وجود کو ہی مشکوک بنا دے گی۔

[05-02-2002]

بحالی اعتماد کی تلقین

امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے مشورہ دیا ہے کہ حالات کو سازگار بنانے اور کشیدگی کم کرنے کے لئے پاکستان، بھارت کا اعتماد بحال کرے تاکہ جنوبی ایشیا جنگ کے خطرے سے آزاد ہو۔ انہوں نے مزید کہا کہ دہشت گردی کے خلاف حالیہ مہم میں دونوں ممالک کو اشتراک عمل کے ساتھ جدوجہد کرنی چاہئے اور ایسا نظر نہیں آنا چاہئے کہ یہ مہم ایک دوسرے کے خلاف ہے۔

پاکستان سال ہا سال سے انہی الجھاؤوں کی گتھیاں سلجھا رہا ہے کہ وہ کس کس کے اعتماد پر پورا اترنے کے لئے کیا کیا کچھ کرے اور ایثار و قربانی کے کون کون سے اقدامات کے ذریعے کن کن نازک مزاجوں کے دلوں کا میل صاف کرے؟ قومی تاریخ کے ایک ایک ورق پر اپنوں کی خنجر آزمائی کے باعث ہمارے سینے صد چاک سے پھونٹنے والے لہو کے چھینٹے ہیں۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہم نے پڑوس کے روس کو چھوڑ کر سات سمندر پار کے امریکہ سے دل لگایا اور اس پر اس قدر اندھا اعتماد کیا کہ دفاع و استحکام اور عزت و وقار کی ساری خوش گمانیاں اس کے ساتھ وابستہ کر لیں۔ اس کی عطاؤں کی امید ہماری اداؤں کے زاویے بنتی رہی۔

1971ء میں جب ہمیں اپنی تاریخ کے سب سے بڑے چیلنج کا سامنا ہوا تو بھی ہم نے چین جیسے دوست کے مشوروں یا اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنے کے بجائے فتح و کامرانی کے سنہری امکانات امریکہ کی شفقت و عنایت سے جوڑ لئے۔ جب بھارت کی فوج اور کیتی باہنی، مشرقی پاکستان میں ہمارے اعصابی نظام کو بری طرح مفلوج کر چکی تھیں اور پاکستان کا پرچم کسی مزار کے سر ہانے آگے لیکر کے درخت پر ٹنگے بوسیدہ کپڑے کی طرح دھجیاں ہو رہا تھا، تو ہم فریب خوردہ آنکھوں پر دور بینیں چڑھائے بحر ہند کی موجوں کا تماشا کر رہے تھے جن کے دوش پر سوار امریکی بیڑا ہماری مدد کو آیا چاہتا تھا۔ یہ بیڑا اس وقت بھی ہماری نگاہوں کی گرفت میں نہیں آیا جس وقت نوے ہزار قیدیوں سے لدی ٹرینیں بھارت کی حدود میں داخل ہو رہی تھیں اور دونوں طرف

کھڑے بھارتی عوام اپنی فتح و کامرانی کے گیت گارہے تھے۔ ہم نے آج بھی اقتصادی ترقی و خوشحالی کی ساری آرزوئیں امریکہ کی کشادہ دہتی سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ اسی کے کتب کے فیض یافتہ ماہرین ہماری معاشی پالیسیوں کی صورت گری کرتے اسی کے ادارے ہماری ترجیحات کو ترتیب دیتے اور اسی کے رنگ سازان ترجیحات میں منصوبہ بندی کا رنگ بھرتے ہیں لیکن عالم یہ ہے کہ آج بھی ہم بھکاری ہیں۔ 37 ارب ڈالر کا قرضہ بدستور ہماری قومی غیرت و خودی کو کھیل ڈالے ہوئے ہے اور ہم روزمرہ کے اخراجات کے لئے بھی حسن طلب کے نئے نئے قرینے ایجاد کرنے پر مجبور ہیں۔

بلا سوچے سمجھے یار دلدار کے اشارہ ابرو پر رقص کرتے مدتیں ہو چلیں۔ ہم ایسے اتحادوں کا حصہ بنے جن کا مقصد صرف اس کے مخالفین کو دبانا تھا۔ اس کی خوشنودی کی خاطر ان کی دشمنی مول لی جن سے ہمارا کوئی جھگڑا نہ تھا۔ اس کے مفادات کے لئے اپنے مفادات کے منافی پالیسیاں اپنائیں۔ اس کی کلفی اونچی کرنے کے لئے اپنی خودی کو چکلا اور کرائے کے سپاہی بنے۔ 11 ستمبر کے بعد تو ہم نے اپنے سب دروازے اس کے لئے کھول دیئے۔ اپنے دلوں میں اس کی دھڑکنیں آباد کیں، اپنی آنکھوں میں اس کے خواب بسائے، اپنے دماغوں کو اس کی سوچ سے آراستہ کیا اور اپنی زبان کو اس کے لب و لہجہ کی رعنائی بخشی۔ اپنے ہوائی اڈے دیئے۔ اپنی تمصیبات دیں۔ اپنی انٹیلی جنس دی، اپنی فہمائیں دیں، اپنے پانیوں پر تصرف دیا۔ اپنے نظام مواصلات کی سہولت بخشی۔ یہ سب کچھ جانے دیجئے ہم نے تو اپنے جذبہ و احساس کی پونجی بھی اس کے حوالے کر دی۔ شاید امریکہ کبھی اس کا اندازہ نہ لگا سکے کہ اپنے ہاتھ طالبان کے خون ناحق سے رنگنے کے بعد ہم کس قیامت سے گزر رہے ہیں۔ برفباری کے موسموں میں کہ جب بھیڑ بکریاں بھی میدانوں کو اتر آتی ہیں، ملا عمر کو قندھار سے نکال کر پنج بستہ پہاڑوں کی طرف دھکیل دینے کے بعد ہمارے لئے نرم و گداز بستروں کی نیند کتنی اذیت ناک ہو چکی ہے۔ ملا عبدالسلام ضعیف کو پکڑ جلڑ کر ایک سفاک سپاہ کے حوالے کرنے کا ان دیکھا منظر کس طرح ہمارے دلوں پر آ رہے چلا رہا ہے۔ ہزاروں بے گناہ افغانیوں کی ہلاکت نے کروڑوں پاکستانیوں کو کس کرب سے دوچار کر رکھا ہے۔ جارج بش اور کلن پاول کبھی یہ تصور بھی نہیں کر پائیں گے کہ پاکستان نے 11 ستمبر کے بعد اپنے کن کن آدرشوں کو پھانسی چڑھایا، کن کن اصولوں کی قبریں کھودیں اور کن کن نظریات کا گلا گھونٹا۔

امریکہ کے اعتماد پر پورا اترنے کے لئے ہم نے کیا کچھ نہیں کیا؟ اس کے بدن کو خوش رنگ قبائیں بخشنے کے لئے اپنی ستر پوشی کا بھرم بھی نہ چھوڑا لیکن وہ ہمیں بھارت کے اعتماد پر پورا اترنے کی تلقین کر رہا ہے۔ ہمیں، کسی بے دست و پا شخص کی جواں سال بیٹی کی طرح، چوبارے میں بٹھا کر حکم صادر کرتا ہے کہ ہماری ولداری کافی نہیں، ہمارے دوستوں کا دل بھی لبھاؤ۔ ان کے اعتماد پر بھی پورا اترو اور ہماری فریب خوردہ آنکھیں آج بھی واٹ ہاؤس سے دودھ اور شہد کی نہریں پھوٹی دیکھ رہی ہیں۔

کسی سے کیا گلہ

یہ بھی کب تک کہ ہر آفت کا سبب ہے کوئی اور
منزولیں خود بھی تو کم کرتی ہیں رستہ اپنا

[10-02-2002]

آخر تک

طالبان عہد کے وزیر خارجہ ملا دکیل احمد متوکل کس طرح گرفتار ہوئے؟ کیا انہوں نے کامل انتظامیہ کے ساتھ کسی مفاہمت کے بعد اپنے آپ کو پیش کر دیا؟ کیا گل آغا کے گروگن نے انہیں پکڑ کر امریکیوں کے حوالے کر دیا؟ کیا افغان وزیر خارجہ کا یہ اعلان درست ہے کہ پاکستانیوں نے انہیں گرفتار کر کے امریکہ کے سپرد کر دیا؟ جلوزئی کے مہاجر کیمپ سے سابق طالبان نائب وزیر صحت مولوی صدیق کو کس انداز سے شکنجے میں لیا گیا؟ یہ سب بیکاری کی باتیں ہیں۔

اس تحقیق سے بھی کچھ حاصل نہیں کہ ”نو گرفتار چین“ کو قندھار یا بگرام کے کون سے عقوبت خانے میں رکھا جائے گا؟ اس بات کی ٹوہ لگانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ انہیں گونانا مو کے چڑیا گھر بھیجا جائے گا یا نہیں؟ اور اگر بھیجا جائے گا تو کون سے منجرے میں ڈالا جائے گا؟ شرف انسانیت کے احترام، انسانی حقوق کی پاسداری اور تہذیب و اخلاق کے تمام تر معیارات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ نئے دستور العمل کے تحت یہ ساری الجھنیں بے معنی ہیں کہ کسی شخص کی آزادی کو کس طرح زنجیر پہنائی جاسکتی ہے اور ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کو سات سمندر پار سے آیا گوری چمڑی والا سپاہی کس طرح ہتھکڑی ڈال سکتا ہے؟ یہ سوالات قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ کسی مستند ثبوت کے بغیر اسامہ بن لادن کو مجرم قرار دے کر ایک پورے ملک کو کھنڈر بنا دینے پر دنیا کے کسی ملک نے احتجاج نہیں کیا۔ کوئی نہیں بولا کہ ایک نہتی قوم کے خلاف اندھی عسکری قوت کے بے محابا استعمال کا کیا جواز ہے؟ کسی نے نہ کہا کہ ذرا دم لو۔ اقوام متحدہ موجود ہے۔ عالمی عدالت انصاف موجود ہے۔ اسلامی کانفرنس موجود ہے۔ بہت سی اور عالمی تنظیمیں موجود ہیں۔ کوئی بیچ بچاؤ کا راستہ اختیار کرنے دو۔ کسی نے نہ پوچھا کہ دہشت گردی کسے کہتے ہیں؟ کسی نے سوال نہ کیا کہ دہشت گردی کے خلاف شروع کی جانے والی اس مہم کے حدود اور بعد کیا ہیں؟ اس کے برعکس ہر کسی

نے ایزیاں اٹھا اٹھا کر اپنے آپ کو قند آور جنگجو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ہر کسی نے اپنا کندھا امریکی بندوق کی نذر کرنے کے لئے دوسرے سے بازی لے جانے کے جتن کئے۔ پاکستان نے تو اس جاں سپاری کو اپنی حکمت کاری کا عظیم معرکہ قرار دیا اور طالبان کشی میں فرنٹ لائن سٹیٹ کا کردار ادا کرنے کے فیصلے کو قومی تاریخ کے سب سے جرأت مندانہ اقدام سے تعبیر کیا۔ اسی طرح کے جرأت مندانہ اقدامات نے، ابتدائی طور پر ہچکچاتے اور جھکتے امریکہ کو بھی، نئی جرأت پرواز اور قوت آزار عطا کی۔ اب وہ کسی طور پر بھی اقوام متحدہ کی طرف نہیں دیکھتا۔ جارج بش، کولن پاول اور مرنز فیلڈ کے حاشیہ خیال میں آنے والا ہر تصور اور دل میں انگڑائی لینے والی ہر خواہش، کہہ ارضی کے لئے فرمان غیب کا درجہ رکھتی ہے۔ عالمی برادری کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ امریکہ کے خوابوں میں تعبیروں کی پینا کاری کرے۔

خوف و ہراس کا یہ عالم تو کسی دور میں نہ تھا۔ ایسی بے چارگی تو غالباً اس زمانے میں بھی نہ تھی جب دنیا لاالاحمد و داور بے حد وسیع تھی اور کائنات کے کسی گوشے میں رونما ہونے والا واقعہ حد نظر تک ہی محدود رہتا تھا یا برسوں بعد دنیا کے کسی دوسرے حصے تک اس کی خبر جاتی تھی۔ ایسی اندھیر نگری تو تب بھی نہ تھی جب انسان جہالت کے تاریک غاروں میں رہتا جانتا تھا۔

امریکہ کا خیال ہے کہ اس نے اپنے جبر و قہر سے ساری دنیا کو اپنا مطیع بنا لیا ہے اور وہ جس نوع کا بھی ظلم ڈھائے، کوئی اس کا ہاتھ روکنے والا، کوئی اسے پوچھنے والا نہیں۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے لیکن کیا امریکہ یہ بھی جانتا ہے کہ 11 ستمبر کے بعد سے اس کے چہرے سے تہہ در تہہ اترنے والے نقابوں نے اس کے بھیا تک خدو خال کو کس قدر نمایاں کر دیا ہے؟ دنیا بے شک سہمی ہوئی ہے۔ خوفزدہ اور ہراساں ہے۔ جارج بش کی آستین کے ایک ایک تار سے انسانی لبو کے قطرے ٹپک رہے ہیں اس کے باوجود اس سے ہاتھ ملانا اعزاز اور اس کے پہلو میں بیٹھ کر کھانا تناول کرنا سعادت ہے۔ ایک پڑھا لکھا معاشرہ ایسے جنون میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ گئے دنوں کی بربریت بھی شرمانے لگی ہے۔ قانون، انصاف، اخلاق، تہذیب اور انسانیت کی تمام اقدار کو بری طرح پامال کرنے کے باوجود ایک عالم کی ستائش اور نیاز مندی کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ امریکہ واقعی امام عصر بن چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پیہم نفرتوں کی فصل بوز رہا ہے جو بہت دیر تک اسے دشنام بنائے رکھے گی۔

طالبان تو فنا ہو کر بھی زندہ رہیں گے کہ وہ کسی اسامہ، کسی ملا عمر، کسی عبدالسلام ضعیف اور کسی وکیل احمد متوکل کے محتاج نہیں۔ وہ کربلاؤں کو سیراب کرنے والے دائمی سرچشموں کے فیض یافتہ ہیں۔ ایسے سخت جان قبیلے ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں۔ آج ڈاڑھیوں اور پگڑیوں والے یہ فائدہ مست بے یار و مددگار سہی لیکن وہ دن دور نہیں جب یہ یا ان جیسا کوئی اور، ایک بار پھر لاکار بن کر عرصہ پیکار میں آئے گا۔ تب انسانوں کو بھیڑ بکریوں سے بھی بدتر سمجھنے والوں کو سارا حساب سود مرکب کے ساتھ بے باق کرنا ہوگا کہ تاریخ، تھوڑی بہت ری شیڈولنگ تو کر لیتی ہے لیکن اپنا قرض کبھی معاف نہیں کر پاتی۔

[11-02-2002]

www.KitaboSunnat.com

تصویر کاروشن رخ

بعض لوگوں کو کیڑے نکالنے کی عادت ہوتی ہے اور وہ کسی کانٹے کی ہلکی سی چھین کو بہانہ بنا کر بھری بہاری رعنائیوں کو کونسنے لگتے ہیں۔

پاکستان 37 ارب ڈالر سے زائد قرضوں کے بھاری بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ اس میں سے 2.8 بلین ڈالر براہ راست امریکی تجوری سے تعلق رکھتا ہے۔ صدر پرویز مشرف کے پہلے سرکاری دورہ امریکہ کے موقع پر پاکستان کی عظیم خدمات اور دہشت گردی کے خاتمے کی مہم میں تاریخ ساز کردار ادا کرنے کے باعث صدر جارج بوش نے مزید سنایا کہ وہ کانگریس سے ایک ارب ڈالر کا قرضہ معاف کر دینے کی درخواست کر رہے ہیں۔ توقع ہے کہ کانگریس بخوشی اس کی منظوری دیدے گی تاہم سینٹ کی کمیٹی برائے تعلقات خارجہ کے چیئرمین مسٹر جوزف باڈن (Joseph Biden) نے صدر مشرف سے تفصیلی ملاقات کے بعد اخبار نویسوں سے گفتگو کرتے ہوئے اسے کئی اقدامات سے مشروط کر دیا۔ یہ شرائط انہی کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہیں:-

1. "Genuine, fair, open election in October.
2. He (Musharraf) will continue to be committed in dealing with eradicating extremists in Pakistan and cooperating with us on terrorists who may be infiltrating into and out of Pakistan.
3. De-escalation of the situation on the borders with India."

ترجمہ:- "1- اکتوبر میں کھرے، منصفانہ اور شفاف انتخابات۔

2- وہ (صدر مشرف) پاکستان میں انتہا پسندوں کا قلع قمع کرنے کے عزم پر قائم رہیں گے اور پاکستان کے اندر داخل ہونے یا پاکستان سے نکل کر کہیں اور جانے والے دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کے لئے ہمارے ساتھ تعاون جاری رکھیں گے۔

3- بھارت کے ساتھ سرحدوں پر پائی جانے والی کشیدگی میں کمی لائیں گے۔“

قبل ازیں صدر بٹش یہ یقین دلا چکے ہیں کہ امریکہ اور پاکستان کی دوستی ”مختصر دورانے کا رقص“ نہیں بلکہ دیر پائیدار بنیادوں پر قائم ہوگی تاہم انہوں نے بھی باہمی دوستی اور تعاون کے لئے تین شرائط کا حوالہ دیا تھا۔ امریکہ کی ”بے اعتباری“ کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا:

"So long as we share the same ideals, values and common objectives, we will work with Pakistan."

ترجمہ:- ”جب تک ہمارا نصب العین، اقدار اور مقاصد مشترک رہیں گے، ہم پاکستان کے ساتھ مل کر کام کرتے رہیں گے۔“

ان شرائط سے قطع نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک احسان مند اور شکر گزار قوم کی طرح صدر جارج بٹش کا غیر مشروط شکریہ ادا کیا جائے۔ اگرچہ ایک ملین قرض کی معافی میں ابھی کچھ مرحلہ باقی ہیں اور ماہرین کا کہنا ہے کہ کانگریس مان گئی تو بھی بھوک سے بلبلاتے اس اونٹ کے منہ میں زیرہ 2003ء کے اواخر تک ہی جاسکے گا۔ اسی طرح تعلیمی شعبے بالخصوص نصاب تعلیم کی ”اصلاح“ کے لئے تین کروڑ چالیس لاکھ ڈالر کی امداد کو بروئے کار لانے اور زمینی نتائج مرتب کرنے میں لمبا عرصہ درکار ہوگا۔ برآمدات میں اضافہ اور دفاعی تعاون کے منصوبے بھی ہتھیلی پر سرسوں نہیں جما سکیں گے لیکن ان سارے دوسوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اگر ہم صدر بٹش کی اس فراخ دلانہ تعریف و توصیف کا تصور کریں جو شاید پچپن سالہ قومی تاریخ میں پہلی بار کسی پاکستانی رہنما کے حصے میں آئی ہے تو دل احساس تشکر سے لبریز ہو جاتا ہے۔ صدر مشرف کے تدبر اور وژن کو فراموش نہیں کرتے ہوئے جارج بٹش یہاں تک کہہ گئے:

"I am proud to call him a friend."

(میں صدر مشرف کو اپنا دوست کہتے ہوئے فخر محسوس کرتا ہوں۔)

اس کے علاوہ انہوں نے فرمایا ”میں پاکستانی عوام کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے اچھے سٹیٹ آف یونین خطاب میں زیادہ عالمی لیڈروں کا تذکرہ نہیں کیا تھا لیکن میں نے ایک خاص وجہ سے صدر مشرف کا ذکر کیا تھا۔ یہ اس امر کا اشارہ تھا کہ میں پاکستان سے مضبوط اور باہمی

تعلقات کا خواہش مند ہوں۔“

ہمارے کتنے ہی لیڈر امریکی صدر سے ہاتھ ملانے کی آرزو میں رزق خاک ہو گئے۔ کتنے ایسے ہیں جو ابھی تک اس آرزو کو سینے سے لگائے بیٹھے ہیں کہ شاید ان کی لوح تقدیر پر کوئی ایسا خوش بخت لحو ثبت ہو جب امریکی صدر کے شیریں ہونٹوں پر ان کا نام آئے۔ بڑے بڑے قد آور اور مقبول جمہوری حکمران امریکہ کے پتھر دل میں ایسا گداز پیدا نہیں کر سکے۔ بلاشبہ یہ دورہ سارے زمانوں کا کامیاب ترین دورہ ہے لیکن دو باتوں نے اس کا حسن گہنا دیا۔ ڈینٹل پرل کا معاملہ تو خیر ہمارے بس میں نہیں لیکن بعض بیمار ذہنوں نے جو تے اتروانے اور جامہ تلاشی والے قضیئے کو ضرورت سے زیادہ ہوا دی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تصویر کے روشن رخ کو دیکھا جائے۔ امریکی عنایات اور صدر بش کے شیریں کلمات کے مقابلے میں ”جو تے اتروانے“ کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ برسوں پہلے جناب اشفاق احمد کا ایک طویل دورانے کا ڈرامہ پی ٹی وی پر چلا تھا جس کا نام تھا ”ننگے پاؤں“ موجودہ حالات میں شاید اسے دوبارہ دکھانا ممکن نہ ہو لیکن یہ ڈرامہ کیسٹ اور کتاب کی شکل میں دستیاب ہے۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بڑے ادیب کی فکر رسا کس طرح آنے والے زمانوں کے اس پار کی خبر رکھتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکی عنایات نے ساری قوم پر کیف و سرمستی کی کیفیت طاری کر رکھی ہے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ میں موجود پاکستانی ارکان و فنڈ سرشاری کے کس عالم میں ہوں گے؟ میر کا ایک بے محل سا شعر یاد آ رہا ہے۔

شیخ جو ہے مسجد میں ننگا، رات کو تھا میخانے میں
خردہ، جبہ، ٹوپی، کرتا، مستی میں انعام کیا

ہم نے تو صرف جو تے اتارے ہیں۔

[16-02-2002]

تصویر کاروشن رخ (2)

ہلی پوری طرح تھیلے سے باہر آنے میں شاید کچھ اور وقت لگ جائے لیکن یہ بات ابھی سے کھل گئی ہے کہ عالی مقام صدر جارج بش نے دو ارب اسی کروڑ ڈالر کے قرضے میں سے جس ایک ارب ڈالر قرضے کی معافی کا تذکرہ کیا تھا وہ طلسم وہم و گماں کے سوا کچھ نہیں۔ خود وائٹ ہاؤس کے ترجمان نے اپنی بے چارگی کا اظہار کرتے ہوئے اخبار نویسوں کو بتایا ہے کہ میں اس کو پوری طرح سمجھ نہیں پا رہا۔ اقتصادی ماہرین اپنے اپنے طور پر اس پچ در پچ معصے کی گریں کھول رہے ہیں لیکن خود امریکہ خاموش ہے اور نہیں بتا رہا کہ اس ”معافی“ کے کیا معنی ہیں؟ اب تک صرف اتنی بات کھلی ہے کہ امریکہ نے قرضے کی ری شیڈولنگ کے ذریعے ادائیگی کی مدت میں اضافہ اور سود کی شرح میں جو کمی کی ہے اس سے پاکستان کو کچھ فائدہ پہنچے گا۔ چنانچہ سال ہا سال کے اس عمل کے بعد جب پاکستان کی آنے والی نسلیں جدید برقی کمپیوٹرز کی مدد سے طویل عرصے کے دوران قطرہ قطرہ جمع ہونے والی رعایت کا حجم نکالیں گی تو وہ ایک ارب ڈالر کے لگ بھگ ہوگی۔

صدر مشرف کی امریکہ روانگی سے قبل امریکی سفیر وینڈی چیمبر لین نے کہا تھا کہ صدر کا دورہ امریکہ تاریخی اہمیت کا حامل ہوگا، وہ جو مائیکس گے ملے گا اور اس موقع پر جس امدادی پیکج کا اعلان ہوگا، اس سے پوری پاکستانی قوم انگشت بندناں رہ جائے گی۔ ان کے یہ فرمودات کم از کم اس حد تک ضرور سچ ثابت ہوئے ہیں کہ پوری قوم انگشت بندناں ہے۔

اقتصادی حوالے سے پاکستان نے صدر مشرف کے دورہ امریکہ سے پانچ اہم مقاصد وابستہ کر رکھے تھے۔

- 1- امریکہ 2.8 بلین ڈالر کا پورا قرضہ بیک جنبش قلم معاف کر دے گا۔
- 2- پاکستانی برآمدات میں اضافے کے لئے امریکی منڈی میں خاطر خواہ گنجائش پیدا کی جائے گی۔

3- پاکستانی مصنوعات کے لئے ٹیرف (کسٹم ڈیوٹی وغیرہ) ختم کر دیا جائے گا یا اس میں نمایاں کمی کی جائے گی۔

4- پاکستان کو بڑے ترقیاتی منصوبوں کے لئے کافی اقتصادی امداد ملے گی۔

5- دفاعی تعاون کا وہ بندوبست بحال ہو جائے گا جو 1990ء تک چلتا رہا۔

ان میں سے کوئی ایک مقصد بھی پوری طرح حاصل نہیں ہو سکا۔ قرضے کی معافی تاویلات میں الجھ چکی ہے اور اگر عالمی ذرائع ابلاغ کے تبصرے درست ہیں تو ہمارے ساتھ بے ڈھب قسم کی فریب کاری کی گئی ہے، جیسے ٹائی کا جھانسا دے کر بسورتے بچے کو راضی کیا جائے۔ اہم پہلو یہ ہے کہ اس جھانسنے کے لئے بھی کانگریس اور سینٹ کی منظوری لازمی ہے جب کہ سینٹ اور کانگریس کی تعلقات خارجہ کمیٹیوں کے دونوں سربراہ متضاد خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ سینٹ کمیٹی کے چیئرمین سینٹر جوزف بیڈن نے پھر یاد دہانی کرائی ہے کہ ”شرائط کی پابندی ضروری ہے۔“ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ بھارت پر بھی زور دیں گے کہ وہ ”سرحدوں پر کشیدگی کم کرنے“ تو انہوں نے چڑ کر کہا ”میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ کون ٹھیک ہے اور کون غلط، البتہ پاکستان کو چاہئے کہ سرحد پار سے مداخلت کاری نہ کرے اور لائن آف کنٹرول پر کشیدگی میں کمی لائے۔“ ادھر بھارتی لابی اور اس کے زیر اثر ڈیڑھ سو سے زائد سینئرز اور کانگریس میں بھی متحرک ہو گئے ہیں اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ لب تک جام آنے میں کتنی لغزشیں حاصل ہوں گی۔

پاکستانی برآمدات میں اضافے کے لئے کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں کی گئی۔ نیکسٹل کوٹے میں پاکستان کے ساتھ پہلے ہی امتیازی سلوک ہو رہا ہے۔ یہ کوئٹہ دونی صد ہے جو پاکستان کی پیداواری صلاحیت اور کاشن کی کوالٹی کے اعتبار سے نہایت کم ہے۔ امریکی درآمد کنندگان کو پاکستانی پولی ایسٹر پر 20 فی صد سے زائد اور کاشن پر تقریباً 30 فی صد کسٹم ڈیوٹی ادا کرنا پڑتی ہے۔ امریکہ کاشن درآمد کرنے والے بیالیس دوسرے ممالک کو متعدد رعایتیں دے چکا ہے۔ پاکستان اور امریکہ کے کاروباری طبقے کو صدر کے دورہ امریکہ سے خاصی توقعات تھیں۔ وزیر تجارت اسی مقصد کے لئے پاکستانی وفد میں شامل تھے لیکن ”جو تا چھپائی اور جامہ تلاشی“ کی اذیت و ندامت کے باوجود ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ امریکہ نے نیکسٹل کوٹے میں تقریباً چودہ کروڑ ڈالر کے برائے نام اضافے کا اعلان کیا ہے جسے خود جناب رزاق داؤد نے ”بہت ہی کم“ (very

(small) اور غیر تسلی بخش قرار دیا ہے۔ ٹیرف میں خاتمے یا اس میں کمی کا مطالبہ یکسر رد کر دیا گیا ہے چنانچہ بھاری کسٹم ڈیوٹی کی زنجیر سے بندھی پاکستانی برآمدات امریکی ساحلوں تک شاید ہی پہنچ پائیں۔ پاکستانی برآمد کنندگان نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ٹیکسٹائل کوٹے میں حقیر اضافہ بھی عملاً غیر موثر رہے گا کیونکہ بھاری ٹیرف کے باعث امریکی درآمد کنندگان دوسرے ممالک کو ترجیح دیں گے۔ شدید بحران میں جتلا ٹیکسٹائل انڈسٹری کے لئے یہ بڑی خبر ہے۔

سماجی شعبے کے لئے متوقع امریکی امداد کا تعلق غیر ترقیاتی کاموں سے ہے۔ مثلاً تعلیم کے لئے جو تین کروڑ چالیس لاکھ ڈالر ملیں گے ان کا بڑا حصہ تعلیمی نصاب کی تبدیلی، تربیت اساتذہ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے لئے ہوگا۔ یہی حال دیگر سماجی شعبوں کا بھی ہے۔ پاکستان کی یہ توقع پوری نہیں ہو سکی کہ اہم ترقیاتی منصوبوں کے لئے امریکہ کھل کر مدد دے گا۔

1990ء سے قتل کے دفاعی تعاون کی بحالی کا اعلان بھی نہیں ہوا۔ اس ضمن میں مشاورتی گروپس کا احیاء مستقبل قریب میں کوئی اہم نتیجہ مرتب نہیں کر پائے گا۔ جاتے جاتے یہ مژدہ سنایا گیا ہے کہ پندرہ دنوں کے اندر اندر پاکستان کو 22 کروڑ ڈالر ملیں گے اور یہ اس خدمت اور تعاون کا معاوضہ ہے جو پاکستان، اپنی سرحدوں کے اندر امریکی فوج کو فراہم کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسرائیل کو بھی 28 کروڑ ڈالر دینے کا اعلان ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دوسری ریاستوں کو بھی بہت کچھ ملے گا۔ تو کیا بی بی سی کا یہ تبصرہ درست ہے کہ صدر مشرف ذاتی تعریف و توصیف کا بھاری خزانہ سمیٹ کر وطن واپس جا رہے ہیں لیکن امریکہ سے وابستہ اقتصادی توقعات کے حوالے سے ان کی جھولی خالی ہے؟ یا یہ تصویر کا صرف تاریک رخ دیکھنے والوں کی کم نظری ہے؟

[17-02-2002]

تصویر کاروشن رخ (3)

یہ واہمہ جتنا جلد دور کر لیا جائے اتنا ہی بہتر ہوگا کہ پاکستان اور امریکہ کسی پائیدار اور مخلصانہ دوستی کی راہ پر چل سکتے ہیں۔ اول و آخر پاکستان، امریکہ کا جزوقتی رفیق ہے۔ افغانستان میں طالبان کا تختہ الٹنے اور امریکی جلال کے سامنے خود سری کا مظاہرہ کرنے والے ان گڑھ ”ملاؤں“ کو نمونہ عبرت بنانے کے لئے، ہماری ضرورت تھی۔ امریکہ کا خیال تھا کہ طالبان پاکستان کی تخلیق ہیں، پاکستان ہی نے انہیں پروان چڑھایا اور پاکستان ہی ان کا سرپرست و پشت پناہ ہے۔ صدر کلنٹن کے دور سے ہی پاکستان پر دباؤ چلا آ رہا تھا کہ وہ طالبان کو لگام ڈالے لیکن کوئی جمہوری حکومت ایک حد سے آگے نہیں جاسکتی تھی کیونکہ خود اس کی اپنی لگام کسی اور کے ہاتھ میں تھی۔ طالبان کے قلعے میں نقب لگانے کے لئے امریکہ کو ہماری مجبوری کی ضرورت تھی۔ ہماری دوزخ میں آنکھوں اور ہمارے کندھے کے بغیر وہ اپنے ہدف کا درست نشانہ نہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ہمیں خدمت گزاری کا ایک موقع دیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر ہم نے تعاون سے گریز کیا تو ہمارے ساتھ دشمنوں والا سلوک کیا جائے گا اور پتھر کے زمانے میں دکھیل دیا جائے گا۔ ہماری کمزوری و معذوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکہ نے مختصر مدت میں اپنے اہداف حاصل کر لئے۔ اس عرصے میں ہمارا تعاون خود امریکی توقعات سے بھی زیادہ رہا اور ہم نے امریکہ کی ولداری و خوشنودی سکے لئے اس بات کی ذرہ برابر پرواہ نہ کی کہ خود اہل پاکستان کے دلوں پر کیا گزر رہی ہے اور پاکستان کی انا، خودی، آزادی اور خود مختاری کو کتنے زخم لگ رہے ہیں۔

ممکن ہے یہ ٹھنڈا اتفاق ہی ہو کہ جب افغانستان میں روس کی سرخ سپاہ کے پرچھے اڑانے کے لئے جنوں خیز جذبہ جہاد کی ضرورت محسوس ہوئی تو پاکستان کی باگ ڈور اسلامی جذبے سے سرشار ایک ایسے جرنیل کے ہاتھ میں تھی جسے قوم نے مرد مومن، مرد حق کے خطابات سے نوازا۔

افغانستان کے پہاڑوں اور وادیوں میں جہاد کی پر عزم اڈانیں ایک عشرے تک گونجتی رہیں۔ خود امریکہ دنیا بھر کے مسلم نوجوانوں کو افغانستان کی راہ دکھاتا اور وائٹ ہاؤس کو مجاہدین اسلام کے مبارک قدموں سے مشرف کرنے کو سعادت سمجھتا رہا اور جب اس پھر سے ہوئے جذبہ جہاد کو دہشت گردی قرار دینے اور اسلامی فعالیت کو کچلنے کے لئے ایک لبرل، روشن خیال اور تجدد پسند لیڈر شپ کی ضرورت محسوس ہوئی تو پاکستان میں جنرل مشرف کی حکومت تھی۔ دونوں دفعہ امریکہ کو کسی منتخب جمہوری حکومت سے نہیں، محض ایک فرد سے معاملہ کرنا تھا۔ دو مختلف زمانوں میں، دو مختلف انداز کے مقاصد کے لئے ایک ہی ادارے کی دو مختلف شخصیات سے کام لینا یقیناً امریکی ہنرمندی کی دلیل ہے۔ یہ بعید شاید کبھی نہ کھل سکے کہ امریکہ کو جہاد اصغر کی ضرورت پڑے یا جہاد اکبری، پاکستان کا موسم اس کے لئے سازگار کیوں ہوتا ہے؟ شاخ گل پر اس کی پسند کا رنگ اور خوشبو رکھنے والا پھول ہی کیوں کھل اٹھتا ہے؟

امریکی عنایات کے گوشوارے بنانے یا اس کے عزائم کی پردہ کشائی کے کار لاجال میں الجھنے کے بجائے صرف اتنی بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ امریکہ ایک مخصوص وقت کی مخصوص ضرورت کے لئے ہمیں استعمال کر رہا ہے۔ دنیا کی واحد سپر پاور ہونے کے ناتے وہ اسے اپنا حق سمجھتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک اور کسی بھی ادارے کو وہ اپنے مفادات کا آلہ کار بنالے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دنیا اس کے ہم قدم ہے لیکن ہماری کیفیت جداگانہ ہے۔ کوئی سڑکوں پر نکلے یا نہ نکلے، اتنی بات ضرور پیش نظر رہنی چاہئے کہ کروڑوں پاکستانی اداس ہیں۔ ان کے شیشہ دل پر ایسی کاری ضرب لگی ہے کہ نوکیلی کرچیاں لہو کی ایک ایک بوند میں کلبلا رہی ہیں۔

صدر بش نے پاکستان کے تعاون کو مشترکہ مقاصد، مشترکہ نصب العین اور مشترکہ اقدار سے مشروط کیا ہے۔ مشترکہ کا مفہوم دونوں قوموں کے باہمی مفادات کا تقاضا کرتا ہے لیکن کیا امریکہ اس پر آمادہ ہوگا کہ اپنی منصوبہ بندی میں ہماری اقدار ہمارے مقاصد اور ہمارے نصب العین کو بھی جگہ دے؟ مشترکہ مقاصد، مشترکہ نصب العین اور مشترکہ اقدار کا سیدھا سادہ امریکی مفہوم یہ ہے کہ پاکستان اپنے سارے ذرائع سارے وسائل ساری قوت کار اور سارا اثاثہ عمل امریکی اہداف کے لئے وقف کر دے۔ افغانستان کے کوچہ و بازار کو درویش صفت طالبان کے لہو سے رنگین کرنا، اسلام کے حرکی تصور کو کچلنا، اسلامی عقائد و نظریات پر ضربیں لگانا، دنیا بھر کی اسلامی تنظیموں کی

مشکلیں کسنا، مسلم راہنماؤں کو گالی بنا دینا، مظلوم مسلمانوں کی مدد کرنے والے اداروں کا ناطقہ بند کرنا، اسلامی تعلیمات کی توسیع و اشاعت میں مصروف دینی مدارس کو ٹیکل ڈالنا، پاکستان کو اپنی نظریاتی اساس سے محروم کر کے لبرل ازم کے صحرائے بے اماں میں دھکیلنا، نصاب تعلیم کو اسلامی رنگ و بو سے محروم کر کے آزاد روی کے مغربی تصور سے ہم آہنگ کرنا، کشمیر کے جہاد آزادی کو وہشت گردی قرار دینا، فلسطین میں اسرائیل کی ہاتھوں میں بانہیں ڈال کر شیطانی رقص کرنا، پاکستان کو بھارتی مدار کا بے روح سیارہ بنانے کی کوشش کرنا، اس کے ایٹمی پروگرام کو مشکوک بنانا، مسلمان قیدیوں کے لئے گوانٹانامو جیسی اذیت گاہیں بنانا، ایران اور عراق کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دینا، ان میں سے کون سا نصب العین، کون سا مقصد اور کون سی اقدار ایسی ہیں جو اہل پاکستان کے لئے بھی وچہ تسلی بن سکیں؟

تصویر کا روشن رخ یہی ہے کہ امریکی دوستی کے ثمرات، ان کے معیار اور ان کی مقدار کا درست اندازہ لگایا جائے۔ آؤ بھگت کی گرمجوشی، رکھ رکھاؤ کے والہانہ پن اور چند پرفریب آرائشی اقدامات پر بغلیں بجانا یقیناً تصویر کا تاریک رخ ہے۔

تصویر کے سارے خدو خال اور اس کے دونوں رخ پوری جزئیات کے ساتھ ہمارے سامنے ہیں۔ اگر ہم اب بھی روشنی اور تاریکی میں امتیاز نہ کر پائے تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

[18-02-2002]

ایک پرچون بل

جناب شوکت عزیز امریکہ کو تین سولین ڈالر کا بل بھیج رہے ہیں۔ یہ بل گیارہ ستمبر یا سات اکتوبر سے لے کر 31 جنوری 2002ء تک کے عرصے میں پاکستان کی طرف سے انجام دی گئی خدمات کے عوضانے کے طور پر بننے والی رقم پر مشتمل ہوگا۔ دونوں ممالک نے کچھ عرصہ قبل ہی دو طرفہ خدمات کے ایک باضابطہ معاہدے پر دستخط کئے ہیں۔ اس معاہدے کے تحت، دبشت گُردی کے خلاف مہم کے لئے امریکہ کو پاکستان میں اپنی افواج رکھنے کی ضرورت ہوگی تو پاکستان طے شدہ سہولتیں فراہم کرنے کا پابند ہوگا۔ اسی طرح جب پاکستان اپنے کسی دشمن کے تعاقب میں، عالمی مہم کی قیادت کرتا، ملکوں ملکوں ہوتا، اپنی افواج کو امریکہ میں اتارے گا اور مختلف ہوائی اڈوں سے کسی ”اسامہ بن لادن“ کے خلاف آپریشن کرے گا تو اسے بھی یہ ساری سہولیات میسر ہوں گی۔ ان میں خوراک، پانی، ٹرانسپورٹیشن، ایندھن، مواصلات اور علاج معالجے کی سہولتیں شامل ہیں۔ طیاروں اور دیگر مشینی آلات کی دیکھ بھال اور مرمت کی سہولتیں فراہم کرے گا بھی باہمی معاہدے کا حصہ ہے۔ ہوائی اڈوں اور متعلقہ تنصیبات کو استعمال کرنے اور اشیاء ذخیرہ کرنے کا معاوضہ بھی متعلقہ ملک کو ادا کرنا ہوگا۔ حکام کا کہنا ہے کہ ان سہولیات کے عوض امریکہ کو ماہانہ 60 سے 75 ملین ڈالر تک ادا کرنا ہوں گے۔

بل ابھی تیاری کے مراحل میں ہے۔ ایک خاص فارمولے کے تحت مذکورہ سہولتوں کے استعمال اور ان کے معاوضے کا تعین کیا جا رہا ہے۔ متعلقہ اداروں سے معلومات جمع کی جا رہی ہیں۔ اس بھرپور مشق کے بعد بل امریکہ کو ارسال کر دیا جائے گا جہاں سے مطلوبہ رقم کا چیک جاری ہو جائے گا۔ یہ ساری رقم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خزانے میں جائے گی اور یوں عملاً اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ہر پاکستانی کی جیب میں بھی جائے گا۔ یک مشت ملنے والی رقم کا تخمینہ ایک سو تیس روپے فی کس کے لگ بھگ ہے جو کوئی معمولی رقم نہیں۔ جب تک امریکی فوجیں ہماری سرزمین پر

خیر زن رہیں گی، ماہانہ تقریباً نصف ڈالر یعنی تیس روپے ہر پاکستانی کو ملتے رہیں گے۔ امریکی افواج کا قیام جتنا طویل ہوگا اسی قدر اہل پاکستان کی مالی آسودگی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ ایک مخلص پاکستانی کی حیثیت سے میری خواہش ہے کہ امریکہ کو بھیجے جانے والے بل کی رقم میں ہر ممکن اضافہ کیا جائے۔ کچھ پرچون قسم کے متفرق خرچوں کا کھاتہ میرے پاس بھی ہے یہ وہ عداوت ہیں جن کے ناپ تول کا کوئی پیمانہ ابھی تک رائج نہیں ہوا۔ ان کی قدر و قیمت کا تعین بھی خاصا کٹھن کام ہے۔ لیکن جناب شوکت عزیز جیسے معاشی جادوگر کے لئے کوئی فارمولہ وضع کرنا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ میرے پاس پاکستان کے طول و عرض سے لوگوں کے بھیجے ہوئے ایسے بل جمع ہیں جو وہ براہ راست امریکہ کو ارسال نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں بڑی مقدار آہوں اور سسکیوں کی ہے جنہیں گنٹھڑیوں کی صورت میں باندھا جائے تو جانے کتنے C-130 بھر جائیں۔ بے شمار آنسو ہیں جو کئی ماہ گزر جانے کے بعد بھی انگاروں کی طرح دکھ رہے ہیں۔ کئی زخم ہیں جن سے مسلسل لبورس رہا ہے اور ڈالروں کی مرہم پٹی کے باوجود تھمنے میں نہیں آ رہا۔ بے شمار چکنچا چور خواہوں کی کمرچیاں ہیں جو لبو کی ایک ایک بوند میں کلبلار ہی ہیں۔ کتنی ہی بے خواب راتوں کے ڈھیر لگے ہیں جن سے ابھی تک دھواں اٹھ رہا ہے۔

پاکستان کے لوگ عجیب منی سے بنے ہیں۔ اسلام سے لازوال وابستگی ان کے دل میں روح بن کر دھڑکتی ہے۔ عالم اسلام ان کی دعاؤں میں مہکتا ہے اور دنیا کے کسی بھی خطے کے مسلمان کے پاؤں میں کاٹنا چھبے تو کسک ان کے جگر میں ہوتی ہے۔ افغانوں سے تو ان کا صدیوں کا اور نسلوں کا رشتہ ہے۔ ان کے دشمن اور ہیر و سانجھے ہیں۔ ان کی تاریخ اور ان کا جغرافیہ ایک دوسرے سے ہم آغوش ہیں۔ ان کی روایتیں اور حکایتیں ایک سی ہیں۔ ان کی اقدار اور ان کے اطوار یکساں ہیں۔ یہ بات تو کسی پاکستانی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ان افغانوں کی بستیاں تاراج کرنے کے لئے امریکہ اس خطے میں آئے گا تو ہمارے صحن میں بسیرا کرے گا اور ہمارے پروں پر بیٹھ کر افغانوں پر چاند ماری کرے گا۔ طالبان ان کے دلوں کو گر ماتے تھے۔ یہ سادہ و درویش لوگ انہیں ایچھے لگتے تھے اور جب ڈیزی کزبمیں اور میزائلوں سے ان کی دھجیاں اڑائی جانے لگیں تو ان کے دل پچکی کے دوپاٹوں میں پسے لگے۔ خبریں آنے لگیں۔ مسجدوں کے میناروں کے زمیں بوس ہونے کی خبریں، بستیوں کے پیوند زمین ہونے کی خبریں، مگر گھر سے آئے مسلم نوجوانوں کے

شہید ہونے کی خبریں، پاکستانیوں کی تذلیل کی خبریں، ملا عمر کے دس سالہ بیٹے سمیت سینکڑوں معصوموں کی ہلاکت کی خبریں، قلعہ جنگلی میں دو ستم اور امریکہ کی قابری کا نشانہ بننے والے قیدیوں کی خبریں، ہسپتالوں میں پڑے مریضوں کو پینڈ گریڈوں سے اڑانے کی خبریں، کیوبا کے اسپروں کی حالت زار کی خبریں، پناہ کی تلاش میں سرگرداں اسامہ کی خبریں، ملا عمر کی درپردہ کی خبریں، عبدالسلام ضعیف کے جرم ضعیفی کی خبریں اور پاکستان کی بے چارگی کی خبریں..... خبریں آتی رہیں اور پاکستان کے لوگ دیکھتے انگاروں پر لوٹتے رہے۔

وہ بہت روئے۔ بہت کلبلائے، سردیوں کی لمبی راتوں میں دعاؤں کے دیئے فروزاں کر کے بیٹھے رہے۔ ان کی آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں نے ان کی دیوار جاں تک بلا ڈالی۔ میرے پاس یہ سارا کھانا لاتعداد خطوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ میں اسے مرتب کر کے جناب شوکت عزیز صاحب کو بھجوا سکتا ہوں۔ ممکن ہو تو وہ ڈیزل، پٹرول اور روٹی پانی کے بل کے ساتھ ان پر چون اشیا کی قیمت بھی شامل کر لیں۔ اہل پاکستان کی اعصاب کش بے کلی، اذیت ناک اضطراب، بے پناہ مایوسی و بددلی، سلگتے آنسو، جاگتی آنکھیں اور کرچیاں بے خواب، ڈیزل اور پٹرول جتنی قیمت نہ پاسکیں تو بھی کچھ نہ کچھ رقم تو مل ہی جائے گی۔ ممکن ہے جناب شوکت عزیز متفرق اشیا کی قیمت کا تعین نہ کر سکیں اس لئے میں ساری کرچیاں پاکستان کے بچوں کے حوالے کر جاؤں گا اور کہوں گا کہ اگر تم بھی کچھ نہ کر پاؤ تو یہ سارے بل اپنے بچوں کو سو نپ جانا لیکن یہ قرضہ کبھی ”رائٹ آف“ نہ کرنا۔

[19-02-2002]

پیس نمبر 8 کانیا مکین

ستاسی سالہ بوڑھے شخص نے افغانستان کی زمین پر قدم رکھا تو وہ حکمران نہیں تھا۔ 1973ء کی روشن صبح، ایک آسودہ حال بادشاہ کی حیثیت سے جب وہ چھٹیاں گزارنے اٹلی روانہ ہوا تو اسے اندازہ نہ تھا کہ آنے والے انتیس سالوں تک وہ واپس نہیں آسکے گا۔ اس کے قریبی عزیز اور وزیراعظم سردار محمد داؤد نے، اس کی روانگی کے فوراً بعد ملک کی باگ ڈور سنبھالی اور بادشاہت کا دریچہ بند کر کے صدارت کا منصب سنبھال لیا۔ 1979ء میں روس کی سرخ سپاہ نے دور تک جانے کے ارادے کے ساتھ افغانستان پر حملہ کیا۔ ایک عشرے تک افغانستان آگ اور بارود کے جہنم میں جلتا رہا۔ افغانستان کے غیور عوام جہاد کا پرچم اٹھائے ایک خونخوار عنقریب سے ٹکراتے رہے یہاں تک کہ وہ زخموں سے چور ہو کر، خون کی ایک لمبی لکیر چھوڑتا دریاے آمو کے اس پار چلا گیا۔

اس سارے عرصے میں ظاہر شاہ آسودگی کے ساتھ اٹلی کے عشرت کدوں میں محو استراحت رہا۔ سامراج کی مذمت اور آزادی کی جنگ لڑتے افغانیوں کی توصیف میں اس کے کج گلب سے ایک حرف بھی نہ پھوٹا۔ جمعرات کے روز اس کے اطالوی طیارے نے جس حرماں نصیب شہر کے انرپورٹ کو چھو آ، اس کا نصف حصہ کھنڈر بن چکا ہے۔ دنیا اسے ”بیواؤں اور یتیموں کا شہر“ کہتی ہے۔ اطالوی محافظوں کے جلو میں اس نے سرخ قالین پر قدم رکھا۔ چڑے کی جیکٹ میں ملبوس بوڑھے نے کانپتے ہونٹوں سے اس سرزمین کو بوسہ دیا جس کی آزادی کی ولولہ آفریں جنگ لڑنے اور سرخ رو رہنے والے مجاہدین آج دہشت گرد قرار پا چکے ہیں۔ اپنے گھر آنے والے شخص کی حفاظت کے لئے مستعد امریکی، برطانوی اور کینیڈین سپاہ کے چاق و چوبند دستے ہتھیاروں سے مسلح کھڑے تھے۔ تیز رفتار جدید گاڑیاں، چینی چنگھاڑتی ٹکلیں اور ”شہنشاہ عالی مقام“ کو ایک آراستہ پیراستہ عمارت میں لے گئیں جو سرکاری طور پر ”پیس نمبر 8“ کے نام سے موسوم ہے۔

1933ء میں اس کا باپ قتل ہوا تو ظاہر شاہ کی عمر صرف انیس سال تھی۔ امور مملکت اس کے چچا ہاشم خان نے سنبھال لئے جس کے پاس وزرات عظمیٰ کا عہدہ تھا۔ ظاہر شاہ نے ہمیشہ مغرب کا محبوب بننے کی آرزو کی۔ مغربی سامراج سے رشتے استوار کرنا اور اس کے ایماء پر پڑوس کے ملکوں سے آنکھ مجبوی کھیلنا اس کا مشغلہ تھا۔ قیام پاکستان کا تلخ گھونٹ اس نے بڑی مشکل سے اپنے حلق سے اتارا۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت کے خلاف صرف ایک اسلامی ملک کا ووٹ آیا اور وہ ملک تھا ظاہر شاہ کا افغانستان۔ پنجتوستان کا شوشہ اس کے ذہن کی اختراع تھا۔ ظاہر شاہ اور بھارتی حکومت کی ملی بھگت اس شوشے کو مسلسل ہوا دیتی اور بہت بڑے تنازعے کے طور پر پیش کرتی رہی۔ 1973ء میں اپنی معزولی کے آخری لمحے تک ظاہر شاہ کبھی دھمکے کبھی اونچے سروں میں یہ راگ الاپتا رہا۔ اس کی ایجنسیاں ”پنجتوستان“ کے نام پر شمال مغرب میں بے چینی پیدا کرتی اور سرحد میں سرگرم عمل بھارت نواز لابی کی پرورش کرتی رہیں۔

ظاہر شاہ کہتا ہے کہ میں بادشاہت قائم کرنے نہیں آیا لیکن اس کا چوالیس سالہ بیٹا میر واعظ شاہ اپنے آپ کو بادشاہ قرار دیتا ہے۔ اے ایف پی کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا کہ ”افغانستان میں برطانوی طرز کی بادشاہت کا اعلان ہونا چاہئے“ یون میں جنم لینے والی یونی حکومت کے بونے سربراہ، حامد کرزئی کے ذہن میں بھی اقتدار کا کیڑا کھلبلا رہا ہے۔ وہ بڑی چابکدستی سے ایک پلان پر عمل پیرا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ جون میں منعقد ہونے والا لویہ جرگہ برطانوی رنگ کی بادشاہت کی توثیق کر کے اس کی وزارت عظمیٰ کی راہ ہموار کر دے۔ اس کی کاہنہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ سب سے مضبوط رکن، وزیر دفاع قاسم فرہیم، شاہ کا استقبال کرنے اتر پورٹ نہیں گیا۔ اس کا تعلق برہان الدین ربانی کی جمعیت اسلامی سے ہے جو بادشاہت کے احیاء کے خلاف ہے۔ یونس قانونی اور عبداللہ نرم گوشہ رکھنے کے باوجود جمعیت کی پالیسی کے پابند ہیں اور وہ کسی طور بھی شاہی نظام کی حمایت نہیں کریں گے۔ شاہ کا مشیر اعلیٰ، معاون خصوصی اور داماد، جنرل عبدالولی بھی بے شمار آرزوؤں کی پوٹلی بفل میں لئے واپس آیا ہے۔ وہ سازشوں کے جال بننے کا ہنر بھی جانتا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ افغانستان میں بے کلی، افراطی اور نفسا نفسی کا ایک نیا دور شروع ہونے والا ہے۔ جون سے پہلے کاہنہ میں تقسیم کی لکیریں اور گہری ہوں گی۔ تاجک پشتون تناؤ مزید بڑھے

گا۔ ہزارے اور ازبک نئے پتے کھیلیں گے۔ وارلارڈز اپنے اپنے تحکم کا سکہ جمائیں گے اور عین شاہ کی آمد کے دن خوست کے درو دیوار ہلا دینے والے، اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے رہیں گے۔ اپنے مفاد کے لئے مردہ بادشاہتوں کو زندہ کرنے اور آمریتوں کی پرورش کرنے والا ”جمہوریت پرست“ امریکہ موجود رہے گا اور اپنے مکروہ عزائم سے ماحول کو پراگندہ کرتا رہے گا۔

اطالوی جہاز پر بیٹھ کر آنے والا شاہ، بدستور اطالوی گارڈز کے حصار میں رہے گا۔ ”پیسلس نمبر 8“ کے گرد نئی دیواریں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ ایک بڑے آہنی پھانک کے سوا داخلے کے تمام راستے بند ہیں۔ ہر طرف شارٹ سرکٹ ٹی وی کیمرے نصب ہیں۔ سات سمندر پار سے آئی رنگا رنگ سپاہ نے محل کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ گلی میں امریکی ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں کھڑی ہیں۔ افغانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ غیروں کی دہلیز پر غلاموں کی طرح سجدہ ریز شاہوں اور شہزادوں کو پسند نہیں کرتے۔

ظاہر شاہ فلپائن کے باورچی اپنے ہمراہ لایا ہے۔ وہ اس کے لئے رنگا رنگ کھانے پکائیں گے۔ طلائی طشتریوں میں رکھ کر آبخوسی میزوں پر سجائیں گے۔ فاقہ زدہ ملک کا ”شاہ“ اپنی پوتی حمیرہ، اپنے بیٹوں اور اپنے داماد عبدالولی کے ہمراہ تناول فرمائے گا۔ زخم خوردہ افغانستان کی خودی اور غیرت کی تابندہ علامت، قندھار کا مرد جری جانے کہاں ہوگا؟ اس کے اہل و عیال تو بند خزاں ہو چکے۔ جواں سال بیٹا امریکی بموں کا لقمہ ہو چکا اور وہ خود جانے کس پہاڑ کے غار میں فاقہ کشی کے دن گزار رہا ہے۔ تاریخ یہی بتاتی ہے کہ غیروں کے خوانِ نعمت سے لذتیں سمیٹنے والوں کی زندگی آسان اور موت ذلتوں سے بھری ہوتی ہے۔ سراونچا کر کے چلنے اور اپنی انا کا سودا نہ کرنے والے نان جوئیں کو بھی ترستے لیکن بڑی ہی آبرو مندانہ موت مرتے ہیں۔

[20-02-2002]

امریکہ اور بھارت

امریکی افواج کے سربراہ، جنرل رچرڈ ڈبلیو مائر، بھارتی وزیر دفاع جارج فرینڈس کی دعوت پر بھارت کا دورہ مکمل کر کے واپس جا چکے ہیں۔ انہوں نے بھارتی سر زمین پر قدم رکھتے ہی فرمایا کہ دہشت گردی کے خلاف بھرپور کارروائی کے لئے بھارت اور امریکہ کی افواج کے درمیان گہرا تعاون نہایت ضروری ہے۔ صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف کو امریکہ کے سرکاری دورے سے واپس آئے ابھی اڑتالیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے اور ابھی جناب شوکت عزیز، عنایات خسروانہ کے گوشوارنے اور مستقبل پر ان کے اثرات کے زائچے مرتب کر رہے تھے کہ امریکی جرنیل نے سارا مزا کر کر کر دیا۔

نئی دہلی میں قیام کے دوران جنرل مائر نے بھارت کی صف اول کی ساری قیادت سے تفصیلی ملاقاتیں کیں اور باہمی تعاون کو فروغ دینے کے لئے وسیع تر امکانات کا جائزہ لیا۔ دونوں ممالک کے درمیان ایک ارب ڈالر کے جدید اسلحہ کی خریداری کا سودا طے پایا جسے تاریخ کا سب سے بڑا سودا کہا جا رہا ہے۔ ہائی ٹیک اسلحہ، جدید جیٹ انجن اور تیزنگاہوں والے ریڈاروں کے علاوہ بحریہ کے لئے بھی بھاری کھیپ کی فراہمی کا اصولی فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ جدید ترین راڈاروں کی سپلائی کے حوالے سے ایک امریکی عہدیدار نے بتایا کہ بھارت کو غالباً کشمیر میں مداخلت کاروں پر نظر رکھنے اور ان کے خلاف موثر کارروائی کے لئے ان کی ضرورت ہے۔ بھارت نے ایسے راڈاروں کے دو سو نظاموں کی خواہش ظاہر کی ہے۔ ایک سو ساٹھ کلومیٹر لمبی لائن آف کنٹرول کی نگرانی کے لئے حساس گراؤنڈ سینرز اور ہلکے لڑاکا طیاروں کی فراہمی بھی زیر غور ہے۔

بی بی سی کے مطابق امریکہ ”آئی آف سکاٹی“ نامی جدید طیارہ فراہم کرنے پر بھی راضی ہو گیا ہے جو آسمان کی بلندیوں سے پانچ چھ کلومیٹر پر محیط دائرے میں ہونے والی ہر نقل و حرکت پر نظر رکھ سکے گا۔ بھارتی فوج کی تربیت کے لئے دی جانے والی امداد بھی دگنی کر دی گئی ہے۔ جنرل رچرڈ ڈبلیو

ماٹر کا طیارہ فضا میں بلند ہوا تو ایک اور طیارہ نئی دہلی میں لینڈ کر رہا تھا جس میں ایک اور امریکی فوجی وفد میجر جنرل بروس سکاٹ کی قیادت میں وارد ہو رہا تھا۔ یہ وفد اسلحہ کی خریداری اور باہمی فوجی تعاون کی تفصیلات مرتب کرے گا۔ ایک اور وفد تکنیکی معاملات پر گفتگو کے لئے پاور راکب ہے۔ اسی ماہ کے اوائل میں امریکہ کے میجر جنرل جیمز کیمپل مشترکہ تربیتی پروگرام کی جزئیات طے کرنے کے لئے بھارت کا دورہ کر چکے ہیں۔ جنوری میں جارج فرینڈس نے امریکہ کا تفصیلی دورہ کیا تھا جس میں فوجی تعاون کی راہیں تراشی گئیں۔ اپنے دور کے اختتام پر دنیا کے ”قاہرانہ لشکر“ کے سربراہ نے اپنے عجز ہنر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ”امریکہ کشمیر کے ضمن میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ کام پاکستان اور بھارت کو خود ہی کرنا ہوگا۔“

اس امر سے قطع نظر کہ حالیہ دورہ امریکہ کے درمیان صدر مشرف کے لئے کس رنگ کے قالین بچھائے گئے، ان کے لئے انواع و اقسام کے کون کون سے کھانے ڈاننگ ٹیبل پر چنے گئے اور صدر ہش نے ان کے لئے تعریف و تحسین کے کون سے الفاظ استعمال کئے، یہ حقیقت واضح تر ہوتی جا رہی ہے کہ امریکہ کے طویل المیعاد اہداف و مقاصد کے حوالے سے اس کا اصل اتحادی بھارت ہے۔ یہ فیصلہ 11 ستمبر سے بہت پہلے ہو چکا تھا کہ آنے والے دنوں میں امریکہ کو عالمی بساط پر کس طرح کے مہرے سجانے اور کس نوع کے داؤ چلنے ہیں۔ پاکستان کے ضمن میں امریکی رویہ 1990ء کی دہائی کے آغاز سے ہی آشکارا ہونے لگا تھا۔ ابھی روسی فوج کا آخری دستہ دریائے آمو کے اس پار نہیں گیا تھا کہ امریکہ نے آنکھیں پھیر لیں۔ جب ضیاء الحق کا تازیا نہ روسی فوج کی پیٹھ پر برس رہا تھا، وہ محبوب و عزیز تھے۔ پاکستان کا ایٹمی پروگرام امریکہ کی عین ناک تلی پروان چڑھتا رہا یہاں تک کہ چاغی کے پہاڑوں میں آزمائشی دھماکوں کے لئے سرنگیں تک کھودی گئیں لیکن امریکی صدر ہر سال کانگریس کو یہ سرٹیفکیٹ جاری کرتے رہے کہ پاکستان میں ایٹمی پروگرام کے حوالے سے کوئی پیش رفت نہیں ہو رہی۔ مطلب نکلنے ہی ساری ترجیحات بدل گئیں۔ ”ڈیٹیل پرل“ کے لئے آسمان سر پر اٹھالینے والے امریکہ کو اس وقت یہ خیال تک نہ آیا کہ اس کے دو اعلیٰ حکومتی عہدیدار کس کی سازش سے آتشکدہ بہاولپور میں بھسم کر دیئے گئے۔ نہ یہ معلوم ہوا کہ او جڑی کیپ کو کس نے چنگاری دکھائی اور نہ یہ پتہ چلا کہ ضیاء الحق سمیت صف اول کی پوری عسکری قیادت کو قتل کرنے والا ہاتھ کس کا تھا۔ ادھر روس نے پرسیٹے اور ادھر امریکہ پر انکشاف ہوا

کہ پاکستان تو اسٹیم بم بنا رہا ہے۔ پاکستان گونا گوں پابندیوں میں جکڑ دیا گیا۔ ایف سولہ طیاروں کا معاملہ آج تک امریکی محبت کی زخم خوردہ کہانی بنا ہوا ہے۔

سوویت یونین کی شکست اور کمیونزم کے فلسفے کو نیم جاں کر دینے کے بعد امریکہ نے طے کر لیا تھا کہ اس کے نئے ورلڈ آرڈر کے ضد و خال کیا ہوں گے اور نئے منظر نامے میں پاکستان کو کس جگہ رکھا جانا ہے۔ پاکستان کو ایک ناکام ریاست (Failed State) کہنے اور ”رائٹ آف“ کر دینے کے دانشورانہ تجربے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت، طاقتور ذرائع ابلاغ کے ذریعے پیش کئے جانے لگے۔ امریکہ کی اس سوچ اور طے شدہ حکمت عملی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ افغانستان کا ”پڑاؤ“، یعنی ”آگے چلیں گے دم لے کر“ والا معاملہ ہے۔ پاکستان کو وہی کچھ بنانا مقصود ہے جو 11 ستمبر سے بہت پہلے 1990ء کی دہائی میں طے پا چکا تھا۔

عین حالت جنگ میں بھارت کو ایسے ہتھیاروں اور اوزاروں سے مسلح کرنا جو براہ راست کشمیر کی جدوجہد آزادی کھیلنے کے لئے مانگے جا رہے ہیں، پر لے درجے کی پاکستان دشمنی ہے۔ اسرائیل پہلے ہی کشمیر میں سرگرم عمل ہے اور اب امریکہ بھی اس کے پہلو میں آکھڑا ہوا ہے۔ صدر مشرف کی دوستی پر فخر کرنے والا جارج بوش پاکستان کی رگ جال دبوچنے کے کیوں درپے ہے؟

[21-02-2002]

ناموس رسالت ﷺ

جنرل حمید گل نے ٹیلی فون پر ادھر ادھر کی گفتگو کے دوران چلتے چلاتے ایک جملہ کہا.....
 ”تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک طاقتور قوم اسلحہ کے زور پر دوسروں کے عقائد و نظریات بدلنے کے
 درپے ہے۔“ جنرل صاحب نے اور بھی بہت کچھ کہا لیکن یہ جملہ میرے جگر میں تیر کی طرح ترازو
 ہو چکا ہے۔

پاکستان، اسلام کے توانا اور لافانی نظریے کی اساس پر قائم ہونے والی واحد ریاست ہے۔
 اس کی تخلیق کسی سیاسی یا جغرافیائی حادثے کے باعث نہیں، اس نظریے کی بنیاد پر ہوئی کہ اسلام
 اپنے خمیر، اپنی روح، اپنے عقائد، اپنے تصور تہذیب و تمدن اور اپنے فلسفہ حیات کے اعتبار سے
 ایسی انفرادیت کا حامل ہے جو کسی دوسرے نظام فکر و عمل کی بالادستی قبول نہیں کر سکتی۔ یہی سوچ دو
 قومی نظریے کے قالب میں ڈھلی اور پاکستان وجود میں آیا۔ برصغیر کے مسلمانوں اور خود تحریک
 پاکستان کے قافلہ سالار قائد اعظم محمد علی جناح کو اس میں کوئی شک و شبہ نہ تھا کہ پاکستان اسلامی
 نظریے کی کارفرمائی کے سبب ایک جدید اسلامی ریاست کے طور پر امت مسلمہ کی ہر کابی یا قافلہ
 سالاری کرنے گا۔ یہی احساس ایک آتش فشاں جذبے اور جذبہ دیوانگی عشق میں ڈھلا اور ایک
 خواب نے تعبیر کی شکل پائی۔

اگر سیکولر ازم، لبرل ازم، تہجد پسندی، بے مہار روشن خیالی، بے لگام آزاد روی اور بے کنار
 عیش کوشی کا وہ تصور پیش نظر ہوتا جس کی تلقین آج کل کی جارہی ہے، تو تحریک پاکستان کا قافلہ
 سخت جاں آماہ سفر ہی نہ ہو پاتا اور اگر چل بھی پڑتا تو راستے کی بھول بھلیوں میں کھو جاتا کہ یہ
 ساری ”نعمتیں“ برطانوی ہند اور غالباً ہندو کے زیر تسلط ہند میں بھی میسر آ جاتیں۔ جب علامہ
 اقبال نے ایک آزاد اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا، جب قائد اعظم نے مسلمانان ہند کو آوازی
 اور جب بکھرے ہوئے لوگ اس پکار کے پرچم تلے جمع ہونے لگے تو ان میں سے ہر ایک کا ذہن

اور ہر ایک کا دل ایک ہی خیال اور ایک ہی جذبے سے ہمکنار تھا۔ ”سیکولرازم“ کی منزل مقصود کے لئے قربانیوں کی ایسی لازوال تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی تھی جو برصغیر کے مسلمانوں نے راہ آزادی کے ایک ایک سنگ میل پر رقم کی۔

پاکستان کے عوام نے تاریخ کے اس شعوری تصور کو ہمیشہ جوان رکھا۔ حکمرانوں نے اپنی مصلحتوں کی غرض سے جب کبھی اجتماعی قومی ضمیر سے چھیڑ چھاڑ کی یا پاکستان کی نظریاتی اساس کو سیکولرازم کا جامہ زیبایا پہنانے کی کوشش کی، قوم نے اپنا بھرپور دفاع کیا۔ پاکستان کو اسلام کا قلعہ یا عالم اسلام کا معتبر نمائندہ ہونے کا اعزاز محض ہماری ایٹمی صلاحیت کے باعث نہیں، پاکستانی عوام کے لئے بے پناہ اخلاص اور عالم اسلام سے گہری جذباتی وابستگی کے باعث حاصل ہوا۔

7 اکتوبر کے بعد افغانستان میں جو قیامت پیا ہوئی اور ہم کو جس طرح ایک ناپسندیدہ اور مسلمہ قومی دھارے سے متضاد روپنے پر آمادہ ہونا پڑا، اس کا قلق ہر دل میں ہے۔ بہت کچھ ہو جانے کے باوجود افق پر ابھی تک گہری دھند چھائی ہوئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہمارا رخ کدھر ہے؟ منزل کہاں ہے اور قدم کدھر کو اٹھ رہے ہیں؟ پیٹھ پر مسلسل تازیانہ برس رہا ہے اور ہم بگٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

طالبان کے خلاف ہمارا کندھا استہمال کرنے کے بعد اگر امریکہ اپنے قدم روک لیتا، ہماری خالی تجوری میں کچھ سکے ڈال کر، صدر مشرف کو مودبانہ سلام کر کے رخصت ہو جاتا تو بہت اچھا ہوتا لیکن وہ موجود ہے اور اس انداز سے موجود ہے کہ نیورلڈ آرڈر کی نقش گری کے لئے ہماری سرزمین کو ہی مرکز و محور بنا لیا ہے۔ وہ زبان سے کچھ بھی کہے، اندر سے اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہے کہ ”دہشت گردی“ یا ”اسلامی عسکریت“ کے سارے سوتے ہی سرچشمے سے پھوٹتے ہیں لہذا جب تک پاکستان کے ”نظریہ اسلام“ کو ایمان، یقین، عزم، خودی، حمیت، اسلامی اخوت، احساس تقاضا اور تصور ملت سے محروم کر کے محض رکی عقائد اور بے روح عبادات تک محدود نہیں کر دیا جاتا، اس وقت تک اس آتش خاموش میں چنگاریاں سلگتی رہیں گی۔ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ کوئی سرسری اور معمولی حادثہ نہیں۔ اس کا مقصد ہماری روح پر نشتر چلانا، ہمارے نظریاتی شعور کی جزیں کاٹنا، ہمارے ایمان و یقین کی بنیادیں ہلانا اور ہمارے اعتقادات کے قلعوں میں دراڑیں ڈالنا ہے۔ امریکہ یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ وہ پاکستان کی کسی بھی فیصل پر کندھا ڈال سکتا ہے۔

طالبان کا لہو پینے کے بعد وہ پاکستان کے اساسی نظریے اور اسلامی تشخص کو لقمہ بنانا چاہتا ہے۔
 صدر مشرف کے دورہ امریکہ کے دوران کانگریس میں ”ناموس رسالت“ قانون کو ختم
 کرنے کے بارے میں قرارداد کا محرک کوئی بھی ہو، اس کے پس منظر میں یہی سوچ کارفرما ہے کہ
 مجبوریوں کی زنجیروں میں جکڑے، اقل اس زدہ اور ہر خدمت پر آمادہ پاکستان کو اب کسی بھی چوکھٹ
 پر جھکایا جاسکتا ہے۔

امریکہ کو بتا دیا جائے کہ یہ معاملہ ذرا نازک ہے۔ اسے اسامہ بن لادن اور ملا عمر سے خلط
 ملط نہ کیا جائے۔ ختم نبوت کا عقیدہ دین اسلام کی اساس ہے جسے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے
 دین مصطفیٰ ﷺ کے ناموس کا نام دیا ہے۔

لانی بعدی زاحسانِ خدا است
 پردہ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است

اگر ہماری تخصیبات کو اپنے عزائم کے لئے استعمال کرنے والوں کا خیال ہے کہ وہ ہمارے
 دلوں کے رن ویز پر بھی اپنی مکروہات کے طیارے دوڑا سکتے ہیں تو یہ ان کی خام خیالی ہے۔ ایسا
 سوچنے والوں کو اس امر کا اندازہ ہی نہیں کہ ہر کلمہ گو مسلمان کا خاتم النبیین ﷺ سے کیا رشتہ ہے
 اور اس مقدس رشتے کے لئے وہ کیا کچھ قربان کر سکتا ہے۔
 امریکہ ہمارے دلوں پر ایسا گہرا گھاؤ لگانے کا تصور بھی نہ کرے۔

[23-02-2002]

محفوظ دنیا

ڈیپنل پرل جو بھی تھا، ایک انسان تھا اور ہم اس دین کے پیروکار ہیں جو ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی المناک اور لرزادینے والا سانحہ ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جس نے اس سانحے سے لذت کشید کی ہو اور راحت و تسکین پائی ہو۔ اہل پاکستان کے لئے رنج و غم کا ایک اضافی پہلو یہ ہے کہ یہ واردات ہماری سر زمین پر ہوئی۔ حکومت اپنے تمام تر وسائل، تنگ و دو اور اخلاص نیت کے باوجود نہ پرل کی زندگی بچا سکی نہ قاتلوں تک پہنچ پائی۔ ایک بات طے ہے کہ اس خونیں ڈرامے کا ملبہ پاکستان پر گرایا جانا مقصود تھا۔ امریکہ بوجہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسا صرف ”اسلامی شدت پسند“ ہی کر سکتے ہیں جن کی بیخ کنی کے لئے پاکستان کو زیادہ موثر کردار ادا کرنا چاہئے۔ یہ واردات جہاں امریکہ کی غضب ناک کی میں شدت کا باعث بنے گی وہاں پاکستان پر دباؤ میں بھی اضافہ ہوگا۔ یہی وہ مطلوب و مقصود ہے جو اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسانی زندگی ایک قیمتی متاع ہے۔ جب اس متاع کو جنس ارتقا بنانے کا چلن عام ہو جائے تو پوری انسانیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ احترام انسانیت اور بقائے انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہر انسان کی زندگی کو محترم جانا جائے۔ اس کی عزت نفس کو مجروح نہ کیا جائے اور اس کے وقار انسانیت پر ضرر نہیں نہ لگائی جائیں۔

انسانی قتل کے پیچھے نفرت، غصہ، انتقام اور لالچ جیسے کردہ محرکات کار فرما ہوتے ہیں۔ مذاہب ان منفی جذبوں کی تہذیب کرتے اور انسان کی حیوانی جبلت کو کھر درے پن سے پاک کر کے تحمل و برداشت اور حکمت و دانش سے کام لینے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ جبر، ظلم، زیادتی، دھونس، ایذا دہی اور انسان کشی مہلک بیماریاں ہیں۔ یہ بیماریاں انفرادی طور پر بھی لاحق ہو سکتی ہیں اور اجتماعی طور پر اقوام بھی ان میں مبتلا ہو سکتی ہیں۔ ان کے تدارک کے لئے کسی مجرم کو پھانسی

چڑھادینے یا کسی گروہ کا ناطقہ بند کر دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اس کے لئے تو پوری فضا کو جراثیم سے پاک کرنا پڑے گا۔ پوری آب و ہوا کو مضر اور جان لیوا اجزاء سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ یہ محض ایک مقبول اور اس کے قاتلوں کا نہیں، اس انسانیت کش سوچ اور سفاکانہ رویے کا معاملہ ہے جس نے سارے عالمی منظر کو خون آلود کر رکھا ہے۔

صدر پرویز مشرف نے ٹیلی فون پر امریکی صدر سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے اس عزم کا اعادہ کیا کہ پاکستان بدستور دہشت گردی کے خاتمے کی مہم میں امریکہ کا ساتھ دیتا رہے گا۔ دونوں ممالک نے دنیا کو محفوظ بنانے کے لئے جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان بھی کیا۔ صدر مشرف کی طرف سے ان جذبات کا اظہار حالات کا فطری تقاضا تھا کہ پاکستان بہر حال اس واقعے کا بوجھ محسوس کر رہا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا کو کس طرح محفوظ بنایا جائے؟ جب طاقت ہی معیار حق ٹھہرے، جب تیز دھار چھری ہی انصاف کا ترازو بن جائے اور جب ایک بھری ہوئی قوم کے قہر و غضب کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی زندگی کی ضمانت قرار پائے تو پھر دنیا کو کون محفوظ بنا سکتا ہے؟ ایسا صرف اس وقت ممکن ہے جب دنیا کی بڑی عسکری اور اقتصادی قوتیں، بڑے پن کو اپناتے ہوئے، ارفع اخلاقی ضابطوں اور لافانی انسانی اقدار کو سر بلند رکھنے کا عزم کریں اور ظلم و ناانصافی کا چلن عام کرنے والی چھوٹی فرعونی طاقتوں کو باور کرا دیں کہ ہم اس دنیا کے امن و سکون کے محافظ و نگہبان ہیں۔ اگر سب سے بڑی عالمی طاقت خود بے مہار ہو جائے اور ایسے مناظر تخلیق کرنے لگے جن سے پتھر کے زمانے کا انسان بھی شرماتا ہو تو پھر دنیا کو کون محفوظ بنائے گا؟ جنگل کی بادشاہت کا تاج پہننے والا درندہ محض تفریح و تسکین یا اپنی درندگی کی دھاک بٹھانے کے لئے ہر کمزور جانور کی ہتکابوئی کرنے لگے تو جنگل کو کون محفوظ بنائے گا؟ چڑیاں اور مولے تو ایسا کرنے سے رہے۔

امریکہ کو ایک بار پھر اپنے فلسفہ حکمرانی پر غور کرنا چاہئے۔ جو کچھ افغانستان میں ہوا، اس کے رد عمل میں محبتوں کے لالہ دگل نہیں کھل سکتے۔ جو کچھ گوانا نامو میں ہوا یا ہورہا ہے، اس سے احترام آدمیت کے تقاضے منو نہیں پاسکتے۔ صدر جارج بوش کا لہجہ کسی دل کے لئے باد بہاری کا جھونکا نہیں۔ یہ سوچ، یہ رویہ اور یہ طرز عمل دنیا کو آتش فشاں بنا رہے ہیں۔ نفر تیس انڈی چلی آرہی ہیں اور لطیف جذبات و احساسات کی نرم و نازک کوٹلیں آتشیں لاوے تلے رکھ ہو رہی ہیں۔

ڈینیئل پال کی بلاکت سے چند دن قبل میامی میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم دس سالہ

پاکستانی لڑکا عبداللہ بھی قتل ہو گیا۔ اس کے قتل کی کوئی سرخی لگی، نہ کوئی پریس کانفرنس ہوئی، نہ صدر
 بش نے ٹیلی فون پر تعزیت ضروری سمجھی، نہ عالمی ذرائع ابلاغ نے باہا کار چچائی اور نہ کوئی عمان اور
 یورپی یونین نے دہائی دی۔ ایک گیارہ سالہ امریکی لڑکے نے عبداللہ کو گولی مار دی اور کہا ”میں
 نے اسے اس لئے مار دیا کہ وہ پاکستانی تھا۔“

نفرتوں کی اس مسموم آندھی کو روکنا پڑے گا اور یہ تسلیم کر لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ امریکہ اس
 آندھی کو ہوا دے رہا ہے۔ کسی دوسرے ملک میں اتنی سخت نہیں کہ وہ امریکہ کا راستہ روکے۔ ہاں
 خود امریکی عوام ایسا کر سکتے ہیں لیکن رائے عامہ کے جائزے بتاتے ہیں کہ وہ بھی جارج بش کے
 طلسم رعوت کا شکار ہیں۔ جب تک اس کالے جادو کا توڑ نہیں کیا جاتا، دنیا محفوظ نہیں بنائی جاسکتی۔

[26-02-2002]

www.KitaboSunnat.com

دل بہلاوے

اپنے باغ میں کوئی ایک چیز بھی پھلوں سے لدا پھندا نہ ہو تو تیز ہوا کے جھونکے یوں ہی دل کو بھلے لگتے ہیں کہ ممکن ہے ان سے پڑوسیوں کے صحن چمن میں شربار درختوں کے پھل جھڑنے اور زمین پر ڈھیر ہونے لگیں۔ ہماری قومی زندگی اکتا دینے والی ناہمواریوں اور روح قبض کر لینے والے جمود کا شکار ہے۔ شخصی حکومتوں نے نصف صدی کے لمبے عرصے میں وہ زیبائی پیدا ہی نہ ہونے دی جو قوموں کو تقاضا کرتی اور اپنی کامرانیوں پر اجتماعی احساس طمانیت سے سرشار کرتی ہے۔ عمر بھر دور کے سمندروں کی لہریں گنتے، ڈوبتے ابھرتے جہازوں کا تماشا کرنے اور ساحلوں سے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی سپہیاں چننے والوں کی زندگی اسی ڈھب سے گزرتی ہے۔

امریکی انتخابات میں الگور اور بش کے درمیان معرکہ بپا ہوا تو ہماری آنکھیں ٹیلی ویژن کی سکرینوں سے پیوست ہو گئیں۔ ہمیں بتایا گیا کہ یہودی، الگور کی پشت پناہی کر رہے ہیں اور امریکہ میں مقیم پاکستانی جارج بش کے ساتھ ہیں۔ ہمارے تجزیہ نگاروں نے لکھا کہ الگور کی فتح، اسرائیل کی فتح ہوگی اور یاسر عرفات کا فلسطین زبردست آزمائش سے دوچار ہو جائے گا۔ ہمارے اخبار نویسوں نے خبر دی کہ جارج بش کی کامرانی، یہودیت کی عبرت تاک شکست اور عالم اسلام کی فتح سمجھی جائے گی۔ ہمارے ماہرین نے بتایا کہ الگور کی کامیابی کی صورت میں مسلمانوں کی مشکلات بڑھ جائیں گی اور جارج بش کی فتح روشن امکانات کے سنہری دریچے کھول دے گی۔ تیرہ کروڑ پاکستانی سولی پر لٹکے انتخابی نتائج اور پھر عدالتی معرکہ آرائی کے لمحے لمحے سے بندھے رہے۔ بش جیت گیا اور ہمارے بنجر دل، شادابی کی کرندوں سے ہٹکنے لگے۔ آج وہی بش عالم اسلام کو تاراج کر رہا ہے۔ قلعہ جنگلی سے گوانٹانامو تک اس کی ”مسلم دوستی“ کی داستانیں بکھری پڑی ہیں۔ افغانستان کھنڈر ہو چکا ہے اور عراق و ایران اس کے قدموں کی دھمک سے لرز

رہے ہیں۔ یہودیوں کا حمایت یافتہ الگورہار کرپس منظر میں جا چکا ہے لیکن معصوم فلسطینی اسرائیلی مظالم کی بھٹی کا ایندھن بن رہے ہیں اور امریکہ مسلسل شعلوں کو ہوا دے رہا ہے۔ اک عمر امریکہ کی دلداری کرنے اور اپنے عشاق کی قیمت پر اس کا کارندہ بننے والا یاسر عرفات ایک چار دیواری میں قید ہے اور جارج بوش چھت پر کھڑا تالیاں بجا رہا ہے۔ اب ہمارے لئے خوشیوں کی معطر پھوار سے لدی کچھ ہوائیں مشرق سے خبر لائی ہیں کہ بی جے پی چار ریاستی انتخابات میں بری طرح ہار گئی ہے۔

اتر پردیش، پنجاب، اتر اچھل اور منی پور میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ان چار میں سے تین ریاستوں پر بی جے پی اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر حکمرانی کر رہی تھی۔ اب یہ ریاستیں کانگریس یا دوسری جماعتوں کے زیر اقتدار آ جائیں گی۔ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ یہ انتخابی نتائج واجپائی کی پاکستان دشمن پالیسیوں پر ریفرنڈم کا درجہ رکھتے ہیں۔ بھارتی عوام نے دونوں انداز میں ان پالیسیوں کو مسترد کر دیا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف کسی طرح کی جارحانہ مہم جوئی کے خلاف ہیں۔ ہمارے مبصرین کا کہنا ہے کہ درحقیقت یہ پاکستانی موقف کی فتح ہے کیونکہ بھارتی عوام نے بی جے پی کو مسترد کر کے بے چلک رویے کی نفی کر دی ہے اور یہ اشارہ دیا ہے کہ ہمیں اپنے پڑوسیوں کے ساتھ تمام مسائل پر امن مذاکرات کے ذریعے حل کرنے چاہئیں۔

سیاسی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اب مرکز میں بھی واجپائی کی مخلوط حکومت کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور عین ممکن ہے کہ واجپائی اقتدار سے باہر ہو جائیں۔ یہ امکان بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اب سونیا گاندھی کی وزارت عظمیٰ زیادہ دور کی بات نہیں۔ طفلانہ پن کے یہ مظاہرے اب معمول بنتے جا رہے ہیں۔ یہ معمول ہر اس قوم کا مقدر ہوتا ہے جسے کھلونوں سے بہلنے کی عادت پڑ چکی ہو اور جو کچے کچے خوابوں سے اپنی پسند کی تعبیریں تلاش کرنے کا مشغلہ اپنا چکی ہو۔ کیا ہمیں اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ابھی بالغ ہونا ہے کہ بھارت کی تمام سیاسی جماعتوں کا خیر ایک ہی مٹی سے اٹھایا گیا ہے۔ جمہوری ملکوں کا خاصا ہی یہ ہے کہ وہاں کسی جماعت، کسی گروہ یا کسی فرد کی نہیں، جمہور کی حکمرانی ہوتی ہے اور حکمران، جمہور کے جذبات و احساسات سے کتر اگر حکومت میں نہیں رہ سکتے۔ ایسا صرف پاکستان میں ہی ممکن ہے کہ جنرل ضیاء الحق ہوں تو ”جہاد اصغر“ کا غلغلہ بلند ہوتا ہے اور جنرل مشرف آئیں تو ”جہاد اکبر“ کا طوطی بولنے لگتا ہے۔ بی جے پی کی شکست اور

کانگریس کی فتح کو نوید بہار بنا کر پیش کرنے والے تجزیہ نگار شاید اس حقیقت کو بھلا بیٹھے ہیں کہ کانگریس کی پوری تاریخ مسلم کش فسادات سے بھری پڑی ہے۔ اسی جماعت نے کشمیر کے مسئلے میں گرہیں ڈالیں اور ناجائز قبضے کو آئین کا لبادہ پہنایا۔

پاکستان کے خلاف کم و بیش ہر لشکر کشی کانگریس کے زمانے میں ہوئی۔ مشرقی پاکستان کا سانحہ کانگریسی حکومت کی مکمل اشریاد اور عسکری جارحیت کے سبب پیش آیا۔ اندرا گاندھی نے کس ادا سے کہا تھا کہ ”آج دو قومی نظریہ خلیج بنگال میں غرق ہو گیا ہے۔“ بغلیں بجانے کے بجائے ہمارے لئے سامان فکر یہ پہلو ہونا چاہئے کہ جمہوریت میں کس قدر حسن اور کتنی تحملت ہے۔ عوام نے کس طرح حکمران جماعت کو کم از کم تین ریاستوں میں زمین بوس کر دیا۔ پنجاب کے وزیر اعلیٰ پرکاش سنگھ بادل نے کس آپہانی سے استعفیٰ دے دیا۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ راج ناتھ سنگھ نے مستعفی ہوتے ہوئے کس بانگین سے کہا کہ ”یہ عوام کا فیصلہ ہے اور عوام کے ہر فیصلے کا احترام ہم پر واجب ہے۔“ بی جے پی کے صدر کرشنا مورتی نے کس وقار سے کہا کہ ”عوام نے ہمیں اپوزیشن کا کردار سونپا ہے اور ہم اپوزیشن بنچوں پر بیٹھیں گے۔“ سولہ ریاستوں میں اپوزیشن جماعتوں کی حکومتوں کے باوجود جمہوریت کی گاڑی کس سبک روی کے ساتھ چل رہی ہے۔ ایسے پہلوؤں سے چشم پوشی کر کے اپنی بیمار طبیعتوں کی آسودگی کے لئے بے معنی جواز تلاش کرتے ہمیں کئی سال ہو چکے ہیں۔ بھلا اس میں کیا رکھا ہے کہ بی جے پی فتح حاصل کرتی ہے یا کانگریس، سماج وادی پارٹی کے اقتدار کا سورج طلوع ہوتا ہے یا بھوجن سماج پارٹی کا۔ سب کی رگوں میں پاکستان دشمنی، لہو کی طرح رواں دواں ہے۔ کوئی بھی ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گی نہ کشمیر فٹنٹری میں سجا کر ہمارے حوالے کرے گی، نہ اپنے جارحانہ پن میں کوئی لچک پیدا کرے گی نہ ہمیں ٹکجنے سے رہائی دلائے گی۔ جمہور کے دوٹوں سے آبرو مند ہونے والی جماعتیں جمہور کی ترجمانی سے سرتابی نہیں کر سکتیں۔

پچھن سال کے بعد بھی تیلیوں سے کھیلنے کی عادت نہ گئی تو ہماری تاریخ ان خوبصورت منظروں سے بدستور محروم رہے گی جو صرف جمہور کی حکمرانی کے تصور سے نمود پاتے ہیں۔

[28-02-2002]

ایرانیوں کا اندازِ تفاخر

آیت اللہ خامنہ ای نے مجھے عجب مشکل میں ڈال دیا ہے۔

امریکی صدر کا کانگریس سے ”ٹیٹ آف یونین“ خطاب انتہائی اہم پالیسی ساز بیان خیال کیا جاتا ہے۔ اس تقریر کے نفوش سنوارتے اور لفظوں کی مینا کاری کرتے وقت امریکہ کے اہداف و مقاصد کا کلی احاطہ کیا جاتا ہے۔ جملوں کی ساخت اور الفاظ و معانی کے ایک ایک زاویے اور تاثر کے ایک ایک پہلو کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ انتہائی اعلیٰ سطحی اداروں کی سفارشات کے بعد صدر کے قریبی رفقاء طے کرتے ہیں کہ صدر نے کس وقت چہرے پر کس طرح کا منظر سجایا ہے۔ کس شخص یا ملک کا نام لیتے وقت آنکھوں میں شعلہ نشانی کی کیفیت پیدا کرنی اور ماتھے پر سلوٹوں کا جال بنانا ہے۔ یہ بھی دنوں کے غور و فکر اور بحث مباحثے کے بعد طے پاتا ہے کہ کس شخصیت کے لئے تحسین و آفرین کا کون سا صیغہ استعمال کرنا، اس کا ذکر کرتے وقت لہجے میں کس انداز کی شیرینیاں بھرنی اور ہونٹوں پر کس قیامت کی مسکراہٹ آراستہ کرنی ہے۔

جارج بش نے اپنے ٹیٹ آف یونین خطاب میں صرف دو عالمی شخصیات کا نام لیا۔ ایک افغان فرمانروا عزت مآب حامد کرزئی کا اور دوسرا صدر جنرل پرویز مشرف کا۔

حامد کرزئی کا بس ذکر خیر ہی تھا، جو بہر حال بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن صدر مشرف کے لئے انہوں نے تحسین و آفرین کا جو اسلوب اختیار کیا وہ آج تک کسی پاکستانی راہنما کے حصے میں نہیں آیا۔ عالمی سطح پر بھی غالباً زندہ شخصیات میں سے اس طرح کے کلمات تو صیغے صرف یا سر عرفات کا سرمایہ حیات ہوں گے جو ان دنوں امریکہ اور اسرائیل کے محسوب و محصور ہیں۔ طالبان کو تلف کرنے کے لئے عالمی کولیشن کا سرگرم حصہ بننے پر امریکی راہنما اکثر پاکستان اور صدر مشرف کی خدمات کو سراہتے رہتے ہیں۔ کولن پاول تو یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ ”صدر مشرف نے ہماری توقع سے بھی زیادہ تعاون کیا ہے۔“ ایسے ہی دلاویز و دلنشین کلمات جناب رمز فیلڈ بھی ادا کر چکے

ہیں لیکن صدر بش نے تو کچھ اس انداز سے تان اٹھائی ہے کہ سماعتوں اور بصارتوں میں ایک شعلہ سا لپک گیا ہے۔ جب انہوں نے صدر مشرف کے مدبر اور قائدانہ صلاحیتوں کو خراج پیش کیا تو کانگریس کے ارکان بہت دیر تک کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے رہے۔

میری طرح جس بھی پاکستانی نے یہ منظر دیکھا ہوگا، اس نے اپنے دل میں وہی سردی کیف محسوس کیا ہوگا جس نے مجھے پہروں سرشار رکھا۔ افغانستان میں تو ٹیلی ویژن عام نہیں۔ ان لوگوں کے اور بھی مسئلے ہیں اس لئے وہ جارج بش کے مبارک ہونٹوں سے حامد کرزی کا نام سننے کا تاریخ ساز لمحہ گنوا بیٹھے لیکن مجھے یقین ہے کہ اہل پاکستان اس حیات آفریں لمحے کو حسین یادوں کے سنہری فریم میں سجا کر حافظے کے نگار خانے میں اس طرح آویزاں کریں گے کہ آنے والی تاریخ کا ہر لمحہ اسے جھک کر سلام کرے گا اور مستقبل کا ہر سورج اس سے اذن طلوع لے کر لب بام آئے گا۔ جب سابق صدر کلنٹن جنوبی ایشیا کے دورے پر تشریف لائے تو پاکستان سے اس لئے گریزاں رہے کہ وہاں ایک فوجی جرنیل کی حکومت ہے۔ امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی زبردست لالچ کے بعد جب موصوف چند لچھوں کے لئے اسلام آباد آئے تو امریکیوں کا پریس ڈیپارٹمنٹ بولایا پھر تا تھا۔ اسے بس ایک ہی فکر تھی کہ صدر کلنٹن کو جنرل مشرف سے ہاتھ ملاتے نہ دکھایا جائے۔ ان کی یہ کوششیں کامیاب رہیں اور ایسی کوئی تصویر بن سکی نہ منظر عام پر آسکی۔ بدھ کے دن جب بھری کانگریس کے سامنے جارج بش نے صدر مشرف کو خراج عقیدت پیش کیا تو مجھے یوں لگا جیسے ہم نے کلنٹن اور اس کے امریکہ سے انتقام لے لیا ہے۔ میں اس طرح نہال اور مالامال ہو گیا کہ ایک ایک سانس و فور مسرت سے دیکھنے لگی۔ بعد میں جتنی مرتبہ بھی پی ٹی وی نے یہ منظر دکھایا، یہ آتش فروزاں تیز تر ہوتی گئی۔

سرشاری ابھی تک طاری ہے لیکن ایرانیوں نے عجب مخمضے میں ڈال دیا ہے۔ صدر بش نے اپنے خطاب میں کہا تھا کہ ایران، عراق اور شمالی کوریا بازا آجائیں ورنہ انہیں سبق سکھایا جائے گا۔ اس پر عراق اور شمالی کوریا نے شدید احتجاج کیا۔ چین نے بھی اس لب و لہجہ کو غیر شریفانہ قرار دیا۔ ایران کے صدر خاتمی نے کہا کہ ”بش نے ایرانی قوم کی توہین کی ہے“ سپریم لیڈر آیت اللہ خامنہ ای نے کہا کہ ”امریکہ شیطان کبیر اور بش انسانی خون کا پیاسا ہے۔ ہم اس کی دھمکیوں میں نہیں آئیں گے اور فلسطینیوں کی حمایت جاری رکھیں گے۔“ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن آیت اللہ خامنہ

ای نے ایک عجیب بے معنی سی بات کہہ ڈالی۔ فرمایا کہ ”دنیا کی انتہائی قابل نفرت شیطانی قوت کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا ایران کے لئے باعث فخر ہے۔“

تفاخر کے اس ایرانی تصور نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ جارج بش نے تو ایران کو دہشت گردوں کا سرپرست، مہلک ہتھیار بنانے والا اور برائی کی جڑ قرار دیا۔ یہ بہر طور ایک سفارتی گالی ہے۔ گالی پر کس طرح فخر کیا جاسکتا ہے؟ ایرانیوں کو شاید معلوم نہیں کہ امریکہ کس بلا کا نام ہے اور جب وہ کسی کو گالی دیتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ وہ آن واحد میں ہنستے بستے ملکوں کو پتھر کے زمانے میں دھکیل دیتا ہے اور جب چاہے آسودہ حال بستیوں کے دسترخوان ویران کر دیتا ہے۔ اس کے باوجود ایرانی پیشوا نے جو غیر منطقی موقف اختیار کیا ہے، اسے کیا نام دیا جائے؟ یہ کہاں کی دانائی ہے کہ امریکی گالیوں کو اپنے لئے فخر و اعزاز کا باعث سمجھا جائے۔

میں عجیب کشمکش میں ہوں۔ اگر جارج بش کی گالیاں ایرانیوں کے لئے باعث افتخار ہیں تو میں صدر پاکستان کو پیش کیا جانے والا خراج تحسین کس کھاتے میں ڈالوں؟ اور اگر یہ خراج تحسین میرے لئے مسرت و شادمانی اور اعزاز و سعادت کا باعث ہے تو ایران کو دی جانے والی گالیاں کیسے باعث فخر ہو سکتی ہیں؟

مدتوں بعد طے والی سرشاری سے دستبرداری کو جی نہیں مانتا لیکن یہ خامنہ ای نے مجھے کس ابھمن میں ڈال دیا ہے۔

خود فریبی ہی سہی

خبر ہے کہ امریکی صحافی ڈینئل پرل کے اغواء اور قتل کے بڑے ملزم عمر سعید شیخ کو امریکہ کے حوالے کرنے کے لئے قانونی ضابطے اور تقاضے مکمل کرنے پر اتفاق رائے ہو گیا ہے۔ اسلام آباد میں امریکی سفیر وینڈی جیمبرلین نے صدر پرویز مشرف سے تفصیلی ملاقات کی ہے۔ اس ملاقات میں باضابطہ طور پر امریکی مطالبہ پیش کیا گیا کہ شیخ عمر کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لئے امریکہ کے حوالے کر دیا جائے کیونکہ بے لاگ اور حقیقی انصاف صرف امریکہ کی ”بارگاہ عدل“ میں ہی دستیاب ہے۔ ڈینئل کی بیوہ نے بھی صدر سے ملاقات کے دوران یقیناً ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا ہوگا۔ صدر جارج بوش نے بھی خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ کسی بھی امریکی گورنر نہ پہنچانے والے شخص کو امریکہ کی سر زمین پر قانونی شکنجے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وائٹ ہاؤس کے ترجمان ایری فلیشر نے دو دن قبل یہ انکشاف کیا تھا کہ 1931ء میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان ملزمان ایک دوسرے کے حوالے کرنے کا معاہدہ طے پایا تھا۔ گزشتہ روز صحافیوں نے اس ”معاہدے“ کی تفصیلات کریدنے کی کوشش کی لیکن ایری فلیشر نے ”ٹھوس دلائل“ دے کر انہیں مطمئن کر دیا۔

اس مکالمے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ امریکہ 1931ء میں ہونے والے معاہدے کے بارے میں کتنا قوی استدلال رکھتا ہے:-

صحافی: یہ معاہدہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ پاکستان تو 1931ء میں قائم ہی نہیں ہوا تھا۔
 فلیشر: یہ دلچسپ سوال ہے لیکن دکلاء کا نقطہ نظر ہے کہ یہ معاہدہ اس کے باوجود قائم
 اور موجود ہے۔

صحافی: معاہدہ تو انگریزوں کے ساتھ ہوا تھا؟

فلیشر: معاہدہ پاکستان کے ساتھ ہوا تھا جو اس وقت انگریزوں کی ماتحتی میں تھا۔

صحافی: لیکن اس وقت تو پاکستان نام کا کوئی ملک تھا ہی نہیں؟
 فلیشر: یہ معاہدہ پاکستانی اتھارٹیز کے ساتھ ہوا تھا جو اس وقت انگریزی اقتدار کے ماتحت تھیں۔
 صحافی: کیا پاکستان آپ کی اس تشریح سے مطمئن ہے؟
 فلیشر: یہ آپ پاکستان ہی سے پوچھیں۔

یہ مکالمہ نیوورلڈ آرڈر کے ”امریکی صحیفے“ کا دیباچہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسے اکیسویں صدی کے بین الاقوامی آئین و قانون کا سرنامہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ قوت کے نشے میں مست امریکہ تکبر کے کس بام عروج پر بیٹھا ہے اور اس کی نظروں میں پاکستان کی کیا اہمیت ہے۔ اس سے یہ قیاس بھی کیا جاسکتا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف عالمی کولیشن کا ہر اول دستہ بننے کے بعد پاکستان کا قد و قامت کتنا بلند ہوا ہے اور اس کی آزادی و خود مختاری کی کلفتی میں سرخاب کے کتنے نئے پر سجے ہیں۔ ہم نے جن معاملات کو کھیل تماشا سمجھ رکھا ہے جن باتوں کو سرسری جان کر نظر انداز کر رہے ہیں اور جس پسپائی کو حکمت عملی کا نام دے کر قبول کر رہے ہیں وہ درحقیقت ہمارے قومی وجود اور ریاستی وقار کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں۔

11 ستمبر کو ہمیں ایک مخصوص راستہ پر چلنے پر مجبور کیا گیا تو خود امریکہ کو معلوم تھا کہ پاکستان کیلئے یہ رہگذر انتہائی کٹھن اور دشوار گزار ہے۔ پاکستانی عوام اپنی روح پر ایسی کاری نشتر زنی برداشت نہیں کریں گے اور پاکستانی قیادت اس قدر بھاری بوجھ اٹھا کر دو چار قدم بھی نہیں چل سکے گی۔ جمہوری حکومت ہوتی تو اس طرح کا ایک قدم اٹھاتے ہوئے سوسوچ و تاب کھاتی۔ سوسو پہلو بدلتی۔ سوسو بہانے اور جواز پیش کرتی۔ اگر وہ اس سنگلاخ راستے پر چل بھی پڑتی تو جلسوں، جلوسوں، مظاہروں، دھرنوں، ہڑتالوں، بیانوں، اداروں اور طعنوں سے اس کا ناٹھک بند کر دیا جاتا۔ ایک ایک سیاسی لیڈر شعلہ جوالہ، ایک ایک عالم دین آتش فشاں، ایک ایک اخبار صور اسرافیل اور ایک ایک جہادی تنظیم برق آسانی بن جاتی۔ حکومت دو قدم اٹھاتے ہی ہانپنے لگتی اور تیسرا قدم زمین پر رکھنے سے پہلے ہی زمین بوس ہو جاتی۔ جو کچھ ہوا اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ امریکہ کو جب بھی اس خطے میں اپنے مفادات کی جنگ لڑنا پڑی یہ اہتمام پہلے کر لیا گیا کہ اسے کسی جمہوری حکومت کے بجائے کسی ہمہ مقتدر فرد واحد سے معاملہ کرنا پڑے۔ امریکہ جانتا ہے کہ محبتوں کے ایسے سفر میں کسی نامہ بر کے بجائے براہ راست محبوب کے دل پر دستک دینا

زیادہ کارگر ہوتا ہے۔۔

راہ دنیا سے نہیں، دل کی گزرگاہ سے آ

فاصلہ یوں تو زیادہ ہے پہ یوں کچھ کم ہے

کم اور مختصر راستہ اختیار کرنے والے امریکہ نے دیکھا کہ انتہائی کٹھن اور دشوار گزار راستے پر ہم اپنے سروں پر منوں بوجھ اٹھائے بگٹت دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ نہ ہماری سانس پھول رہی ہے، نہ قدم ڈگمگا رہے ہیں، نہ پسینہ آ رہا ہے۔ سو وہ بوجھ بڑھاتا چلا گیا۔ قدم تیز تر کرنے کے فرمان جاری کرتا چلا گیا۔ اور اب عالم یہ ہے کہ کوئی بھی ناروا مطالبہ کرتے وقت اس کے چہرے پر ندامت کا رنگ نہیں جھلکتا اور کوئی بھی قیمتی متاع پیش کرتے وقت ہماری آنکھوں میں حیا کے ڈورے نہیں لہراتے۔

عمر سعید شیخ کی حواگی کے لئے 1931ء میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان طے پانے والے ”معاہدے“ کی دلیل صرف معطلہ خیز ہی نہیں توہین آمیز بھی ہے۔ ایری فلیشر کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ کون سے معاہدے کی رو سے ہو رہا ہے؟ جب ہم اپنی اتا اور خودی سمیت اپنا سب کچھ پہلے ہی ان کے حوالے کر چکے ہیں تو عمر سعید شیخ کے لئے ایسی دلیل لانے کی کیا ضرورت تھی؟ امریکی مسلح افواج کے سربراہ ”جنرل رچرڈ ماڈز“ نے کل ہی انکشاف کیا ہے کہ پاکستان گزشتہ دو دنوں میں چودہ افراد ہمارے حوالے کر چکا ہے اور ابھی کئی مزید افراد آنے والے ہیں۔ ادھر ہمارے وزیر داخلہ جناب معین حیدر نے انڈونیشیا کے شہر پالی میں اعلان کیا ہے کہ جب امریکہ عمر سعید کے خلاف ہمارے بے لاگ انصاف کا جلوہ دیکھے گا تو اسے کوئی مطالبہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اگر 1931ء کا معاہدہ واقعی معتبر ہے تو حکومت پاکستان کو میامی میں قتل ہونے والے دس سالہ معصوم پاکستانی بچے عبداللہ کے قاتل کو بھی مانگ لینا چاہئے تاکہ اس کے دکھی والدین کو اندازہ ہو کہ ان کی جیبوں میں رکھے سبز پاسپورٹ میں ابھی زندگی کی ایک آدھ رتس باقی ہے۔ ڈیٹیل کے قاتلوں کا معاملہ تو ابھی پایہ ثبوت تک پہنچنا باقی ہے۔ عبداللہ کا قاتل تو خود اعلان کرتا پھرتا ہے کہ اس نے ایک پاکستانی کو قتل کیا ہے۔ ممکن ہے امریکہ قرون اولیٰ کے کسی معاہدے کی آڑ لے کر ہمارا مطالبہ رد کر دے لیکن اپنے قتل ہوتے ہوئے قومی وجود اور سرگم ہوتی عزت نفس کی تسکین کے لئے خود فریبی ہی سہی۔

ڈی این اے

امریکی حکام بڑی سرگرمی کے ساتھ اسامہ بن لادن کے خونی رشتہ داروں سے ڈی این اے (D.N.A) کے نمونے حاصل کر رہے ہیں۔ ایک ہی ماں یا ایک ہی باپ کی اولاد کے خون میں موجود اس حیاتیاتی مادے کی مدد سے یہ تعین کیا جاسکتا ہے کہ کون سا شخص کس خاندان کی خونی زنجیر میں بندھا ہے۔ امریکہ نے افغانستان پر بمباری سے جاں بحق ہونے والے افراد کے بچے کچے اجزاء سے بھی ڈی این اے کے نمونے حاصل کر رکھے ہیں۔ اسامہ کے چچا سے لگ بھگ قریبی خونی عزیزوں کے ڈی این اے کو یہ جاننے کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے کہ کیا کوئی نمونہ افغانستان کے ہلاک شدگان میں سے کسی کے ڈی این اے سے ملتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا اسامہ سے پاک ہو چکی ہے۔

امریکہ وقت کا بادشاہ ہے۔ اسے کون سمجھائے کہ ڈی این اے، خون کے جس رشتے یا حیاتیاتی مادے کے جس تعلق کا تعین کرتا ہے وہ اسامہ بن لادن پر لاگو ہی نہیں ہوتا۔ چودہ سو سال پہلے محمد عربی ﷺ نے یہ نامیاتی حوالہ سرے سے معدوم کر دیا تھا اور ایک ایسے قبیلے کو جنم دیا تھا جس میں خون، رنگ، نسل، زبان اور جغرافیے کے تمام امتیازات بے معنی ہو گئے تھے۔ اس عظیم المرتبت انسان کامل ﷺ نے ایک نئی حیاتیاتی انجینئرنگ کی بنیاد رکھی تھی اور انسانوں کے باہمی رشتہ و تعلق کا تعین کرنے کے لئے توحید الہی کی اساس پر ایک منفرد ڈی این اے متعارف کرایا تھا۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

اسود از توحید احمری شود
 خویش فاروق و ابو ذری شود
 برنس نازاں شدن نادانی است
 حکم او اندر تن و من فانی است

ملت مارا اساس دیگر است
 این اساس اندر دل ماضر است
 ما زلفت ہائے او اخواں شدیم
 یک زبان و یک دل و یک جان شدیم

(توحید الہی کی برکت سے رنگوں کی تیزرائی جاتی ہے۔ سیاہ رنگ کا آدمی سرخ رنگ کے آدمی کے ہمسر ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جیسی عظیم ہستیوں سے اس کی خوشبختی اور قربت داری قائم ہو جاتی ہے۔ خون کے تعلق اور نام و نسب پر فخر کرنا سراسر حماقت ہے۔ نسب کی کارفرمائی صرف بدن تک محدود ہے اور بدن مرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ ہماری قوم کی تو بنیاد ہی کچھ اور ہے۔ یہ بنیاد ہمارے دلوں کے اندر پیوست ہے۔ ہم پر اللہ تعالیٰ کی نعمت، رحمت بن کر نازل ہوئی اور ہم بھائی بھائی بن گئے۔ ہماری زبانیں، ہمارے دل اور ہماری جانیں ایک ہو گئیں۔)

آج ہم یقیناً اپنا بائپن کھو چکے ہیں لیکن اس عہد زیاں کار میں بھی گئے دنوں کی آج زندہ ہے۔ کیا امریکہ نے نہیں دیکھا کہ افغانستان میں اس کا ساہنا کن لوگوں سے ہوا؟ سوڈان، ایران، سعودی عرب، بنگلہ دیش، پاکستان، انڈونیشیا، مصر، الجزائر، برطانیہ، امریکہ، فرانس اور چین کے جو آتش بجاں، اسامہ اور طالبان کے پہلو میں کھڑا ہونے کے لئے پہنچے، ان سب کا ڈی این اے ایک ہی تھا۔ دنیا بھر میں ملا عمر کے لئے دھڑکنے والے دلوں کی ایک ایک شریان میں ایک ہی لہو بول رہا ہے۔ شرق و غرب میں دعاؤں کے لئے اٹھنے والے ہاتھوں کی ایک ایک رگ میں ایک ہی خون گردش کر رہا ہے۔ اسامہ کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھنے والے لاکھوں والدین کا حیاتیاتی خمیر ایک ہی ہے۔ پاراچنار میں مدفون اور قندھار کے قبرستان نو میں آسودہ خاک عربوں کی قبروں پر پھول چڑھانے اور پرچم لہرانے والوں کا شجرہ نسب ایک ہی ہے۔ قلعہ جنگلی کے لیے پرتز پنے اور گوانا نامو کے قیدیوں کی یاد میں بے کل رہنے والے ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ افغانستان کی راکھ پر گریہ، فلسطین کے نو عمر شہیدوں کا ماتم اور مظلوم کشمیریوں کی بے چارگی پر نوہ کرنے والے ایک ہی قبیلے کے لوگ ہیں۔

امریکہ یہ بھی نہیں جانتا کہ ایک ہی باپ کی اولاد ہوتے ہوئے ابولہب کا ڈی این اے

عباس، حمزہ اور ابوطالب سے الگ کیسے ہو گیا؟ وہ یہ بھی نہیں جان سکتا کہ حبشہ کے بلال، روم کے صہیب، فارس کے سلمان اور یمن کے عمار کا ڈی این اے ایک کیسے ہو گیا؟ مادیت کی مار کھائے ہوئے دماغوں پر یہ بھید کھل ہی نہیں سکتا کہ توحید و رسالت پر ایمان کس محکم رشتے کو جنم دیتا ہے اور یہ سخت جاں رشتہ زمانے کے ہر عتاب اور وقت کے ہر عذاب کے بعد زیادہ تو اتنا زیادہ مستحکم کیوں ہو جاتا ہے؟ اسامہ بن لادن کا ڈی این اے اس لئے معلوم کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی تو راہور کے غاروں سے کوئی جھلسی ہوئی لاش ملے، جب کبھی کسی پہاڑ کی کھوہ سے کوئی ادھ کھایا ڈھانچہ برآمد ہو، جب کوئی شارک مچھلی کسی ساحل پر آ کر کوئی انسانی عضو گل ڈالے، تو امریکی ماہرین اس کا کیمیائی تجزیہ کر کے جان پائیں کہ یہ اسامہ بن لادن ہے۔ ان کے خیال میں اسامہ بن لادن کے خاتمے کے ساتھ ہی سامراجی جبر و ستم کے خلاف مسلمانوں کا جذبہ مزاحمت دم توڑ جائے گا اور امریکی قہر و غضب کے سامنے غرور و عشق کے بانگین کا اظہار کرنے کی مومنانہ روایت ختم ہو جائے گی۔

ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا تاریخ میں کبھی ہوا بھی نہیں۔ جب خیمے جل چکے تھے اور کربلا کی ریت خانوادہ رسول ﷺ کے لبو سے رنگین ہو چکی تھی اور حسین رضی اللہ عنہ کا سر نیزے پر ٹنکا تھا اور یزید کو کسی ڈی این اے کے بغیر ہی یقین ہو گیا تھا کہ ”قافلہ حجاز“ میں اب کوئی ”سرکش“ باقی نہیں رہا تو بھی ایسا نہیں ہوا۔ تو بھی اہل جنوں کے کارواں چلتے رہے۔ آبلہ پا، عشق کی وادی ہزار میں آتے اور کانٹوں کی پیاس بجھاتے رہے۔ امریکہ کس ڈی این کا تعاقب کر رہا ہے؟ اس کی مسلم کش سوچ، اس کے سفاک رویے اور اس کا غیر انسانی طرز عمل، پچھلے پانچ ماہ میں اتنے اسامے پیدا کر چکا ہے کہ آنے والی کئی صدیاں خود کفیل ہو گئی ہیں۔

[02-03-2002]

تہہ خانہ کی حکومت

امریکی اخبار "واشنگٹن پوسٹ" نے خبر دی ہے کہ القاعدہ کی طرف سے ایٹم بموں کے مہلک حملوں کی صورت میں وفاقی حکومت کے نظام کو جاری رکھنے کے لئے ایک متبادل حکومت (Shadow Government) تشکیل دی گئی ہے جو نائب صدر ڈک چینی کی قیادت میں واشنگٹن سے دور کسی گمنام مقام پر زمین دوز مورچوں کے اندر کام کر رہی ہے۔ سو کے لگ بھگ سینئر سرکاری اہلکار اس حکومت سے منسلک کئے گئے ہیں جو اپنے خاندانوں سے کوسوں دور تہہ خانوں میں حکومتی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ تین ماہ بعد ان کی ڈیونیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ امریکی ایجنسیوں کا خیال ہے کہ القاعدہ کا "ایٹم بم" واشنگٹن کو مکمل طور پر ختم کر سکتا ہے، لہذا وفاقی نظام کے تسلسل کو یقینی بنانے کے لئے اس زیر زمین حکومت کا اہتمام ضروری سمجھا گیا ہے۔

یہ صورتحال، زبردست خوف اور شدید اعصابی تناؤ میں مبتلا قوم کے ذہن و فکر کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس خوف کی بنیاد بظاہر وہ ایٹمی جنس رپورٹیں ہیں جو مسلسل یہ باور کراتی رہتی ہیں کہ القاعدہ اور طالبان کا پھین پوری طرح نہیں کچلا جاسکا۔ ایٹمی جنس رپورٹوں کے پس منظر میں ٹھوس معلومات سے کہیں زیادہ یہ سوچ کارفرما ہے کہ انسان کی جبلت انتقام بہر طور زندہ رہتی ہے لہذا جب بھی موقع ملا، وہ عناصر ضرور اپنے رد عمل کا اظہار کریں گے۔ اپنے آپ کو کسی انہونی کی ذمہ داری سے بچانے کے لئے ایسی رپورٹیں بڑے اہتمام سے تیار کی جاتی ہیں تاکہ کسی ناگہانی افتاد کی صورت میں کہا جاسکے کہ ہم نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ بلاشبہ آج امریکی اقتدار کا سورج نصف النہار پر ہے اور ساری دنیا کے درود یوار اس کی تیز دھوپ کی زد میں ہیں۔ بالخصوص چھوٹے، کمزور اور ترقی پذیر ملکوں کے گھروندے اس دھوپ کی تپش سے تپھلنے لگے ہیں۔ امریکہ اسے اپنی عسکری اور اقتصادی قوت کی کارفرمائی خیال کرتا ہے۔ یہ بات بڑی حد تک درست بھی ہے کیونکہ یہ محابا فوجی طاقت کے حامل کسی ملک کے سامنے صرف اس کا اپنا احساس ذمہ داری اور تہذیبی و اخلاقی

رویہ ہی بند باندھ سکتا ہے۔ ان زنجیروں کو توڑ ڈالنے کے بعد وہ ایک عفریت کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے سامنے کوئی ضابطہ، کوئی قانون، کوئی دلیل اور کوئی اپیل موثر نہیں رہتی۔ اس سے بچاؤ کی واحد صورت یہی ہوتی ہے کہ اس کی مرضی و منشا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے یا پھر اس کی قاہری کے حضور سر جھکانے سے انکار کر کے بدترین نتائج کو قبول کر لیا جائے۔

اسی طرح معیشت کا ہتھیار بھی نہایت کارگر ہے۔ قدیم زمانے کے ساہوکاروں سے آج کے ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور پیرس کلب جیسے اداروں تک ایک ہی خوں آشام رуж کارفرما چلی آ رہی ہے۔ بیشتر عالمی مالیاتی اداروں کی ڈور امریکہ کے ہاتھ میں ہے اور وہ انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ غریب ممالک اپنے نان نفقہ کے لئے کڑی شرائط ماننے اور وباؤ کے زیر اثر اپنی قومی پالیسیوں کی تراش خراش پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پاکستان اس کی روشن مثال ہے جس نے امریکی قہر و غضب کے خوف سے افغانستان اور کشمیر پالیسی میں نمایاں تبدیلیاں کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی معاشی پالیسیوں کو بھی آئی ایم ایف کی جھولی میں ڈال دیا۔ گیس کی قیمتوں کو تین سال کے عرصے میں ایک سو تیس فیصد تک بڑھانا، ایسا خوشدلانہ اقدام نہیں جو حکومت نے اپنی آزادانہ مرضی سے کیا ہو۔

دہشت زدہ دنیا اور وباؤ میں آئے ہوئے ممالک فوری طور پر امریکہ کی کلانی تو نہیں مروڑ سکتے لیکن ان کے عوام کے دلوں میں نفرت اور انتقام کی چنگاریاں سلگتی رہتی ہیں۔ سی این این کے حالیہ سروے نے پاکستانی ارباب اختیار کی ایک بڑی بھول کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ رائے عامہ کے اس جائزے کے مطابق افغانستان میں امریکی اقدام اور پاکستان کی طرف سے اس اقدام کی حمایت کو درست سمجھنے والے پاکستانیوں کی تعداد صرف 5 فیصد ہے۔ گویا 95 فیصد عوام سینوں میں الاؤ لئے بیٹھے ہیں۔ اسی جائزے کے مطابق نو اسلامی ممالک کے 77 فیصد عوام نے افغانستان میں امریکی کارروائی کو اخلاقی طور پر غلط اور غیر منصفانہ قرار دیا ہے۔

امریکہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے طرز عمل کی زہرناکی اور اپنے رویے کی نشتر زنی سے خوفزدہ ہے۔ وہ دنیا بھر میں جو فصل بورہا ہے اس کے جوان ہونے اور پھل لانے کے تصور سے ہراساں ہے۔ وہ افغانستان میں کھیلے جانے والے کھیل کے منظروں کو بھول نہیں سکتا۔ گوانا نامو کے قیدیوں سے روار کھے جانے والے طرز عمل کا خیال اس کے اعصاب پر سوار رہتا ہے۔ اتے

معلوم ہے کہ ظلم کی حکمرانی زیادہ طویل نہیں ہوتی اور مظلوم جب زندگی اور موت کے خرنشے سے آزاد ہو کر جوابی وار کرتا ہے تو ظلم کی قوتوں کی روح تک لرز جاتی ہے۔ قوت کے نشے میں سرشار شخص یا قوم کی سب سے بڑی کمزوری، زندگی سے پیار ہے۔ مظلوم شخص کی سب سے بڑی قوت موت سے بے خوفی ہے۔ جب مظلوم کی قوت برداشت آخری حدوں کو چھو نے لگتی ہے تو وہ پلٹ کر ایسا وار کرتا ہے کہ منکبہ اور مغرور گردنوں کے مہرے سرمہ ہو جاتے ہیں۔

امریکہ اسی خوف میں مبتلا ہے کہ ظلم کی انتہا تو ہو چکی۔ اس سے زیادہ بربریت اور زندگی کا مظاہرہ ممکن ہی نہیں۔ شرف انسانی کی اس سے زیادہ تحقیر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ 21 ویں صدی میں انسانیت کی ایسی تذلیل کسی ذی روح کے لئے ممکن ہی نہیں۔ بٹس اور اس کے حواریوں کا لب و لہجہ کائنات پر خدائی کے دعوے کا عکاس ہے۔ کمزور ملکوں کی آزادی و خود مختاری، بالآخر خانوں کے آداب سے بھی حقیر تر سمجھی جا رہی ہے اور امریکہ کو خبر ہے کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد، کچھ نہ کچھ سہنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

واشنگٹن سے کوسوں دور، گمنام علاقوں کی سرنگوں اور تہہ خانوں میں پناہ گزین متبادل امریکی حکومت، اس امر کا ثبوت ہے کہ جرم کی خلش نے امریکہ کو خوف کی صلیب پر لٹکا رکھا ہے۔ جارج بٹس کے لئے تالیاں بجانے والی امریکی قوم بھی اس آسپیی دہشت کی گرفت میں ہے۔ ایک عالم کی نیندیں حرام کرنے والی فتنہ خیز قوم اپنے اندر کے خوف سے ٹوٹی جا رہی ہے۔

عارف گروں کے لئے یہ چھوٹی سی سزا، اس آفاقی انصاف کی ادنیٰ سی جھلک ہے جو کسی وقت، کسی آن تہی ہوئی گردنوں کے منکے توڑ کر انہیں نمونہ عبرت بنا سکتا ہے۔

[03-03-2002]

شاہی کوٹ کے پہاڑ

امریکہ نے اپنی جدید ترین عسکری مشینری اور ٹیکنالوجی، جس بے دردی کے ساتھ بے دست و پا افغانوں کے خلاف استعمال کی، اس کی نظیر تلاش کرنا مشکل ہے۔ ایسی وحشت ناک قوت کسی بھی ملک اور کسی بھی قوم کے سارے کس بل نکال سکتی ہے۔ ایک بے بال و پر سے شخص کو شاہین کی قبائلی قبائلی افغانستان کی شاخ اقتدار پر بٹھا دینے اور سنگت کرنے والے چند صد اکاروں کی کاہنہ بنا کر امریکہ نے یہ سوچا کہ افغانستان فتح ہو چکا۔ طالبان کی رگ جاں کٹ چکی۔ القاعدہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ اب کوچہ بازار میں ایک نئی زندگی اگڑائی لے رہی ہے۔ سینما ہال کھل گئے ہیں۔ موسیقی لوٹ آئی ہے۔ چہرے بے حجاب ہونے لگے ہیں۔ اسامہ قصہ پارینہ بن چکا ہے اور ملا عمر سنگاخ پہاڑوں کی کسی گہری کھائی کا لقمہ بن چکا ہے۔ تجزیہ نگاروں نے خیال ظاہر کیا کہ اب افغانستان کے طول و عرض میں ہلکی سی مزاحمت کا امکان بھی باقی نہیں رہا۔ گوریلا جنگ تو حد و ہم و گماں سے بھی پرے جا چکی ہے۔

لیکن کیا افغانستان کی روح بے تاب ابھی زندہ ہے؟ کیا اب بھی عشق کے قافلہ سخت جاں کے سر بکف مسافر موجود ہیں؟ یہ گہری نیند سونے شاہی کوٹ کی برف پوش چوٹیاں ایک ایسی کیسے جاگ اٹھی ہیں؟ یہ کون لوگ ہیں جو ہڈیوں کے اندر گودا تک جمادینے والی سردی میں پوری استقامت اور جوانمردی کے ساتھ مور چرن ہیں؟ امریکہ اپنی زر خرید سپاہ کے ساتھ اچانک کیوں سرگرم ہو گیا ہے؟ جارج بوش، کولن پاول اور مرفیلڈ کی مسکراہٹیں تو ہونٹوں کے ساحلوں سے باہر چھلکی جا رہی تھیں کہ قصہ تمام ہو گیا تو پھر یہ کیسی خبریں آرہی ہیں کہ پچھلے چار دنوں سے مشرقی اور جنوبی افغانستان میں نئے خونیں معرکوں کا آغاز ہو چکا ہے؟

امریکہ نے اپنے اسلحہ خانے کا کون سا ہتھیار اور اپنی سپاہ گری کا کون سا ہتھیار نہیں آزمایا۔ ڈیزی کٹر بموں کی بارش کی گئی۔ نام ہاک کروزمیزائلوں کی بوجھاڑ کی گئی جن میں سے ہر ایک کی

قیمت تقریباً چودہ لاکھ ڈالر ہے۔ بی۔ 52 اور ایف۔ 16 طیاروں کے علاوہ بیسوں قسم کے ہیلی کاپٹر اور بغیر پائلٹ کے اڑنے والے جاسوسی طیارے استعمال ہوئے۔ شمالی اتحاد کو جدید ترین اسلحہ سے آراستہ کیا گیا۔ اور اب اسلحہ خانے کا ایک نیا ہتھیار ”تھر مو بیرک بم“ متعارف ہوا ہے جو سرنگوں، غاروں اور زیر زمین مورچوں کی ساری آکسیجن چوس لیتا اور میلوں میں پھیلی ذی روح مخلوق کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔ شاہی کوٹ کے پہاڑی علاقے میں استعمال کئے جانے والے تھر مو بیرک بموں کی تباہ کاری کی اصل کہانی شاید کبھی منظر عام پر نہ آسکے کیونکہ اس کے حصار میں آنے والا کوئی انسان زندہ نہیں بچ سکتا۔ افغانستان پر یلغار کے بعد پانچ ماہ میں پہلی بار اس نیم ایٹمی ہتھیار کا استعمال ضروری سمجھا گیا ہے جس سے معاملے کی نزاکت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس نوع کا بم روس نے چین میں استعمال کیا تھا جس پر امریکہ سمیت ساری مہذب دنیا چیخ مچی تھی لیکن افغانستان میں موجود امریکی فوج کے کمانڈر کا کہنا ہے کہ ان کے تھر مو بیرک کی ہلاکت آفرینی ”جنیو معاہدے کی حدود میں آتی ہے۔“ افغانستان کی کرائے کی سپاہ اور امریکی فوج کا مشترکہ طور پر یہ سب سے بڑا آپریشن ہے اور گزشتہ پانچ ماہ کے دوران انہیں پہلی بار اس قدر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ایک امریکی اور تین افغانیوں کی ہلاکت کی تصدیق کی گئی ہے لیکن اطلاعات آرہی ہیں کہ ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ گردیز کا ہسپتال زخموں سے بھر گیا ہے اور کئی شدید زخمی امریکی، ہیلی کاپٹروں کے ذریعے دوسرے مقامات کو منتقل کئے جا رہے ہیں۔

خبریں اور بھی ہیں۔ مزار شریف کے قریب شوگلرہ کے علاقے میں عبدالرشید دوہم اور برہان الدین ربانی کے دستوں کے درمیان شدید جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ اتوار کی رات قندھار امر پورٹ پر حملے اور ہلاکتوں کی اطلاعات ہیں۔ گل آغا کے سپاہیوں اور مقامی افراد کے درمیان جھڑپیں ہوئی ہیں۔ کابل کے ہوائی اڈے پر ایک وزیر کے قتل کے بعد کھپتی حکومت کی اندرونی کشمکش زوروں پر ہے۔ امریکی لوٹی جرم کے انعقاد کی راہ میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں۔

امریکیوں کا کہنا ہے کہ شاہی کوٹ کے برف پوش پہاڑوں کے بطن میں غاروں اور سرنگوں کا طویل سلسلہ ہے جہاں طالبان اور القاعدہ کے لوگ منظم ہو رہے ہیں۔ انہوں نے پشتو اور دری زبانوں میں پمفلٹ گرائے ہیں کہ ”ہتھیار ڈال دو ورنہ موت کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ ادھر وائس

آف جرمنی نے اطلاع دی ہے کہ اسامہ بن لادن اور ملا عمر کی تصاویر سے مزین ”شبِ نائے“ تقسیم ہو رہے ہیں جن میں کہا گیا ہے ”امر یکو! تھوڑے دن انتظار کرو۔ تمہیں اپنے انجام کی خبر نہیں جو بہت بھیانک ہوگا“ شاہی کوٹ کی کہانی سنانے والا کوئی داستان گو شاید زندہ نہ بچے۔ ممکن ہے انسانی آوازوں کے اچانک معدوم ہو جانے سے شاہی کوٹ کی برف بھی وحشت ناک تہائی کا شکار ہو گئی ہو۔ ممکن ہے تھر مویرک کے کیسائی زہر سے اس کی بنھیں بھی ڈوبنے لگی ہوں لیکن شہیدوں کا گرم گرم ہوا سے نئی حرارت، نئی زندگی اور نئی تڑپ دے گا۔ یوں بھی نارنج کامبینہ شروع ہو چکا ہے۔ بہار کے قافلے سامانِ سفر تازہ کر رہے ہیں۔ سورج کی تمازت بڑھنے لگی ہے۔ اب شاہی کوٹ کی برف لمبا سفر کر کے میدانوں، وادیوں اور آبادیوں کا رخ کرے گی۔ اس کے شفاف پانی کی گلابی لہریں طلسماتی مخلوق کی پراسرار داستانیں سنائیں گی اور بستیوں کے جوان ایک نئے عزم کے ساتھ گمشدہ لوگوں کی تلاش میں پہاڑوں کو نکل جائیں گے کہ ابھی دلوں میں موجزن ایمان و عشق کو چوس لینے والا کوئی تھر مویرک ایجاد نہیں ہوا۔

بالاکوٹ اور شاہی کوٹ جیسے پہاڑ بڑے سخت جان اور منتقم مزاج ہوتے ہیں۔ وہ تو اونچی آواز کو بھی گونج بنا کر لوٹا دیتے ہیں۔ ”تھر مویرک“ کا قرض کیوں نہیں چکائیں گے۔

[05-03-2002]

انسانی حقوق، جمہوریت، قانون کی حکمرانی

امریکہ کی وزارت خارجہ ہر سال کانگریس کی توثیق سے دنیا کے مختلف ممالک میں "انسانی حقوق کی پامالی" کے بارے میں ایک جامع رپورٹ شائع کرتی ہے۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد سے اس رپورٹ کو ایک اہم دستاویز کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ اسے ایک ایسا آئینہ خیال کیا جاتا ہے جس میں امریکہ کا تعلیم یافتہ اور مہذب معاشرہ ساری دنیا، بالخصوص تیسری دنیا کے ممالک کے چہرے دیکھتا اور ان کے بھیا تک خدو خال کا ماتم کرتا ہے۔ اس جام جہاں نما کا کمال یہ ہے کہ خود امریکی عوام اپنے رخ زیا کے تیکھے نقوش ملاحظہ نہیں فرما سکتے۔

اب کی بار شائع ہونے والی رپورٹ میں، حسب معمول پاکستان کا خصوصی تذکرہ شامل ہے جس میں انسانی حقوق کی پامالی، ماورائے عدالت ہلاکتوں، چائلڈ لیبر، خواتین کے حقوق اور ایسے ہی دیگر معاملات کے حوالے سے پاکستان کو تند و تیز تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ پاکستانی دفتر خارجہ کے ترجمان نے شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے اس رپورٹ کو ناقابل قبول اور حقائق سے قطعی متصادم قرار دیا ہے۔ اس عالم بے چارگی اور دستور زباں بندی کے باوجود ترجمان نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "کسی ملک کو دوسروں پر اپنے فیصلے مسلط نہیں کرنے چاہئیں۔" ادھر امریکی رائے عامہ نے شدید احتجاج کیا ہے کہ وزارت خارجہ اور کانگریس نے اپنے "نئے اتحادیوں" کے ساتھ نرم رویہ اختیار کیا ہے اور انسانی حقوق کے بارے میں ان کے سیاہ ریکارڈ سے چشم پوشی کی ہے۔ چنانچہ امریکی وزیر خارجہ کولن پاول کو بیان جاری کرنا پڑا ہے کہ "دنیا بھر میں انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے موثر اقدامات کرنا صدر بش، کانگریس اور امریکی عوام کا مشترکہ عہد اور ہماری خارجی پالیسی کا لازمی حصہ ہے۔ امریکہ ہمیشہ سے انسانی حقوق، جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے لئے سرگرم عمل ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"

امریکی وزیر خارجہ کو اس نوع کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہئے تھی۔ انسانی حقوق، جمہوریت اور قانون کی سر بلندی سے امریکہ کی لازوال وابستگی کے بارے میں کسی کو کوئی شک و شبہ نہیں۔ جب بھی ”بدگمانی“ کا کوئی امکان پیدا ہوتا ہے اور دنیا امریکہ کے ان ارفع اصولوں کے بارے میں کسی الجھن کا شکار ہونے لگتی ہے تو امریکہ کی قیادت نئے عزم کے ساتھ لوح تاریخ پر ایک نیا باب رقم کرتی اور ”بے خبری“ کے عالم میں پروان چڑھنے والی نسلوں کو باور کرا دیتی ہے کہ وہ کن اعلیٰ اقدار کے لئے سرگرم عمل ہے۔ افغانستان میں حالیہ کارروائیاں اسی جھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے کی نہایت ہی توانا کوششوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ ویت نام اور عراق کے نوشتے کی سیاہی ماند پڑنے کے بعد یہ ضروری سمجھا گیا کہ انسانی حقوق، جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے لئے ایک زیادہ جامع، وسیع تر اور بلوغت لیکچر کا اہتمام کیا جائے جسے عملی تجربات سے موثر بنایا جائے۔ چنانچہ افغانستان کو اس کا رخیر کے لئے منتخب کیا گیا۔ قلعہ جنگلی، تورابورا اور گوانانامو کے ایکس رے کیمپ کی سلائیز دکھا کر انسانی حقوق سے اپنی ازلی وابدی وابستگی کا نمونہ پیش کیا گیا۔ پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کی حکومت کی بھرپور سرپرستی اور افغانستان میں ایک شجر بے شاخ و ثمر کی آبیاری کو جمہوریت کے ساتھ اپنے انوث رشتے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا اور امریکہ کو بدترین نسلی امتیاز کا جہنم بنا کر قانون کی حکمرانی کا مظاہرہ کیا گیا۔ معروف برطانوی اخبار ”گارڈین“ میں شائع ہونے والے جارج مانیٹ کے ایک تازہ مضمون میں ایسے چند واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے جن سے جناب کولن پاول کے دعوے کی تصدیق مزید ہو جاتی ہے۔

برطانیہ میں مقیم ایک پاکستانی، عدیل اکبر ایک خاتون کے ہمراہ اداکاری کے کسی ٹیٹ کے لئے نیویارک کے جے ایف کینیڈی ائرپورٹ پر اترا۔ دونوں کو گرفتار کر کے ایک تفتیشی سیل میں پہنچا دیا گیا۔ جھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ اذیت ناک تفتیش کا عمل کئی گھنٹے جاری رہا۔ اگلے دن انہیں رہائی ملی لیکن وہ ابھی تک اس شش و پنج میں ہیں کہ کیا یہ سب کچھ نیویارک میں ہوا؟

ایک پچاس سالہ مسلم خاتون، جو برطانوی شہری ہے، اسی ائرپورٹ پر اتری۔ وہ کینسر سے جاں بہ لب بہن سے ملنے آئی تھی۔ اسے جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا۔ جھکڑی ڈال کر لمبی زنجیر کے ساتھ ڈیپارچر لاؤنج میں گشت کرایا گیا۔ اس کی نازیبا انداز میں تلاشی لی گئی۔ سوٹ کیس۔ کے تالے توڑ دیئے گئے۔ رات بھر تفتیشی سیل میں رکھا گیا۔ اس نے واویلا کیا کہ مجھے برطانوی

تو فصل خانے سے بات تو کرنے دو لیکن کہا گیا ”تم پاکستانی تو فصل سے بات کر سکتی ہو“ خاتون نے زندگی کے تلخ ترین تجربے سے گزرنے کے بعد امریکہ کے امیگریشن حکام کو خط لکھا ہے کہ میرا قصور تو بتا دو!

گزشتہ ہفتے ایک اخبار نویس نے صومالیہ کے شہر ”موگادیشو“ میں تیس انسانوں کو ایک جگہ مقفل پایا۔ معلوم ہوا کہ یہ افریقی ذراصل امریکی باشندے ہیں، وہیں پیدا ہوئے، وہیں بچے بڑھے، وہیں تعلیم حاصل کی، وہیں ملازمتیں اختیار کیں۔ ایک دن اچانک چھاپے پڑے انہیں جہاز میں لاد کر صومالیہ بھیج دیا گیا کہ تمہارے ماں باپ وہیں پیدا ہوئے تھے۔

آدھی رات کو دروازے تو زکھر گھروں میں داخل ہو جانا، ٹھنڈے مار کر جگانا، توہین و تذلیل کرنا، پکڑ کر تھانوں میں لے جانا، کئی کئی دن زیر حراست رکھنا، اذیتیں دینا، یہ سب کچھ معمول بن چکا ہے۔ ہزاروں مسلمان اس ”حسن سلوک“ سے فیض پار رہے ہیں۔

ادھر جارج بش سے پوچھا گیا ”کیا آپ پکڑے گئے القاعدہ یا طالبان قیدیوں میں سے کسی پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا رہے ہیں۔“ انہوں نے کمال طنطنے سے کہا ”سوائے امریکیوں کے“ ان کا اشارہ جان واکر کی طرف تھا جس کا رنگ گورا ہے اور جس کے ماں باپ پیدائشی امریکی ہیں۔ قانون کی حکمرانی کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہوگی؟

رہا پاکستانی ترجمان کا یہ مشورہ کہ ”امریکہ دوسرے ممالک پر اپنے فیصلے مسلط نہ کرے“ تو غالباً اس نوع کا مطالبہ کرنے کا وقت گزر چکا ہے۔ ہر امریکی فیصلے کو صحیفہ سمجھ کر قبول کر لینے اور اس کے الفاظ و معانی کی ہر تاویل کو حرز جاں بنا لینے کے بعد اس طرح کی ناروا باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ خواہ مخواہ ثواب بھی ضائع ہو جاتا ہے۔

[07-03-2002]

برگ آوارہ

برف زاروں کی آگ پھیلتی جا رہی ہے۔ اس کے شعلے گردیز، خوست، لوگر، پکتیا اور قندھار سے ہوتے ہوئے کامل تک آن پہنچے ہیں۔ طالبان کی راکھ ایک بار پھر بھڑک اٹھی ہے۔ سات سمندر پار بھیجے جانے والے آہنزی تابوتوں کی مانگ بڑھنے لگی ہے اور امریکہ کے مفادات کا پاسبان کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔

امریکہ کے ببرک کارمل کے طور پر افغانستان کا حاکم و مختار ہونے کا دعویدار یہ شخص اپنے جملہ عروسی میں بھی اپنے اختیار کا سکہ جمانے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ معمولی نقل و حرکت کے لئے بھی امریکی اور برطانوی سپاہیوں کا محتاج حامد کرزئی، آج کل دنیا بھر کی سیاحت کے ارمان نکال رہا ہے۔ جس دنیا نے پورے سات سال تک واحد اور متحد افغانستان کے امیر، ملا محمد عمر سے سلام کلام بھی گوارا نہ کیا، وہ دنیا کرزئی کا استقبال کرتی، اس کے سر پر دست شفقت رکھتی اور اس کی بلائیں لیتی ہے۔ اپنے اقتدار مستعار کے چھ ماہ مکمل کرتے وقت، یقیناً حامد کرزئی غیر ملکی دوروں کا نیا ریکارڈ قائم کر چکا ہوگا لیکن افغانستان کے لئے وہ آج بھی ایک نامانوس اجنبی ہے جس کا نہ کوئی تعارف ہے، نہ شناخت، نہ حدود اور بعد نہ پس منظر۔

کرزئی کا افغانستان، طالبان کی نئی معرکہ آرائی کے علاوہ بھی زبردست ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ بونی حکومت کے اعضاء ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور ”دارلارڈز“ کی باہمی کشمکش بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ عبدالرشید دوستم، نائب وزیر دفاع کا منصب سنبھالنے کے باوجود بون کی واردات کا کاری زخم لئے پھرتا ہے۔ اس کے گوریلے، وزیر دفاع قاسم نسیم کے دستوں سے آئے دن الجھتے رہتے ہیں۔ شمالی افغانستان میں بدامنی اور افراتفری بڑھتی جا رہی ہے۔ قاسم نسیم اور دوستم کی نظریں جون میں منعقد ہونے والے لوئی جرگے پر لگی ہیں۔ دونوں کی کوشش ہے کہ وہ ہتھیاروں کے زور پر زیادہ سے زیادہ علاقہ اپنے تسلط میں لے آئیں تاکہ لوئی جرگہ کے زیادہ سے

زیادہ ارکان پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر سکیں اور زیادہ سے زیادہ رقبے پر قابض ہونے کے حوالے سے زیادہ حصہ پاسکیں۔

1998ء تک دو ستم اپنے آپ کو مزار شریف کا بے تاج بادشاہ سمجھتا تھا۔ 1995ء میں امیر المومنین ملا عمر اور ان کے قریبی رفقاء سے ملاقاتوں کے دوران مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اگر طالبان کے لئے کوئی ایک شخص ناقابل برداشت ہے تو وہ دو ستم ہے۔ طالبان نے کم و بیش تین سال بعد مزار شریف کے دروازے پر دستک دی اور دو ستم کو اس کے قلعے سے بے دخل کر دیا۔ وہ چار سال تک بھٹکتا اور پناہیں ڈھونڈتا رہا۔ یہاں تک کہ گزشتہ برس وہ امریکہ کے ڈیزی کٹر بسوں اور کروڑ میزائلوں کے چھاتے تلے ایک بار پھر مزار شریف میں داخل ہو گیا۔ اس کے آتے ہی ظلم و بربریت کا عفریت بھاگ اٹھا اور پرامن شہر کے در و دیوار لرز گئے۔ دو ستم کو رنج ہے کہ یون معاہدے میں اس سے نا انصافی ہوئی۔ وہ اپنی سلطنت کا مطلق العنان فرمانروا بنا بیٹھا ہے۔ نہ کسی سے حکم لیتا اور نہ کسی مرکزی اتھارٹی کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن جمعیت اسلامی کا کمانڈر محمد عطاء جسے فہیم کی حمایت حاصل ہے، اسے شدید مزاحمت سے دوچار کر رہا ہے۔ واقفان حال بتاتے ہیں کہ خود مزار شریف اس کے ہاتھوں سے سرکنا جا رہا ہے۔

کمانڈر عطاء کا کہنا ہے کہ شہر میرے کنٹرول میں ہے اور یہاں صرف میرے ٹروپس ہی ٹھہر سکتے ہیں۔ کشیدگی کی نوعیت سے آگاہ لوگوں کا خیال ہے کہ اہم شمالی صوبے سمنگان پر کنٹرول کے لئے دو ستم اور اس کے مخالفین کے درمیان شدید جنگ کسی بھی وقت شروع ہو سکتی ہے۔ جمعیت اسلامی کی پوری کوشش ہے کہ وہ لوئی جرگہ کے انعقاد سے قبل سمنگان پر قبضہ کر کے دو ستم کو، چار میں سے ایک صوبے کی حکمرانی سے محروم کر دے۔ دو ستم خود از بکوں کی حمایت سے بھی محروم ہونا دکھائی دے رہا ہے۔ کمانڈر عطاء کی طرح دو ستم کا ایک اور پرانا دوست جنرل مالک پہلوان اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہو چکا ہے۔ پہلوان کے پاس جنگجوؤں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور اسے صوبہ فاریاب کے از بکوں کی بھرپور حمایت بھی حاصل ہے۔ دو ستم اپنے سزاتے ہوئے اقتدار کو بچانے کے لئے ایران اور ازبکستان کی طرف دیکھ رہا ہے جبکہ روس جنرل فہیم کی پشت پناہی کر رہا ہے۔

ادھر شمال میں از بکوں، ہزاروں اور تاجکوں کے اسلحہ بند جتھے پختونوں کا عرصہ حیات تنگ کر رہے ہیں۔ انسانی حقوق کے عالمی ادارے ہیومن رائٹس واچ (H.R.W) نے اپنی ایک حالیہ

رپورٹ میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ واقعات کا حوالہ دے کر بتایا ہے کہ پختونوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ انہیں ظلم و تشدد، لوٹ مار، اغواء اور زدوکوب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ان کی خواتین کی آبروریزی کی جاتی ہے۔ اس ظالمانہ سلوک سے اکتائے ہوئے پختون بڑی تعداد میں نقل مکانی کر رہے ہیں۔

یہ ہے حامد کرزئی کے افغانستان کا صرف ایک گوشہ۔ یہ سب کچھ امریکہ، اس کی بہادر اتحادی افواج، اس کی عصمت شعار کولیشن اور منصف مزاج اقوام متحدہ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے لیکن سب خاموش ہیں۔ طالبان کے عہد میں 95 فیصد افغانستان امن و انصاف کا مثالی گہوارہ تھا اور انسانی حقوق کی پامالی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس افغانستان پر صرف ایک قانون کی عملداری تھی..... لیکن امریکہ اور اس کی حاشیہ بردار مہذب دنیا کو یہ سب کچھ منظور نہ تھا۔ اس لئے کہ عصر حاضر کے تقاضوں سے ”نابلد حکمران“ امریکہ کے بجائے قرآن و سنت سے رہنمائی لیتے تھے۔ آج کا افغانستان، پانچ ماہ پہلے کے افغانستان کی نسبت کہیں زیادہ منتشر، کہیں زیادہ غیر محفوظ اور کہیں زیادہ فساد زدہ ہے۔ کسی کی جان، کسی کے مال، کسی کی آبرو کو تحفظ حاصل نہیں لیکن امریکہ اور اس کے حواری خوش ہیں کہ اب وہاں صرف اللہ کے حضور جھکنے والے مرد جبری کے بجائے امریکہ کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے والے پچھ سقہ کی حکومت ہے۔

ہوا کا کوئی شریر جھونکا، ویران روشوں پر ٹھوکریں کھاتے خزاں رسیدہ پتے کو اڑا کر کسی گیلے میں ڈال دے تو وہ گل نو بہار نہیں بن جاتا۔ حامد کرزئی تہہ در تہہ جبہ و عمامہ کے باوجود ساری دنیا کے سامنے عریاں کھڑا ہے۔ مگر نگر کے دوروں کے دوران ہی کسی روز اسے خبر ملے گی کہ افغانستان کے دروازے اس کے لئے بند ہو گئے ہیں..... اور وہ ایک بار پھر دور دیس کی کسی ویران پگڈنڈی پر خزاں رسیدہ پتے کی طرح آوارہ خوہواؤں کی زد میں ہے۔

[08-03-2002]

ضیاء شاہد کا سوال

اسلام آباد میں جناب حمید نظامی مرحوم کی یاد میں منعقد ہونے والے سیمینار کو موجودہ حالات کے تناظر میں نہایت ہی اہم تقریب کہا جا سکتا ہے۔ شاید ہی اتنے مختلف الخیال سیاسی عناصر نے کسی دوسرے فورم پر جمع ہو کر اس قدر سنجیدگی، متانت اور دردمندی کے ساتھ ملک و قوم کو درپیش مسائل پر گفتگو کی ہو۔ صدر تقریب جناب حمید نظامی کے علاوہ مسلم لیگ (ن) کے راجہ محمد ظفر الحق، مسلم لیگ (ق) کے چوہدری شجاعت حسین، ہم خیالی اور کسی لاقصد کے بغیر مسلم لیگی، لال حویلی والے شیخ رشید احمد، ملت پارٹی کے فاروق لغاری، جماعت اسلامی کے لیاقت بلوچ، پیپلز پارٹی کے رضار ہانی، جمعیت العلمائے اسلام کے مولانا سہج الحق، معروف عسکری دانشور جنرل (ر) حمید گل، وفاقی وزیر خزانہ شوکت عزیز، صحافتی شخصیات جناب ضیاء شاہد، جناب زاہد ملک اور جناب شریف فاروق میں سے ہر ایک نے موجودہ منظر نامے پر اظہار خیال کیا۔ جناب شوکت عزیز کے سوا کسی بھی شخصیت کی گفتگو میں اطمینان و آسودگی کی کوئی جھلک نہ تھی۔ ایک تشویش، ایک بے چینی، ایک الجھن اور ایک بے کلی سب کی باتوں میں سلگ رہی تھی۔ اسلام اور پاکستان، قائد اعظم اور اقبال، نوائے وقت اور حمید نظامی، مقررین کی تقاریر کے مرکزی حوالے تھے اور یہ حوالہ انکار کی رنگارنگی کے باوجود موضوع کی مرکزیت کو قائم رکھے ہوئے تھا۔ میرے خیال میں یہ سیمینار حمید نظامی مرحوم کے لئے ایصال ثواب کی ایسی منفرد تقریب دعا تھی جو کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ ان کی روح اس بات پر شاداں و فرحاں ہوگی کہ دنیا سے رخصت ہونے کے چالیس سال بعد بھی وہ کس تمکنت کے ساتھ زندہ ہیں اور ان کی محفل میں اسلام آباد جیسے شہر ناپرساں کے لوگ کس عقیدت و محبت کے ساتھ اٹھنے چلے آ رہے ہیں۔

مجھے یہ بھی گمان گزرتا ہے کہ حمید نظامی کی روح جنت کی فضاؤں میں بھی یہ خلش محسوس کر رہی ہوگی کہ جمہوریت کی پامالی اور فوجی حکومت کی فرمانروائی کے جس آسیب نے ان کے لئے سانس

لینا دو بھر کر دیا تھا اور وہ جان ہار بیٹھے تھے، چالیس سال بعد بھی وہ جاں لیوا کھٹن جوں کی توں موجود ہے، ان کا سخت جان بھائی، ان کے بعد آنے والے تین مارشل لاؤں میں، تین بائی پاس آپریشن کرانے کے باوجود نہ صرف زندہ ہے بلکہ پوری پامردی کے ساتھ اسلام، پاکستان اور جمہوریت کی جنگ لڑنے والے دستے کی قیادت کر رہا ہے۔ مقررین کی باتوں اور سینکڑوں سامعین کے رد عمل سے مجھے اندازہ ہوا کہ برادر محترم مجید نظامی کو چالیس سالوں پر محیط جہادِ عظیم کا جو اجر اس دنیا میں ہی مل رہا ہے، کوئی دولت اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ لہرچہ ایک آتش خاموش میں جلنے اور اپنے دل کو شتر گاہ بنائے رکھنے کے باوجود، مجید نظامی کو جتنے بھی جنم ملیں، وہ اسی دشت پر خار کی بادیہ پیمائی پہ نکلیں گے کہ ہر دور میں کانٹوں کو اپنی پیاس بجھانے کے لئے ایک آبلہ پاء کی ضرورت ہوتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

سیاسی عمائدین کا مرکزی نکتہ ایک ہی تھا کہ جمہوریت اور آئین کی بحالی و بقا کے لئے سب کو متحدہ دیکھنا ہو جانا چاہئے۔ یہ اچھی سوچ ہے۔ اللہ کرے کہ ایک دوسرے کے خلاف ”ون پوائنٹ ایجنڈا“ بنانے والے اس طرح کے ون پوائنٹ ایجنڈے پر متفق ہو جائیں۔ بزرگان سیاست سے قطع نظر میں برادر م ضیاء شاہد کے اس سوال کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو انہوں نے بڑی دلسوزی اور جذبے کی پوری صداقت کے ساتھ حاضرین کے سامنے رکھا۔ وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ ”گیارہ ستمبر کے بعد پاکستان کس حال کو پہنچ چکا ہے اور کس حال کو پہنچنے جا رہا ہے؟ ہمیں ذلت و پستی کے کس گڑھے تک جانا ہوگا کہ بھارت نسبت پوری دنیا کو ہماری شرافت کا یقین آجائے؟ کوئی آخری دفاعی لائن تو ہوگی جہاں کھڑے ہو کر ہم کہہ سکیں کہ بہت ہو چکی، ہم اس سے زیادہ رسوائی برداشت نہیں کر سکتے!“ انہوں نے مزید کہا کہ ”نظامی صاحب اور ان کی سرکردگی میں پوری قوم کو، ایک سنجیدہ اور با مقصد بحث کا آغاز کرنا چاہئے کہ گیارہ ستمبر کے بعد وجود میں آنے والے پاکستان کو کس طرح قائد اعظم اور علامہ اقبال کے پاکستان کے طور پر قائم رکھا جائے اور اس کی آزادی و خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کے تحفظ کے لئے کیا اقدامات کئے جائیں؟“

یہ ایک بنیادی سوال ہے جس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے اور ایک جامع حکمت عملی طے کرنے کے لئے قوم کو اپنی اجتماعی دانش بروئے کار لانا ہوگی۔ ملک بہر حال ایک گرداب بلا میں پھنس چکا ہے۔ اس سانحے کی ذمہ داری کا تعین ہونا رہے گا۔ سر دست کرنے کا کام یہی ہے کہ

معاملے کی نزاکت کا احساس کیا جائے اور احساس دلایا جائے۔ ایسے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس زوال و انحطاط اور قومی تاریخ کی انتہائی المناک سپر اندازی کو بھی فتح و کامرانی اور سفارتی ہنر مندی کے طور پر باور کرایا جا رہا ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ذالروں کے خوش رنگ کھلونوں سے کھیلنے، امریکیوں کے بیانات کے شگوفوں سے خوشبوئیں کشید کرنے، بش، کولن پاول اور مرز فیلڈ سے مصافحوں کو اپنا کمال ہنر خیال کرنے اور پے در پے ہزیموں کو حکمت کاری کی قبائے رنگین پہنانے کے بجائے ہم اس کڑی دھوپ کا تصور کریں جو دیکھتے ہی دیکھتے چھتوں سے اتر کر ہمارے صحنوں میں آ بیٹھی ہے اور جس کی حدت سے حساس لوگوں کی روئیں تک پھیلنے لگی ہیں۔ اس امر کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ہم کس کس محاذ سے، کس کس جے چارگی کے عالم میں پسپا ہوئے اور ابھی تک لڑھکتے جا رہے ہیں۔ ادھر جمہوریت کا لکڑھڑی میں بند اور فیصلہ سازی عوامی جذبہ و احساس کی دھڑکنوں سے محروم ہے۔

کوچہ و بازار میں بال بکھیرے حالات کی نامہر بانوں کا ماتم کرتی اور وطن کی نڈھال پڑتی آزادی و خود مختاری پر بین کرتی حسب الوطنی کی آہ و بکا، فصیل شہر سے ٹکرا کر واپس آ رہی ہے۔ طالبان کی ہڈیوں کا سرمہ آنکھوں میں سجانے کے باوجود ہمارا حسن امریکہ کے دل میں عشق کی کوئی چنگاری نہیں بھڑکا سکا۔ پچپن سالوں سے ناسازگار موسموں کے باوجود، کشمیر کے چناروں میں سلگتی آگ سوالیہ نشان بنتی جا رہی ہے۔ بھارت کے مسلمانوں کی جلتی بستیوں سے اٹھتا دھواں، لاہور کی شاہی مسجد کے میناروں سے دکھائی دے رہا ہے اور ہمارا آسمان رنگارنگ پتنگوں، ہماری شامیں رقص و موسیقی کی محفلوں اور ہمارے سیاست کدے ”ہم خیالی“ کی رعنائیوں سے آباد ہیں۔

حمید نظامی کی یاد میں منعقدہ سیمینار میں برادر مرزا ضیاء شاہد کا اٹھایا گیا سوال، تیرہ کروڑ انسانوں کے دلوں میں سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور مسلسل ڈس رہا ہے۔ اس پر سنجیدہ اور نتیجہ خیز بحث ضرور ہونی چاہئے کہ ہماری بربادیوں کے مشورے سرگوشیوں سے نکل کر کھلے اعلانات تک آچکے ہیں۔ میرے دوست افتخار عارف نے جانے کب کہا تھا۔

مقدر ہو چکا ہے بے درود یوار رہنا
کہیں طے پا چکا ہے شہر کا مسمار رہنا

دقیانوسی سوچ کی ایک لہر

مجھے بڑی مشکلوں سے علم کی برتری، ٹیکنالوجی کی فوقیت، سائنس کی فضیلت، ترقی کی بلاوتی، دولت کی حکمرانی اور جدید تہذیب و تمدن کی انسان دوستی کا یقین آیا تھا۔ میرے دل میں سائنس اور ٹیکنالوجی سے محروم اجڈ اور جدید علوم و فنون سے نابلد، خانہ ویران لوگوں کی محرومی اور انسانی اقدار سے ناشناسی کا احساس جاگزیں ہو گیا تھا۔ عالمی پراپیگنڈے اور اپنے اہل علم و دانش کے افکار کے زیر اثر میں بھی یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ امریکہ جیسے عالی نسب ملک کی ٹیکنالوجی کے سامنے سرتابی کرنا، پر لے درجے کی کم فہمی اور عاقبت نااندیشی ہے۔ میں اس بات کا بھی قائل ہونے لگا تھا کہ جب کوئی ملک مہلک قسم کے میزائلوں اور بموں کا مالک ہو جائے تو کسی اصول، کسی نظریے، کسی مسلک اور کسی آدرش کی بنیاد پر بھی اس کے حکم کے سامنے حرف انکار زبان پر نہیں لانا چاہئے۔ میں شعوری طور پر کوشش کرنے لگا تھا کہ قندھار کے مرد جری، ملا عمر، کوسدیی، ہٹ دھرم اور بے چلک شخص سمجھنے لگوں اور اپنے آپ کو باور کراؤں کہ اس شخص نے خواہ مخواہ پوری افغان قوم کے دلوں میں امریکہ کے خلاف نفرتوں کا الاؤ بھڑکار رکھا ہے۔ میں اس بات کا بھی قائل ہوا جا رہا تھا کہ پاکستان کا مولوی بلاوجہ فتنہ و فساد کو ہوا دیتا اور پاکستانی عوام کے ذہنوں میں امریکہ جیسے مہذب ملک کے بارے میں منفی جذباتوں کی تخم ریزی کر رہا ہے۔ میں ایرانیوں کی طرف سے لگائے جانے والے ”مرگ بر امریکہ“ کے نفرت انگیز نعروں کو بھی ذوق لطیف اور انسانی محسوسات کے منافی خیال کرنے لگا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے دل کو منوایا تھا کہ ہم لوگ چھوٹے، حاسد، کم ظرف، جاہل، خواہ مخواہ نفرتیں بھڑکانے، گالیاں دینے، پتلے جلانے اور نازیبا نعرے لگانے والی قوم بن گئے ہیں جبکہ امریکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا تاجدار ہونے کے ناتے اپنے دشمنوں پر کاری ضرب تو ضرور لگاتا ہے لیکن اس کے پڑھے لکھے، مہذب، شائستہ مزاج اور انسانی شرف و مقام سے آگاہی رکھنے والے عوام کسی ایسی اوجھی حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتے جس سے ان کی عالمانہ

شان پر عامیانه پن کے گمان کا سایہ تک پڑے۔

لیکن گزشتہ روز ایک چھوٹی سی خبر نے مجھے پھر الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ”نیویارک ٹائمز“ نے بتایا ہے کہ امریکہ کے فوجی ہیڈ کوارٹرز، پیٹلا گان کے ترجمان مسٹر ڈین فلبن (DAN PHILBIN) ایک پبلک کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں جو کسی بھی وقت ان کے دفتر پہنچنے والا ہے۔ اس پبلک میں بیت الخلاء میں استعمال ہونے والے ٹائلٹ پیپرز کے دوسرول ہیں۔ ان ٹائلٹ پیپرز کی خوبی یہ ہے کہ ہر ٹشو پر اسامہ بن لادن کی تصویر بنی ہے اور نیچے لکھا ہے ”Wipe out Tarrorism“ (دہشت گردی مٹا ڈالئے)۔ مسٹر ڈین فلبن بے چینی سے اس تحفے کے منتظر ہیں۔ انہوں نے نیویارک ٹائمز کو بتایا کہ وہ ان ٹائلٹ پیپرز کے کچھ رول وزیر خارجہ جناب کولن پاول اور کچھ جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین کو ارسال کریں گے۔ مسٹر ڈین نے اس خدشے کا بھی اظہار کیا ہے کہ جو نبی ان خوبصورت اور اچھوتے ٹائلٹ پیپرز کی بھنگ دوسرے لوگوں کے کانوں میں پڑے گی وہ ٹوٹ پڑیں گے۔

یہ تحفہ ٹائلٹ پیپرز بنانے والی ایک فرم کی طرف سے بھیجا جا رہا ہے جس کا مالک کین فٹش برگ نامی شخص ہے۔ 11 ستمبر کے بعد اس کے خوبصورت ذہن میں اس طرح کے رنگین و دلکش ٹائلٹ پیپرز تیار کرنے کا شگوفہ پھوٹا۔ اس نے صرف دو ہزار رول چھاپے اور ایک ڈبہ سوا چھ ڈالر میں بیچنا شروع کیا۔ کین فٹش برگ نے ایک انٹرویو میں بتایا ”اس خیال کا محرک یہ تھا کہ اسامہ بن لادن جیسے شخص کی زیادہ سے زیادہ تحقیر اور توہین کس طرح کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ میں نے اسامہ کی تصویر بیت الخلاء میں طہارت کے لئے استعمال ہونے والے ٹائلٹ پیپرز پر چھاپ دی۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس غلیظ تصور کو امریکہ کے مہذب معاشرے میں زیادہ پزیرائی نہ ملے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جو نبی میں نے انٹرنیٹ کی ویب سائٹ پر اپنی نئی ”ایجاد“ کا تذکرہ کیا، آرڈرز کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ مانگ بڑھتی چلی گئی یہاں تک کہ میں خود ایک ”مردود شخص“ کی تصویر دیکھتے دیکھتے جگ آ گیا۔ چنانچہ میں نے ویب سائٹ سے اس کا تذکرہ ختم کر دیا تاہم آرڈرز کی سپلائی جاری رکھی۔“

گزشتہ ہفتے فٹش برگ کے زر خیز ذہن میں ایک نئے خیال نے انگڑائی لی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ یہ ٹائلٹ پیپرز، خراج عقیدت کے طور پر ان عظیم شخصیات کو روانہ کئے جائیں جنہوں نے دہشت گردی کے خلاف تاریخ ساز جنگ کی منصوبہ بندی کی۔ چنانچہ اس نے پیٹلا گان کے

ترجمان سے رابطہ کیا۔ فون پر بات کرتے ہوئے مسٹر فلین کی آواز فرط مسرت سے کانپنے لگی۔ انہوں نے کہا ”کیوں نہیں کیوں نہیں۔ یہ ٹائلٹ پیپر ضرور بھیج دو۔ پیٹھا گان والے انہیں پا کر بہت خوش ہوں گے۔“

اس وقت تک یہ ٹائلٹ پیپر یقیناً امریکہ کے فوجی ہیڈ کوارٹرز میں تمام بڑے عہدیداروں کے بیت الخلاءوں میں آراستہ ہو چکے ہوں گے۔ پیٹھا گان کے ترجمان مسٹر فلین نے نیویارک ٹائمز کو یہ بھی بتایا کہ وہ یہ منفرد ٹائلٹ پیپر امریکی مہم کی فرنٹ لائن شخصیات کو بھی ارسال کرنا چاہتے تھے لیکن ”لائٹسلس“ کے مسائل کے پیش نظر فی الحال یہ تجویز ملتوی کر دی گئی ہے۔

یہ خبر پڑھنے کے بعد سے میرے اعصاب، میری گرفت میں نہیں آ رہے۔ یہ جاہلانہ اور دقیانوسی خیال ایک بار پھر میرے دماغ میں بیچ و تاب کھانے لگا ہے کہ روشن انسانی قدروں کے پھول صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے شجر طیبہ پر نہیں کھلتے۔ میں سوچنے لگا ہوں کہ طالبان کی قید میں رہنے والی امریکی اور برطانوی لڑکیوں نے تو رہائی کے بعد کہا تھا کہ ”وہ ہمیں بہنیں کہہ کر پکارتے تھے۔ ہمارے آرام و آسائش کا خیال رکھتے تھے۔ ہمیں کھانا کھلانے کے بعد خود کھاتے تھے“ اور تہذیب و تمدن کا آفتاب جہاں تاب، اسامہ کی تصاویر والے ٹائلٹ پیپر سے لطف اٹھا رہا ہے۔ ہمارے ایک فقیہ نے تو کہا تھا کہ ”کاغذوں والے بازار سے با وضو گزرا کرو۔“ بے شک سوچیں انڈی چلی آرہی ہیں۔ ایک بار پھر مجھے جارج بش کا قد، ملا عمر کی چیلی کے تلوے سے بھی چھوٹا دکھائی دینے لگا ہے۔ ایک بار پھر مجھے تعلیم یافتہ اور مہذب امریکی، بے کرتوں، گھنی ڈاڑھیوں اور بھاری پگڑیوں والے طالبان کے مقابلے میں بونے دکھائی دینے لگے ہیں۔

میں اپنے آپ کو اس غیر منطقی، پسماندہ، دقیانوسی اور جاہلانہ سوچ کے چنگل سے آزاد کرانے کی کوشش میں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو دنوں میں میرا کوئی دانشور دوست ایسے تو انا دلائل لے آئے گا جو ٹائلٹ پیپروں والے امریکہ کی فضیلت و برتری اور اپنی کم مائیگی کا احساس ایک بار پھر میرے حواس پر غالب کر دیں گے۔

[15-03-2002]

تعاون کی پیشکش

اسلام آباد کے جس علاقے میں واقع چرچ کونشانہ بنایا گیا، وہ غالباً پاکستان بھر میں سب سے زیادہ حساس اور سب سے زیادہ محفوظ علاقہ خیال کیا جاتا ہے۔ دنیا بھر کے سفارتخانوں کے دفاتر اور سفارت کاروں کی رہائش گاہوں کے عین وسط میں گرنیڈوں سے مسلح شخص کا دن دھاڑے، بغیر کسی روک ٹوک کے چرچ کے عبادت ہال تک پہنچ جانا، واردات کرنا اور پھر مکمل طور پر چرچ ٹکنا کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ ہر اعتبار سے افسوسناک واقعہ ہے جس سے ملک کی رسوائی ہوئی ہے۔ حکومت پاکستان نے بعض اہلکاروں کو غفلت کی سزا بھی دی ہے۔ لیکن واردات، بہر حال واردات ہوتی ہے۔ سنگین پہروں اور کڑے انتظامات کے باوجود کہیں نہ کہیں کوئی ایسا رخسہ ضرور رہ جاتا ہے جس سے ضرب لگانے والے فائدہ اٹھا جاتے ہیں اور جب کوئی شخص اپنی جان سے گزر جانے پر اتر آئے اور اپنے دل میں بھڑکتے الاؤ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے خود الاؤ کا ایندھن بننے پر تیار ہو جائے تو حفاظتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ پاکستان کو شعلہ نشاں آنکھوں سے دیکھنے، گھر کیاں دینے اور واردات کے ڈانڈے ایک نئی مہم کے جواز تک پہنچانے والے امریکی حکام کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی، تربیت یافتہ مستعد عملے، دور تک دیکھنے والی سیکورٹی ایجنسیوں اور ناقابل شکست حفاظتی انتظامات کے باوجود اس کے ہوائی اڈوں سے ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں چار طیارے اغواء ہوتے، اس کی عسکری و اقتصادی قوت کی قومی علامتوں کو نشانہ بناتے اور قیامت پھا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد امریکہ نے اشتعال، جھنجھلاہٹ اور برہمی میں آ کر جو کچھ بھی کیا، وہ اس کو تاہی کا مداوا نہیں کر سکتا جس نے واردات کے منصوبہ کاروں کو موقع فراہم کیا۔

خود امریکہ کا کہنا ہے کہ 11 ستمبر کے بعد ایک نئی دنیا نے جنم لیا۔ افغان عوام کی ہڈیاں اس نئی دنیا کی بنیادوں کا اینٹ روڑا بنیں۔ پاکستانی قوم ابھی تک اپنی خفت مٹانے کے لئے کسی محکمہ کفیل و جوائین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

بہانے کی تلاش میں ہے۔ اسلامی ممالک اپنی اپنی پوٹلیاں سنبھالے بیٹھے ہیں اور دنیا ٹکر ٹکر ٹوٹی قدروں، رسوا ہوتی روایتوں، سرعام لٹتے انسانی حقوق اور تذلیل کے بحر ظلمات میں ڈبکیاں کھاتی انسانیت کا تماشا کر رہی ہے۔ داخلی محاذ پر امریکہ نے کڑے قانون اور ضابطے جاری کئے۔ فوجی عدالتیں بنا ڈالیں۔ انسانوں کے چڑیا گھروں کا نادر تصور پیش کیا۔ شخصی آزادی کے تصور کو اس بری طرح پامال کیا کہ حساس لوگوں کے دل پھنسنے لگے۔ لیکن 11 ستمبر کے واقعات کی ذمہ داری کا تعین کرنے کے لئے کوئی سرگرمی نہیں دکھائی گئی۔ نہ کسی امریکی سے باز پرس ہوئی، نہ کوئی نشانہ بنا، نہ کسی کی نوکری چھوٹی نہ کسی کی نکسیر پھوٹی، کوئی افسر، کوئی عہدیدار اور کوئی اہلکار غفلت و کوتاہی کا ذمہ دار نہ ٹھہرا۔

اور ادھر یہ عالم ہے کہ صدر بوش سے کولن پاول تک سب فرط غضب سے ہلکان ہو رہے ہیں کہ مجرم پکڑو۔ نائب وزیر خارجہ کرستینا روکا، بھارت کا دورہ ادھورا چھوڑ کر بھاگی بھاگی اسلام آباد پہنچیں۔ سنٹرل کمانڈ کے کمانڈر جنرل ٹومی فریک نے صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر خود پاکستان آنا اور صدر مشرف سے رابطہ ضروری خیال کیا۔ وینڈی چیمبرلین اور ایف بی آر مسلسل متحرک ہیں۔ صدر بوش ابھی تک 11 ستمبر کے مجرموں کا سراغ نہیں لگا سکے اور کسی مستند ثبوت کے بغیر سارا ملہ اسامہ بن لادن کے سر ڈال کر سرخرو ہو گئے لیکن وہ اسلام آباد کی واردات کا سراغ لگانے کے لئے ضروری تعاون اور مشترکہ مساعی کی پیشکش کر رہے ہیں۔ امریکی اور دیگر مغربی ذرائع ابلاغ نے پاکستان کی ”نااہلی“ کے بارے میں ایک نیا طوفان کھڑا کر دیا ہے۔ شاہی کوٹ کے معرکے کے دوران بھی یہ خبریں تسلسل کے ساتھ پھیلائی گئیں کہ زیادہ پھلچل پاکستان سے ملنے والی سرحدوں کے ساتھ ساتھ ہے اور پاکستان، القاعدہ یا طالبان کی باقیات کا گڑھ بن گیا ہے۔ یہ اچھوتا مشورہ، ایک بار پھر سامنے آیا ہے کہ دہشت گردی کے خلاف عالمی مہم پاکستان کو مرکز بنائے اور ان عناصر کا خاتمہ کرے جو کسی نہ کسی طور امریکی مفادات کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

پاکستان عجب آزار میں مبتلا ہو چکا ہے۔ صدر مشرف نے حالات کے جبر تلے ایک کٹھن اور نامقبول فیصلہ کیا۔ امریکہ نے اس فیصلے کی قدر افزائی نہیں کی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد بے شمار مراعات، الامحود و عنایات اور بے حد شیریں ثمرات کی ایسی برسات کا تصور پیش کیا گیا کہ ہماری آنکھوں میں جنت ارضی کے خواب ہلکے ہلکے لگے۔ لیکن منظر نہ بدلا۔ آکسیجن ٹینٹ میں

پڑی معیشت کو زندہ رکھنے کے لئے کبھی کبھار تازہ سلنڈر آجاتے ہیں۔ صدر مشرف کے حالیہ دورہ امریکہ کے دوران ایک ارب ڈالر قرضے کی جس معافی کا مشرودہ سنایا گیا تھا وہ بھی روایتی معشوقاؤں کے وعدے کی طرح چٹکیوں میں اڑتا نظر آتا ہے اور اب پاکستان ایک بار پھر ایک نئے دباؤ کی زد میں ہے۔ وہ تو تیس پھر سے سرگرم ہو گئی ہیں جو امریکی عتاب کے مرحلہ اول میں پاکستان کے فوج نکلنے پر بیچ و تاب کھا رہی تھیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے امریکی قہر و غضب کی طنائیں کا بل و قندھار سے اسلام آباد کی طرف موڑنا چاہتی ہیں۔ دباؤ میں آئے ہوئے پاکستان کو گھر کے دروازوں کے بعد سارے در پیچ تک کھول دینے اور سب کچھ امریکہ کے سامنے سجا دینے کے لئے کہا جا رہا ہے۔ اس نوع کی وارداتیں روکنا پاکستان کے بس میں ہے نہ امریکہ کے بس میں۔ امریکہ کو زخم لگے تو وہ کسی پر شک کا لیبل لگا کر اس کی تکتہ بوٹی کر کے اپنے عوام کی تسکین قلب کا سامان کر سکتا ہے۔ ہمارے وجود پر کوئی چرک لگے تو خود ہم کو ہی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے ہماری پشت پر تازیانے برسائے جانے لگتے ہیں۔

جرم ضعیفی کی سزائیں بھی کیسے کیسے لباس رکھتی ہیں۔ کہیں ڈیزی کٹر اور کروڑ میزائلوں کی شکل میں، کہیں اشتراک عمل اور تعاون کی پیشکشوں کی صورت میں۔

[21-03-2002]

نوح اور بین

ایک سینئر سرکاری عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک اہم ذمہ داری سنبھالنے والے میرے ایک دانشور دوست غیر ارادی طور پر سیاہ سوٹ پہن کر گھر سے نکلنے کو تھے کہ بیگم نے پوچھا:

”یہ آج سیاہ سوٹ کسی خاص مناسبت سے پہنا گیا ہے؟“

”بس یونہی سمجھ لو۔ محرم بھی تو شروع ہو چکا ہے۔“

شستہ مزاج اور ذہین بیگم نے کہا ”لیکن زمانہ بدل چکا ہے کسی نے پوچھا تو محرم کا نام نہ لینا۔ ایسی باتیں آؤٹ آف فیشن ہو چکی ہیں۔“

”تو پھر کیا کہوں؟“ سعادت مند میاں نے پوچھا۔

”کہنا کہ یہ چرچ کے سانچے میں ہلاک ہونے والے امریکیوں کے سوگ میں پہنا ہے۔“

میرے دوست نے حیرت اور استعجاب کے ساتھ دلہیز پر کھڑی بیگم کی طرف دیکھا۔ وہ بولیں ”اس میں حیران ہونے والی کون سی بات ہے۔ دیکھتے نہیں ہر طرف سے رنج و غم میں ڈوبے بیانات جاری ہو رہے ہیں جیسے پاکستان میں دہشت گردی اور انسانی قتل کی پہلی واردات ہوئی ہو۔ تمہارا ماتمی لباس تمہیں روشن خیال، ماڈرن اور لیبرل طبقے میں شمار کرے گا۔ محرم کا نام لے کر خواہ مخواہ دقیانوسی اور بنیاد پرست کہلاؤ گے۔“

کیا بظاہر یہ لطیف اور دلہیز سا گھریلو واقعہ تبدیل ہوتے منظروں اور سوچوں میں نئی گرہیں ڈالتے موسموں کا اشارہ ہے؟ اسلام آباد کے ایک چرچ میں مصروف عبادت انسانوں کے قتل کی مذمت کے بارے میں دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ اہل پاکستان کے اجتماعی ضمیر نے بجا طور پر اس واقعے کی مذمت کی ہے لیکن پچھلے تین چار دنوں کے واقعات نے کچھ ایسے چھتے ہونے سوالات بھی اٹھائے ہیں جو پہلے سے زخم خوردہ قوم کے اضطراب میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ جاں بحق ہونے والی دو امریکی خواتین اور کچھ زخمی امریکیوں نے اس سانحے کو ایک عالمی رنج

دے دیا ہے۔ امریکی نائب وزیر خارجہ خاص طور پر ان کی میتیں لینے اسلام آباد آئیں۔ جارج بش اور کولن پاول نے صدر مشرف سے براہ راست رابطہ کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکہ اپنے شہریوں کی جانوں کو کتنی اہمیت دیتا ہے۔ خود ہماری حکومت نے اس نوع کے رد عمل کا مظاہرہ کیا جیسے اس کے ”ٹون ٹاور“ یا ”پیٹھا گون“ نشانہ بن گئے ہوں۔ مرکزی وزراء آتش زیر پا ہو گئے۔ اجلاس پر اجلاس بلائے جانے لگے۔ آئی جی اور ایس ایس پی معطل ٹھہرے۔ تھانیدار فارغ کر دیئے گئے۔ تحقیقاتی کمیشیاں بن گئیں۔ قانون نافذ کرنے والی تمام ایجنسیوں میں انسداد دہشت گردی کے نئے سیل بن گئے۔ تفتیش کے لئے خصوصی ٹیمیں وجود میں آگئیں۔ ڈی این اے کے نمونے جمع ہونے لگے۔ جگہ جگہ نا کے لگ گئے۔ سیکورٹی کی کڑی پابندیوں کا اطلاق وزراء اور سینئر اہلکاروں پر بھی ہونے لگا۔ سڑکوں کے کنارے نماز پڑھنا ممنوع ٹھہرا۔ اخبار شدہ سرخیوں سے بھر گئے۔ علماء اور سیاسی عمائدین کے بیانات کا مینا باز اراج گیا۔ عالمی ذرائع ابلاغ ایک بار پھر پاکستان کے درپے ہو گئے۔ ایک ایسی فضا بنا دی گئی جیسے ملک سنگین قسم کی افراتفری کا شکار ہو گیا ہو۔

یہ وہی پاکستان ہے جس میں اہل پاکستان کا خون بڑے تو اترا اور تسلسل کے ساتھ بہ رہا ہے۔ آئے دن قتل و غارت گری کی وحشیانہ وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اسی اسلام آباد سے متصل خیابان سرسید کی مسجد نجف میں درجن کے لگ بھگ بے گناہ انسان بھون ڈالے گئے۔ کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رہیں گی۔ کسی گوشہ اقتدار میں ادنیٰ ترین درجے کا بھونچال بھی نہیں آیا۔ ڈی این اے کی کوئی بحث نہیں چلی۔ انتظامیہ میں اکھاڑ پھانڈ کی کوئی لہر نہیں اٹھی۔ مجرموں کے تعاقب کے لئے خصوصی دستے نہیں بنے۔ اس سے قبل بہاولپور میں ایسی ہی ایک واردات میں عیسائی برادری کے عبادت گزاروں کے سینے چھلنی کر دیئے گئے۔ کوئی قیامت نہیں ٹوٹی۔ کسی کی نیندریں حرام نہیں ہوئیں۔ کراچی میں ڈاکٹروں کو چن چن کر نشانہ بنانے کا پراسرار کھیل عروج پر ہے لیکن زندگی اسی ڈھب اور چھب سے رواں دواں ہے۔

کیا یہ سب کچھ بھی 11 ستمبر کی آسمانی رات میں طے پا گیا تھا؟ مانا کہ امریکی قہر و غضب کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور طالبان کشی کے لئے اپنا کندھا پیش کرنے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا لیکن کیا یہ بھی طے پا گیا تھا کہ ہمارے آنسو بھی وقف امریکہ ہو چکے اور صرف کسی گورے کی لاش پر ہی

بہیں گے؟ ہمارے نوے اور بین اب صرف ان کے لئے ہوں گے؟ ہمارا قانون صرف انہی کے قاتلوں کو پکڑنے کے لئے انگریزی لے گا؟ ہمارے نا اہل افسروں کے گریبان پر صرف ان کے لئے ہاتھ ڈالا جائے گا؟ ہماری ایجنسیوں کی نیند صرف ان کے لئے ٹوٹے گی؟ تفتیش کی خصوصی ٹیمیں صرف انہی کے لئے تشکیل پائیں گی؟ انسداد دہشت گردی کے خصوصی سیل صرف انہی کے لئے بنیں گے؟

امن و امان کی غارت گری کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ جانے کب سے جاری ہے۔ قوم ایک لگے بندھے فارمولے کی عادی ہو چکی ہے۔ بھیا تک واردات، رسی بیانات، مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے اعلانات اور پھر گہری نیند کا ایک لمبا وقفہ جو دوسری واردات سے پہلے نہیں ٹوٹ پاتا۔ پاکستانیوں کا خون افغانستان میں ہے تو نذر حماقت ہوا۔ ان کی لاشوں کے سامنے بھی آہنی باڑیں لگا دی جاتی ہیں۔ عبد اللہ جیسے معصوم پاکستانی کا لہوا امریکہ میں ہے تو کسی کی آنکھ نم ہوتی ہے نہ کسی کے ہونٹوں پر کوئی حرف ناسف ہی آتا ہے۔ معمولات حیات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ گلشن کا کاروبار اسی انداز میں چلتا رہتا ہے۔ ایک افسوسناک واردات پر رد عمل بجائے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اپنا توازن کھو بیٹھے ہوں یا پھر ہمارے اندر خوف کا کوئی شیش ناگ مسلسل پھنکار رہا ہے جو ہمیں اپنے لہو پر دو آنسو بھی نہیں بہانے دیتا اور جس کی دہشت کے زیر اثر کسی سفید فام کی بلاکت پر ہم گریبان چاک، بال بکھرائے، بین کرتے، نوے پڑھتے یوں سڑکوں پر نکل آتے ہیں جیسے تخلیق کائنات کے بعد ہائیل اور قاتیل کا واقعہ پہلی بار رونما ہوا ہو۔

[22-03-2002]

کر بلا تا کر بلا

دشت کر بلا کی لوح پر رقم ہونے والی تابندہ کہانی اس درخشندہ تاریخ کا دیباچہ ہے جو اب تک اسی آب و تاب کے ساتھ لکھی جاتی رہے گی۔ ریگزار کر بلا کو سیراب کرنے والے مقدس لہو کی حرارت اہل جنوں کے دلوں میں وہ آگ بھڑکاتی رہے گی جو ظلم سے نکرانے اور کسی اعلیٰ و ارفع مقصد کی خاطر جان سے گزر جانے کا حوصلہ دیتی ہے۔ مفاد پرستی و مصلحت کیشی کی خوش رنگ ترغیبات جا دو جگاتی رہیں گی۔ شہنشاہوں کی شوکت و سطوت کو پاؤں کی ٹھوک پر رکھنے والے سر بلند فاتحہ کش اسی شان بے نیازی کے ساتھ منزل جاناں کی طرف قدم بڑھاتے رہیں گے۔ اپنی مادی قوت پر ناز کرنے، اپنے لشکروں کی تعداد کو سرمایہ افتخار جاننے اور اپنے ساز و سامان جنگ کو اپنی فضیلت و برتری کا حوالہ سمجھنے والے، اسی رعونت کے ساتھ خدائی کا دعویٰ کرتے رہیں گے۔ اپنے نظریے کی صداقت، اپنے اصولوں کی حقانیت اور اپنے مقصد کی سچائی پر کامل یقین رکھنے والے بے سرو سامان قافلے، اسی تمکنت، اسی وقار اور اسی باکپن کے ساتھ شہادت حق کا فریضہ سر انجام دیتے رہیں گے۔ قوت کے نشے میں مست حکمران اسی طرح ”فتح مند“ اور رسوا ہوتے رہیں گے۔ حق کے پرچم بردار اسی طرح ”مفتوح“ اور سر بلند ٹھہریں گے۔ اقتدار اور مراعات کے گوشواروں پر انحصار کرنے والے اسی طرح ”کولیشنیں“ بناتے اور مٹھی بھر دیوانہ خو لوگ اسی طرح کولیشنوں کی دعوت پر خاک ڈالتے رہیں گے۔ جلتے خیموں کی راگھ اسی طرح جہان نو آباد کرتی رہے گی۔ مسافر ان قافلہ حجاز کی ہر موج خوں سے چمن ایجاد ہوتے رہیں گے۔ شام غریباں کے نوے یونہی نئی صبحوں کے افق پر دستکیں دیتے رہیں گے۔ چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کی یہ کشمکش اسی طرح جاری رہے گی کہ یہی اہل حق کے لئے روح حیات اور حاصل کائنات ہے۔

فتح و شکست کے پیمانے بدل دینے اور حیات و موت کو نئے معنی و مفہوم عطا کرنے والی یہ

داستان ابد تک کے لئے حوالہ بن چکی ہے۔ وقت کی فرعونی قوتوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے اور اپنی جانوں کو متاع حقیر سمجھ کر ازلی وابدی صداقتوں کے لئے اپنا لہو دینے والے لوگ کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ سپاہ ظلم و جور اپنا سفر جاری رکھے گی، کبھی تیز دھار خنجروں، دو دھاری تلواروں اور زہر میں بچھے تیروں کے ساتھ، کبھی کروڑ میزائلوں، ڈیزلی کٹرز اور تھر مو بیروں کے ساتھ۔ بے سرد سماں سے مردانِ وفا کیش کے خاک و خون میں تڑپتے لاشے آنے والوں کو یہ پیغام دیتے رہیں گے کہ شہادت حق کا سفر جاری رکھنا۔ اگر تم اپنی زندگیوں کی خاطر خوف کی ہیکل مار کر بیٹھ گئے، اگر تم نے چند آسائشوں اور تھوڑی سی مراعات کے لئے ظالم کی ہم نشینی قبول کر لی، اگر تم نے نفع و نقصان کے میز ایسے بنا کر مصلحت کیشی کی چادر تان لی اور اگر تم نے کسی صاحب جبر کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا تو تم ایک اچھے ”حکمت کار“ اور وقت کے ”غاض“ تو بن جاؤ گے لیکن آنے والی نسلوں کو تمہارے تذکرے سے گھن آئے گی۔ نہ تمہارے لئے کوئی آنکھ نم ہوگی، نہ کوئی صف ماتم بچھے گی نہ کسی شام غریباں کا اہتمام ہوگا۔

امام عاشقان اور پور بتول نے اپنے نانا کی تعلیمات سے کسب فیض کرتے ہوئے زندگی کا قرینہ اور موت کا سلیقہ سکھایا۔ موت و حیات کا یہ فلسفہ، وقت اور جغرافیے کی قید سے آزاد ہے۔ آج میرے پڑوس میں بھی کچھ ایسے ہی اہل جنوں آباد ہیں۔ بدر و حنین و کربلا والوں کے پاؤں کی مقدس خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے والے دیوانہ خو، حکمت سے نابلد، مصلحت سے نا آشنا، زمانہ سازی سے بے بہرہ، ان گھڑ، بے ڈھب، بے چلک، کھر درے سے لوگ۔ صرف ایک چوکھٹ پر جبینیں ٹیکنے اور مصنوعی خداؤں کا دو ٹوک انکار کرنے والے۔ امریکہ اور اس کی کولیشن کی قاہری کا تمسخر اڑانے اور زمانے کے تندرو سیلاب سے الگ دھارا بنانے والے۔ وہ چاہتے تو اسامہ بن لادن نامی ایک اجنبی شخص کو امریکہ کے حوالے کر دیتے۔ اپنی عفت شعار خواتین کو برقعے اتار دینے کی برکات اور بے حجابی کے ثمرات سے آگاہ کرتے۔ فاقہ کشی کی زندگی گزارنے کے بجائے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے خوان نعمت کی لذتیں سمیٹتے۔ کولن پاول اور مرز فیلڈ کے قدموں تلے سرخ قالین بچھاتے۔ عمامے، ڈاڑھیاں اور پگڑیاں بش کی نذر کرتے..... لیکن جانے کیوں قدھار کے مرد جبری کے قلب و ذہن میں یہ سب کچھ سامنے پایا۔ شاید وہ قافلہ حجاز کی زوائتوں سے شرمایا گیا۔ وہ قیامت پر یقین رکھتا تھا۔ اس نے سوچا کہ حشر کے میدان میں نبی

رحمت ﷺ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ نواسہ رسول ﷺ کو کیا جواب دوں گا، جس نے جبر کی قوتوں کے سامنے جھکنے کے بجائے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا ہے اور میں جانتا ہوں کہ مجھ جیسا سگ دنیا اس پر اسرار، طرحدار، بے نیاز اور سیر چشم حجرہ نشین کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ملا عمر کو جس کسی نے بھی دیکھا ہے اسے یقین ہے کہ وہ سر بلندی کی موت مرے گا۔ کربلا کی ریت سے کوسوں دور، کسی پہاڑ کی کھوہ، کسی گہری کھائی، کسی برف پوش پہاڑ کی چوٹی یا کسی سنگلاخ چٹان کے پہلو میں پڑی اس کی لاش کے آس پاس سے وہی خوشبو اٹھے گی جو تقریباً پونے چودہ سو سال پہلے دجلہ و فرات کے گیسوؤں سے اٹھی تھی۔ پھر اس کے نوے اور مرھے کئے جائیں گے۔ اس کی ”شام غریباں“ کا اہتمام ہوگا۔ کربلا کی دکتی ہوئی تاریخ کا ایک اور باب رقم ہوگا۔ قافلہ حجاز چلتا رہے گا، چلتا رہے گا۔ شہیدوں کی موج خوں سے چمن ایجاد ہوتے رہیں گے۔ شام غریباں، زرتاب صحوں کے افق پر دستک دیتی رہے گی۔

قتل گاہوں کو لہو دیتے رہیں گے اہل دل
کارواں چلتے رہیں گے کربلا تا کربلا

[28-03-2002]

کابل کا میسر

www.KitaboSunnat.com

امریکی اخبار "نیویارک ٹائمز" کی ایک تازہ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بون میں جنم لینے والی بونی حکومت کے چیئر مین عزت مآب حامد کرزئی کی حکمرانی صرف کابل شہر تک محدود ہے اور وہ کسی ریاست کے سربراہ کی بجائے شہر کا میسر دکھائی دیتا ہے۔ جونہی کابل شہر کی سرحدیں، مضافات کی بستیوں سے گلے ملتی ہیں۔ کرزئی کا دائرہ فرار وائی ختم ہو جاتا ہے۔ صوبے آزاد، گورنر خود مختار اور دار لارڈز بے مہار ہیں۔ جناب کرزئی کی سب سے بڑی ترجیح غیر ملکی سیر و سیاحت ہے۔ اب تک پندرہ ممالک کا دورہ کر چکے ہیں جبکہ حالیہ زلزلے کے سبب انہیں ترکی اور بعض دوسرے ممالک کا دورہ ملتوی کرنا پڑا ہے۔ رپورٹ کے مطابق دار لارڈز کی باہمی کشاکش عروج پر ہے۔ شمال میں عبدالرشید دوستم اور استاد عطا محمد کی فوجیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے صف آرا ہیں۔ دوستم ہزاروں پختونوں کو بے آبد کر کے گھروں سے نکال چکا ہے۔ پختونوں کے گھر، ان کا اسباب اور ان کی بہو بیٹیاں، اس کی سفاک سپاہ کا من پسند ہدف ہیں۔ ملک بھر میں لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔ کابینہ کے نصف سے زیادہ وزراء تاجک اور ازبک ہیں جو کرزئی سے احکامات لینے کی بجائے من مانی کرتے ہیں۔ اخبار نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مجوزہ لویہ جرگہ کے موقع پر کابینہ کے بیشتر وزراء کرزئی سے لاتعلق ہو کر برہان الدین ربانی سے جا ملیں گے۔ استاد سیاف، گلبدین حکمت یار اور ربانی پر مشتمل نئے اتحاد کی کوششیں سرگرمی سے جاری ہیں۔

نیویارک ٹائمز کی رپورٹ کا ایک اہم انکشاف یہ ہے کہ نئی حکومت وجود میں آنے کے بعد سے چھوٹے چھوٹے سرکاری ملازمین کو بھی تنخواہ نہیں ملی۔ عیسوں کی صورت میں وصول کی جانے والی برائے نام رقم بھی سرکاری خزانے تک پہنچنے کی بجائے خود سرعمال کی جیبوں میں چلی جاتی ہے۔ البتہ کرزئی کا ذاتی کاروبار ڈالروں کے سہارے چل رہا ہے جن کی فراوانی ہے۔

حامد کرزئی کی عمدہ قرآنی ٹوپی، اس کے نیم شاہانہ لباس، اس کی فضیلت آمیب عبا اور اس کی چال ڈھال سے یوں لگتا ہے جیسے قیصر و کسریٰ کی باقیات میں سے کوئی عالی نسب روح ایک بار پھر انسانی روپ میں ڈھل کر سامنے آگئی ہو۔ وہ چلتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے پاؤں کی دھمک سے زمین کا سینہ دہلنے لگا ہو۔ وہ کچھ اس انداز سے لب کشائی کرتا ہے جیسے افغانستان کے عوام کی مسیحتی کے لئے اسے آسمانوں سے اتارا گیا ہو لیکن دنیا جانتی ہے کہ وہ کس کے حسن تخیل کا شہکار اور کس کے خواب دلاویز کی تعبیر ہے۔ ”نیویارک ٹائمز“ نے کابل کا میسر قرار دے کر ایک بے تک و نام شخص کو معتبر بنانے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے قصر صدارت میں بھی کولیشن کے دستوں کی پناہ میں رہنے والا ایک بے بس دلا چار سا شخص ہے۔ افغانوں کی جبری اور شجاع تاریخ کے ایوان میں حامد کرزئی کا وجود ایک حادثہ ہے جس پر افغانستان کی سنگلاخ سرزمین کے فولادی پتھروں کی آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہوں گی۔

امریکہ کے اخلاص اور کولیشن کی نیک نیتی پر شک کئے بغیر یہ سوال پوچھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ افغانستان کے کم نصیب عوام کو کس نوع کے حکمرانوں سے محروم کر کے کس قماش کے بھیڑیوں کے سامنے ڈال دیا گیا ہے؟ طالبان جو بھی تھے ان کے سینوں میں انسانوں کا دل دھڑکتا تھا۔ وہ اپنے لوگوں سے معاملہ کرتے وقت اسلامی تاریخ کے درخشاں اوراق سے رہنمائی لیتے تھے۔ انہوں نے جنگ زدہ افغانستان کو ایک نظم کی لڑی میں پرودیا تھا۔ مثالی امن و امان کو یقینی بنا دیا تھا۔ معاشرے کو اسلحہ اور منشیات سے پاک کر دیا تھا۔ بے لاگ انصاف کا بے مثل ڈھانچہ تشکیل دیا تھا۔ محصولات اور بیت المال کا عمدہ نظام جاری کیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ فقر و درویشی کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے ان لوگوں کی زندگیاں آج کے دور میں گئے وقتوں کے گم گشتہ کرداروں جیسی تھیں۔

قدھار کے ریٹ ہاؤس میں رات کے کھانے سے ذرا پہلے پلاسٹک کا ایک شکتہ سالونائے ایک معذور شخص میرے ہاتھ دھلوانے کے لئے بیساکھی کے سہارے کھڑا ہو گیا تو مجھے بڑی شرم آئی۔ میں نے بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس کا نام ملا محمد حسن رحمانی ہے اور وہ قدھار کا گورنر ہے۔ اپنی نوجوانی کے دن مولانا مسیح الحق کے دارالعلوم حقانیہ میں گزارنے اور دس سالہ عرصہ جہاد میں اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو جانے والے اس شخص نے مجھے بتایا کہ وہ بیت المال میں ایک چھوٹا سا اہلکار تھا۔ جیسے ایک کلرک۔ وہ پوری محنت اور لگن سے کام

کرتا رہا۔ پھر اسے گورنر بنا دیا گیا تو بھی اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اسی شکستہ سے گھر میں رہا۔ گاڑی آجاتی تو ٹھیک ورنہ پہلے کی طرح بیساکھیاں ٹیکتا نئے دفتر چلا جاتا۔ اس نے بتایا کہ بیواؤں، یتیموں، محتاجوں اور بے کسوں کی دستگیری بیت المال کی پہلی ترجیح تھی۔ ایک ایک پائی کا حساب رکھا جاتا تھا۔ اس کی تنخواہ نہ پہلے مقرر تھی نہ گورنر بننے کے بعد۔ اس کے جواں سال بیٹے دن بھر مزدوری کرتے اور شام کو گھر کا چولہا جلتا۔ مہینوں بعد بیت المال کے ناظمین ملا عمر کی اجازت سے کچھ ”اعزازیہ“ عطا کر دیتے۔ امریکہ اور اس کی کولیشن نے یہ کیا غضب کیا؟ ان فرشتہ خصلت انسانوں سے بات کی جاتی۔ ان کے دلوں کی دھڑکنیں سنی جاتیں۔ اپنائیت کے ساتھ ان کے خدشات کا ازالہ کیا جاتا۔ محبت کے ساتھ افغانستان کی تعمیر نو کے لئے ان کی معاونت کی جاتی۔ افغانستان کو راکھ کا ڈھیر بنانے اور بے پناہ خوبیوں کے مالک طالبان کے خون سے ہولی کھیلنے کے لئے ”کولیشن“ بنانے کی بجائے ان کی مدد کے لئے ایک کولیشن وجود میں آجاتی تو کتنا اچھا ہوتا؟

لیکن کہاں کا افغانستان اور کہاں کی تعمیر نو؟ اہداف تو تھے ہی کچھ اور ملا عمر کے ایک افغانستان کو بتیس افغانستانوں میں بانٹنے اور کابل کے میٹر، حامد کرزئی کو سرکس کے جوکر کی طرح تماشا گاہ کے بیچوں بیچ کھڑا کر دینے والوں کو تاریخ کیسے معاف کرے گی؟

لیکن مسئلہ ملا عمر کا ہے نہ حامد کرزئی کا، مسئلہ تو اس دینی غیرت و حمیت کا ہے جس کا علاج ”ملا“ کی بے دخلی کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

[29-03-2002]

سنہری بالوں، گلابی گالوں اور شہابی آنکھوں کے نام

امریکہ سے بھائی اسرار احمد کسانہ بعض اوقات ایسی باتیں لکھ بھیجتے ہیں کہ ہم خستہ جانوں کے زخم پھر سے انگاروں کی طرح سلگنے لگتے ہیں۔

سنہری بالوں والی آٹھ سالہ معصوم بچی ”ایوبی“ افغانستان میں ایک کچے گھر دندوں والے چھوٹے سے گاؤں سے کبھی باہر نہیں نکلی تھی۔ اس نے آٹھ سال پہاڑوں کے پتھروں، نیزھی میڑھی پگڈنڈیوں، روکھے سوکھے کھیتوں اور چمکیلی دھوپ کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ وہ اس گاؤں سے باہر کسی قصبے یا کسی شہر تک بھی جائے گی۔ اس نے تو کبھی لاری کا سفر بھی نہیں کیا تھا لیکن آج وہ نہ جانے کس برق رفتار طیارے پر سوار ہو کر امریکہ پہنچ چکی ہے۔ علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شاہان والا تبار کے دیس میں۔ روشنیوں اور رنگوں کی اس طلسماتی نگری میں جہاں اخلاقیات کے غنچے پھوٹتے، تہذیب کے شاداب شجر لہلہاتے، انسانی شرف و فضیلت کے لالہ و گل بہاریں دکھاتے اور دانش و حکمت کے آفتاب و مہتاب نورانی کر نیں بکھیرتے ہیں۔ ”ایوبی“ نے امریکہ کا نام ابھی چند ہی ماہ پہلے سنا تھا اور اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی جن بھوت یا آسب ہے جو پہاڑوں پر دھرے دیو قامت سیاہ پتھروں کی اوٹ سے اچانک نمودار ہوتا، آگ اور بارود برساتا، بستیوں کو زناکھ کرتا، انسانوں کے پر نچے اڑاتا آن کی آن میں غائب ہو جاتا ہے۔

دو تین ماہ قبل یہ جن اس کی بستی میں بھی گھس آیا۔ اس کا باپ اس کی آنکھوں کے سامنے خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ایوبی سہم کر کسی کونے میں چھپ گئی۔ قیامت تھی تو وہ روتی بلکتی فریاد کرتی اپنی ماں کی تلاش میں نکلی۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ اس نے سوچا کہ یقیناً اسے جن اٹھا کر لے گیا ہے۔ اسے اور اس کے چھوٹے بھائی کو قریبی رشتہ دار گھر لے آئے۔ ننھے بھائی کو ایک ایسے یتیم خانے میں ڈال دیا گیا جو خود یتیمی کی دھوپ میں مجلس رہا تھا۔ کھانے پینے کو کچھ نہ ملا تو کچھ ہی دنوں

بعد وہ مر گیا۔ پھر یہ سب لوگ نہ جانے کس عقوبت خانے میں پہنچا دیئے گئے۔ سنہری بالوں والی لڑکی اپنے سامنے اپنی رشتہ دار لڑکیوں کی عزتیں لٹتے دیکھتی رہی۔ خود اس پر کیا گزری؟ وہ کچھ نہیں بتاتی۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا ایک ہاتھ کیسے کٹ گیا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ اس کے دوسرے ہاتھ کے ناخن کس طرح کھینچ لئے گئے۔ وہ اپنے جسم پر پڑی لاتعداد خراشوں اور سیاہ پڑتے ”نیلوں“ کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتاتی۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ تہذیب و تمدن کی کس جنت ارضی تک آن پہنچی اور کس ”قاضی الحاجات“ کی بارگاہ میں کھڑی ہے۔ اسے یہ بھی خبر نہیں کہ وہ کچھ بھی خرچ کئے بغیر جس سرزمین مقدس تک آگئی ہے، اس کی ”خاک پاک“ کو بوسہ دینے کے لئے کتنے اہل پاکستان عمر بھر آرزو کی آتش خاموش میں سلگتے اور امریکی تو نصل خانوں کے طواف کرتے رہتے ہیں۔

سنہری بالوں والی ایوبی کے ساتھ گلابی گالوں والی بارہ سالہ نیبلہ بھی امریکہ پہنچ گئی ہے۔ اس کا باپ بھی امریکی انصاف کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مرنے سے قبل اسے اپنی بیٹیوں اور بیوی کی آبروریزی کے دلدوز مناظر دیکھنے پر مجبور کیا گیا۔ نیبلہ خود سو دوزیاں سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ ان کے ساتھ ایک آٹھ سالہ بچی رقیہ بھی ہے جس کے ماں باپ افغانستان کے غارت گرد جن کالقمہ بن چکے ہیں۔ اس کا ایک بھائی امریکی میزائل کی نذر ہو گیا۔ دوسرا زخمی ہوا اور چند دن بعد چل بسا۔ رقیہ ساعت سے محروم ہو چکی ہے۔ شدید سردی میں کئی دن پڑے رہنے کے باعث اس کے دونوں پاؤں بھی مڑ گئے ہیں۔

بتایا گیا ہے کہ 1529 افغان خواتین، نو عمر بچیوں اور بچوں پر مشتمل یہ قافلہ امریکہ پہنچا ہے۔ ان میں 217 یتیم بچے اور بچیاں شامل ہیں جن کی عمریں چھ سے چودہ سال تک ہیں۔ ان کی نیلامی کا عمل شروع ہونے کو ہے۔ ”گود لینے“ کے نام پر انہیں اپنے گھروں کی کنیریں، لونڈیاں اور غلام بنانے کے لئے یہودیوں اور عیسائیوں کی قطاریں لگی ہیں۔

پتہ نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ ہم کہاں کھڑے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟ پھری ہوئی آندھیاں ہمارا سب کچھ اڑائے لے جا رہی ہیں اور ہم جھروکوں میں بیٹھے موسم کا مزالے رہے ہیں۔ امریکی کولیشن کا حصہ بننے وقت ہم نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ افغانستان سفاک سفید قام درندوں کی چراگاہ بن جائے۔ ہم نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ ایف بی آئی، امریکی ایجنسیاں اور ان کے اہلکار

ہمارے گھروں پر چھاپے مارتے پھریں؟ فیصل آباد میں جو کچھ ہوا، اس سے لوگ خفا ہیں۔ ہمارے ذمہ داروں نے تقریباً تمام خبر رساں ایجنسیوں اور اخبارات کی اس خبر کی تردید کی کہ آپریشن میں امریکی بھی شامل تھے لیکن جنرل ٹومی فرینکس نے واضح الفاظ میں تصدیق کر دی ہے۔ اس سے قبل اسلام آباد چرچ کے حادثے کے بعد ایف بی آئی نے جائے واردات اور ہسپتالوں میں جو کچھ کیا اس کی تصاویر چھپ چکی ہیں۔

اہل پاکستان پر جو قیامت ٹوٹی اس کا تصور بھی محال ہے۔ اقبال اور قائد اعظم کا دیس جس طرح بازو بچا اطفال بنا دیا گیا، وہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ 11 ستمبر سے ایک دن قبل ہوش و حواس کھو بیٹھنے والا کوئی شخص آج اچانک ہوش میں آجائے اور اسے ہمارے ہوائی اڈوں، ہماری تنصیبات، ہمارے انٹیلیجنس نیٹ ورک اور ہمارے روزمرہ کے معاملات امن وامان میں امریکہ کے عمل دخل کی خبر دی جائے تو وہ اسے ڈراؤنا خواب سمجھ کر دوبارہ بیہوش ہو جائے گا۔ ہم تو ایک لٹا پٹا قافلہ بن چکے ہیں۔ جس کے ہر مسافر کا بدن زخموں سے چور ہے اور ہر آنکھ سے جوئے خون بہہ رہی ہے۔

برادر ام اسرار کسانہ سے گزارش ہے کہ وہ ایوبی، نیبلہ اور رقیہ کے لئے کچھ کر سکتے ہیں تو کر لیں۔ ہمیں پریشان نہ کریں۔ وہ تو افغانستان سے اٹھائی گئی ہیں۔ یہاں ہوتیں تو ہم کیا کر لیتے۔ ہم اب ان الجھنوں سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ ہم زرمبادلہ کے بڑھتے ہوئے ذخائر، ڈالروں کی رم جھم، اصلاحات کے تسلسل، ریفرنڈم کے خواب آگئیں تصور اور انتخابات کے ذریعے وجود میں آنے والی عظیم الشان قیادت کی توقعات کی لوریاں دے کر اپنے اعصاب کو سکون دینے کی کوشش میں ہیں۔ سنہری بالوں، گلابی گالوں اور شہابی آنکھوں والی بچیوں کا اللہ نگہبان۔

[31-03-2002]

شہادت کا انتظار

فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے کیا نام دیا جائے؟ بے شمار جہتیں اور لاتعداد زوایے رکھنے والے اس سانچے کی بنیاد پر وہی بغض، وہی عداوت، وہی نفرت، وہی عناد اور وہی کدورت کا فرما ہے جسے تہذیبوں کی کشمکش کا نام دیا جاتا ہے اور کبھی نظر پاتی تصادم کا۔ دوہرے معیار اور دو غلے کردار کے مکروہ جال میں جکڑی ہوئی غیر مسلم دنیا امریکہ کی قیادت میں اقوام متحدہ کی معاونت کے ساتھ ایک خوں آشام کھیل میں مصروف ہے۔ رملہ کی کہانی، تورابورا کی داستان کا ذرا بدلا ہوا اسلوب ہے جہاں فلسطینی اتھارٹی کے صدر یاسر عرفات محصور ہو چکے ہیں۔ شہر کوفوجی زون قرار دے دیا گیا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن سٹیشن پر اسرائیلی قابض ہیں۔ ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں یاسر عرفات کے ہیڈ کوارٹرز کو روند رہی ہیں۔ آنسو گیس کی مسلسل شیلنگ ہو رہی ہے۔ عمارت کی بجلی اور پانی بند ہے۔ باہر کی دنیا سے رابطے منقطع ہیں۔ کرفیوزہ شہر دھماکوں سے گونج رہا ہے۔ گھر گھر تلاشی لی جا رہی ہے۔ سولہ سے چالیس سال تک کی عمر کے تمام لوگ گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ ایک عمارت میں پناہ لینے والے سیکورٹی کے تیس اہلکاروں کو ذبح کر دیا گیا۔ نابلس اور کئی دوسرے مقبوضہ شہروں میں بھی قتل عام جاری ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ اسرائیلی فوج یاسر عرفات کے کمروں تک پہنچ گئی ہے اور حفاظتی دستوں سے اس کی چھڑ پیں ہو رہی ہیں۔ اسرائیلیوں نے دروازے توڑ کر یاسر عرفات کے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ اسرائیلی حکومت کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد یاسر عرفات کو ہلاک کرنا نہیں، صرف ”ہتھیار“ ڈالنے پر مجبور کرنا ہے۔ حالات پر نظر رکھنے والوں کا خیال ہے کہ اسرائیل نے حتمی طور پر طے کر لیا ہے کہ یاسر عرفات کو ماتھار گڑنے اور کلفنی جھکانے پر مجبور کر دیا جائے اور اپنی عسکری برتری کی دھاک بٹھانے کے بعد اپنی مرضی کا حل مسلط کر دیا جائے۔ دو کمروں میں اسیر یاسر عرفات نے اپنے کپکپاتے ہاتھوں میں پستول لہراتے ہوئے کہا ہے کہ ”جو لوگ میرے ہتھیار

ڈالنے کے انتظار میں ہیں وہ یاسر عرفات کو نہیں جانتے۔ میں مر جاؤں گا لیکن ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔“ ادھر یہ خدشہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ کسی بھی لمحے، کوئی آوارہ گولی یاسر عرفات کے سینے میں اتر سکتی ہے۔ اسے خودکشی یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور ڈرامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

کابل، قندھار اور سری نگر سے رملہ تک پھیلی خون میں لت پت درود یوار کی یہ خونچکان حکایت جانے کب ختم ہوگی۔ اس حکایت سے بھی زیادہ بڑا المیہ یہ ہے کہ دہشت گردی کے خاتمے کے لئے عالمی کولیشن کی امامت کرنے والا امریکہ معتبر ہے اور ادنیٰ ترین معیار انسانیت سے بھی گرا ہوا کردار و عمل رکھنے کے باوجود پیشوائے تہذیب و مبلغ اخلاقیات بنا بیٹھا ہے۔ اس کا ٹیلی فون افلاک کی بلندیوں سے اترنے والے پیغام کی طرح مقدس، اس کا بلاوا، آرزوئے وصل کی معراج، اس کا مصافحہ خوش بختی کا نقطہ کمال اور اس کے دسترخوان کا نوالہ جنت کے میووں سے لذیذ تر۔ امریکہ کی پسلی سے پیدا ہونے اور اس کی آغوش میں پروان چڑھنے والے اسرائیل نے سفاکی اور بربریت کا بازار گرم کر رکھا ہے جس کی نظیر امریکہ اور بھارت جیسی ”عظیم جمہوریتوں“ کے سوا کہیں اور نہیں ملتی۔ ایریل شیرون کے ہاتھوں سے ابھی تک صابرہ اور شتیلہ کے شہیدوں کا لہو ٹپک رہا ہے۔ اس کی مسلمہ دہشت گردی کی شرمناک کہانیاں دنیا بھر کے پریس کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ مظلوموں کا لہو کھولتا ہے اور گلاب جیسے چہروں والی معصوم بچیاں اپنے پھول جیسے جسموں کے ساتھ ہم باندھ کر ظالم سے انتقام لیتی ہیں تو اسے ”دہشت گردی“ کا نام دیا جاتا ہے۔ جارج بش کہتا ہے کہ ”ابھی یاسر عرفات کو اور بہت کچھ کرنا ہے۔ اسرائیل اپنی سلامتی کے لئے جو کچھ کر رہا ہے اس میں پوری طرح حق بجانب ہے۔“

کولن پاول برہنہ جارحیت اور عریاں دہشت گردی کی وارداتوں کی مذمت سے انکار کر دیتا ہے اور تسلی دیتا ہے کہ ”اسرائیل یاسر عرفات کو قتل نہیں کرے گا۔“ اقوام متحدہ، امریکہ کی خواب گاہوں کی جاروب کشی کرنے والی کینر بن چکی ہے اور رقص ابلیسی دیکھتے ہوئے بھی اس کا چارٹر جھر جھری تک نہیں لیتا۔ عرب لیگ، یو۔ن۔ا۔ کے گھر چلی گئی۔ اسلامی کانفرنس جائزہ لے رہی ہے۔ پاکستان، جو کبھی مسلم مفادات کے ہراول دستے کا سالار تھا، اب ”مرد بیمار“ کی طرح اپنے آزار میں مبتلا، اپنی چوٹیں سہارا رہا ہے۔

یاسر عرفات نے کیا کچھ نہیں کیا؟ امریکہ کی دلداری اور اسرائیل کے خیر خواہوں کی خوشنودی

کے لئے کیسے کیسے معاہدوں پر دستخط کئے، کیسی کیسی پسپائی قبول کی۔ کیسی کیسی مفاہمتوں اور مصلحتوں سے سمجھوتہ کیا لیکن لا حاصلی کے اس لیے سفر کا انجام یہ ہے کہ وہ توپوں کی گھن گرج سے لرزتے دو کمروں میں بند، شہادت کا انتظار کر رہے ہیں۔

شہادت کے انتظار سے میرا دھیان پھر قندھار کے مرد جبری کی طرف نکل گیا ہے جس کا نام ملا محمد عمر ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر وہ بھی ہماری نصیبتیں مان کر مفاہمتوں، مصلحتوں، معاہدوں، مصافحوں، معافوں، ملاقاتوں اور مدارتوں کی راہ پر چل پڑتا تو کیا ہوتا؟ یقیناً ایک نہ ایک دن وہ شہادت کی منزل مراد تک پہنچ جاتا۔ ہاں ممکن ہے اس کا عرصہ حیات کچھ طویل ہو جاتا۔ وہ کچھ وقت کے لئے کابل کی اتھارٹی کا صدر بن جاتا لیکن امریکہ کی کرسی صدارت پر بیٹھا کوئی ”بش“ مسلسل یہی کہتا رہتا ”ابھی ملا عمر کو اور بہت کچھ کرنا ہے“ اور پھر کسی دن ملا عمر کا اقتدار قندھار کے تنگ و تاریک حجرے تک محدود ہو جاتا اور وہ انہونی کو سامنے کی دیوار پر لکھا دیکھ کر کہتا ”میں شہید ہونے کے لئے تیار ہوں۔“

بہت کچھ کرنے والوں کو بھی، کچھ نہ کرنے والے نافرمان لوگوں کے انجام سے ہی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ازل سے ابد تک کی وسعتوں پر محیط معرکہ یتیم کا یہی سبق ہے۔ کچھ کرنے والوں پر، اور بہت کچھ کرنے کے تازیانے برستے رہتے ہیں۔ کچھ نہ کرنے اور ظالم کی رعوت کا تسخراڑانے والے ان تازیانوں کے آزار سے محفوظ رہتے ہیں۔ شہادت تو آتی ہی ہے۔

[02-04-2002]

ہچکیوں اور سسکیوں کا دیس

جس وقت امریکی سینیٹر، رابرٹ ٹوریلی (Robert Torricelli) اور سینیٹر جان کورزائن (Jon Corozine) کابل میں امریکی سفارت خانے کے احاطے میں، خاردار تاروں کے اس طرف، ریت کی بوریوں کے عقب سے جھانکتی فولادی نالیوں کے پہلو میں کھڑے، سفارتی عملے سے ”فتح افغانستان“ کے روشن پہلوؤں پر اظہار خیال کر رہے تھے، تیس سالہ افغان خاتون اپنے دبلے پتلے مریل سے بچے کو بغل میں لئے، سفارت خانے سے باہر کھڑی زار و قطار رو رہی تھی۔ آہنی گیٹ پر مستعدی سے ایستادہ گورے امریکی گارڈز کی بندوقین تقریباً دو درجن افغانیوں کا نشانہ لئے ہوئے تھیں جن میں ”عرفہ“ نامی افغان خاتون بھی شامل تھی۔ ملامحمد عمر کا تختہ الٹ جانے اور افغانستان میں حامد کرزئی کی روشن خیال حکومت قائم ہو جانے کے باوجود عرفہ نے اپنے چہرے سمیت پورا بدن نیلے رنگ کے برقعے میں چھپا رکھا تھا۔ برقعے کا رنگ اڑچکا تھا اور اس پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ ننھا بچہ بھوک سے ہلک رہا تھا اور آہ و بکا کرتی ماں کے پاس اسے چپ کرانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ عرفہ کے چار اور بچے اس کے ساتھ نہیں آئے تھے۔ ان بچوں کو بھوک اور پیاس کی اذیت کا سامنا بھی نہیں تھا کیونکہ امریکی بمباری کے باعث وہ چاروں ایک ہی رات، ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالنے لہی نیند سو گئے تھے۔ عرفہ کا شوہر بھی اسی رات زندگی کے آزار سے آزاد ہو گیا تھا۔ تین قرینی عزیز، جو عرفہ کے آنسو پونچھ سکتے یا کم از کم اس کے ساتھ مل کر گریہ کر سکتے تھے، امریکی قہر کا لقمہ بن چکے تھے۔ عرفہ روئے جا رہی تھی اور پتھر جیسے چہروں دا کے گورے گارڈس مکرارہے تھے۔

عرفہ سے ذرا ہٹ کر چونتیس سالہ رحمت اللہ، کشتلووں کی طرح پھیلی آنکھیں لئے خاردار تاروں کو گھورے چار ہاتھا۔ کبھی وہ ایک خوشحال شخص تھا۔ اپنے بیٹے احسان اللہ کو اچھی تعلیم دلانا اس کی پہلی ترجیح تھی۔ وہ طالبان کے دور میں منی چیئرمین کا کام کرتا تھا۔ اکتوبر کی ایک روشن صبح احسان

اللہ بستے لئے سکول جارہا تھا کہ قریب ہی ایک امریکی بم گرا۔ بم کے آوارہ کھڑے اسے شدید زخمی کر گئے۔ وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا اور رحمت اللہ کو یوں لگا جیسے سورج نکلنے ہی سیاہ رات سر پر آکھڑی ہوئی ہو۔ اس نے اپنے بچے کا علاج شروع کر لیا۔ تین ماہ وہ ایک مقامی ہسپتال میں زیر علاج رہا۔ نو عمر بچے کی معذوری کا گہرا گھاؤ اسے کسی آن چینین نہ لینے دیتا۔ تب اس نے سب کچھ بیچ ڈالا اور احسان اللہ کو جرنی لے گیا۔ دو ماہ جرنی میں علاج ہوتا رہا۔ رحمت اللہ نے کم و بیش پانچ لاکھ روپے لگا دیئے لیکن بچے کی معذوری نہ گئی۔ کچھ دن قبل اسے کسی نے بتایا کہ امریکہ سے کچھ صاحب لوگ حالیہ حملوں سے متاثر ہونے والوں کی امداد کرنے آرہے ہیں۔ وہ اپنا دکھڑا سنانے سفارت خانے کے سامنے آکھڑا ہوا۔ وہ چیخ رہا تھا اور اس کا دکھڑا بوسیدہ کپڑے کی طرح خاردار تاروں سے الجھ کر دھجیاں ہو رہا تھا۔ ”میں بھیک نہیں مانگتا۔ تم ہمارے بچے واپس نہیں دے سکتے۔ ہمارے بچوں کے کٹے پھٹے اعضاء واپس نہیں دے سکتے۔ ہم تم سے کچھ نہیں مانگتے لیکن ہمارے بچوں کے علاج کا خرچہ تو ہمیں دے دو۔“

www.KitaboSunnat.com

رحمت اللہ کے قریب ہی ایک بیچپن سالہ ڈرائیور حاجی زمان چپ چاپ کھڑا ہجوم میں کسی کھو جانے والے کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جستجو اور بے خوابی، انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ بیچپن سال پہلے اس کے ہاں بیٹے نے جنم لیا تھا۔ اس نے بڑی محنتوں سے اسے پالا، جوان کیا۔ اب وہ اس کا رفیق، اس کا دوست، اس کا دست و بازو تھا۔ بیچپن سالہ حاجی زمان کی ادھیڑ عمری، بیچپن سالہ جوان بیٹے کے سہارے محنت و مشقت اور رزق حلال کی برکتیں سمیٹ رہی تھی۔ ایک دن وہ معمول کے مطابق اپنا ٹینکر لئے کابل سے قندھار جا رہا تھا کہ اچانک امریکی طیاروں نے آیا۔ حاجی کو بس اتنا یاد ہے کہ اس کے جوان بیٹے کے پر نچے اڑ گئے تھے۔ تب سے حاجی زمان بہت بدل گیا ہے۔ وہ رو دتا ہے نہ سوتا ہے۔ ہفتے میں ایک بار وہ ٹھوکریں کھاتا اس امید پر غزنی سے کابل آتا ہے کہ شاید امریکی امداد آن پہنچی ہو اور بٹش کے قہر و غضب کا لقمہ بننے والوں کی مالی اعانت کی کوئی سہیل نکل آئی ہو۔ اسے کنبے کے دس افراد اور اپنے ننھے منے پوتے کو پالنا ہے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں اخباری رپورٹروں سے کہا ”یہاں تو کوئی سفارتخانے کے دروازے پر آکر ہم سے بات بھی نہیں کرتا۔ اگر انہوں نے کچھ نہیں کرنا تو بتاؤ دیں۔ میں لاریوں کے کرائے بھرنے کے بجائے ان پیسوں سے اپنے پوتے کے لئے دودھ ہی خرید لوں۔ میرا شہید بیٹا کیا

سوچتا ہوگا۔“

افغانستان کو بدترین غارت گری کا نشانہ بنانے والا امریکہ ”فتح“ کے نشے سے سرشار ہے۔ کابل کے دورے پر آئے امریکی سینئروں کے پاس افغانوں سے ملنے کے لئے وقت نہیں۔ آسودہ اور کامران ہشن کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ملا محمد عمر پس منظر میں چلا گیا اور کابل پر حامد کرزئی نامی ”ٹیسٹ ٹیوب بے بی“ کی حکومت ہے۔ سیر سپاٹوں، پارٹیوں اور تفریحات کا دلدادہ یہ کم نصیب شخص، دوسرے ممالک کے حکمرانوں کو تفریحی دوروں پر کابل آنے اور غم دنیا سے آزاد ہو کر ”ریلیکس“ کرنے کی دعوتیں دیتا ہے۔ وہ کیا جانے کہ افغانستان کی کتنی خواتین بلکتے بچوں کو لئے خس و خاشاک کی طرح سڑکوں پر رل رہی ہیں۔ سنہری بالوں اور گلابی گالوں والی کتنی افغان بچیاں امریکہ میں نیلام ہو رہی ہیں۔ کتنے بوڑھے اپنے جوان بیٹوں کی ہتھیلیں اٹھائے پھرتے ہیں اور کتنے بچے گھونٹ بھر دودھ کے لئے ایزیاں رگڑ رہے ہیں۔

امریکی ڈالر، تفریحات کے دلدادہ کرزئی اور اس جیسے چند افغان فروش وارلارڈز کی عشرت کا سامان بن رہے ہیں اور افغانستان آہوں، سسکیوں اور ہچکچوں کی چٹا میں جل رہا ہے۔
ملا محمد عمر تو ایسا پتھر دل نہ تھا۔

[05-04-2002

لاوارث لاشیں

اسلام آباد میں بڑھتی ہوئی گرمی کے باوجود زندگی کی گہما گہمی عروج پر ہے۔ بازاروں کی چہل پھل زوروں پر ہے۔ ریستورانوں کی رونقوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ پولیس کے ناکے جوں کے توں ہیں۔ جدید رنگ کی مارکیٹوں میں گاہکوں کی ریل پھیل کا وہی عالم ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کشادہ سڑکوں اور وسیع پارکوں کا یہ شہر بھولتا جا رہا ہے کہ قریب کی ایک بستی میں طالبان نامی دیوانے بستے تھے۔ اس شہر دلا زار میں تو ساتھ والے گھر کی خیر نہیں ہوتی کہ کون کس کرب میں مبتلا ہے اور کون کس آزار مسلسل کی سولی پر ہنگامہ عمر کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ شاید میں بھی اس شہر ناپرساں کی بوباس میں رنج بس گیا ہوں اور بھولتا جا رہا ہوں کہ حد نظر سے اس پار میری جان پہچان کے کچھ لوگوں کا بسیرا تھا۔ کوئٹہ سے کچھ دور، چمن سے ذرا آگے، حسین بولدک نامی بستی کے پہلو سے گزرتی ٹوٹی پھوٹی شاہراہ مجھے قدحار نامی جس لٹے نئے شہر میں لے گئی تھی وہاں لمبی قبائلوں، بھاری پکڑیوں اور گھنی داڑھیوں والے کچھ پراسرار بندوں کے ساتھ میں نے کئی دن گزارے تھے۔ وہاں میں نے ڈاکٹر نجیب اللہ کی متروک سرکاری رہائش گاہ کے ایک کشادہ کمرے میں اس عہد کے ایک مرد جری سے ملاقات کی تھی جس کا نام ملا محمد عمر تھا۔ میں بھولتا جا رہا ہوں کہ دریائے ارغنداب کے کنارے انکور کے باغات کے پہلو میں جب ڈوبتے سورج کی شفق سرمئی شام کے طلحے اندھیروں میں تحلیل ہو رہی تھی تو ہم نے ٹھنڈی، گھاس پر بیٹھ کر اس مرد درویش کی صحبت میں چند ساعتیں گزاری تھیں۔ تب اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تھے اور وہ اٹھے ہوئے ہاتھ آج بھی ملکوتی تصویر کی طرح میری آنکھوں میں نقش ہیں۔

لیکن کیا میں اپنے دل کی ایک ایک دھڑکن میں بسے دلداروں اور خیال کی ایک ایک رو میں مہکتے یارانِ خوش جمال کو بھولتا جا رہا ہوں؟ زندگی کتنی ظالم ہے کہ جابر حکمران کی طرح ایک ایک لمحے کو تازیانہ بنا کر برسائے لگتی ہے اور انسان ان مہمانانِ عزیز کو بھی بھول جاتا ہے جو گھر کے

کسی کمرے میں کب سے منتظر بیٹھے ہوتے ہیں۔

گزشتہ ہفتے مجھے جواں سال مفتی محمد عثمان کا محبت بھرا اصرار چچہ وطنی لے گیا۔ مفتی صاحب نے ایک ایسے مدرسے کی بنیاد ڈالی ہے جس میں مروجہ علوم و فنون کو اسلامی سانچے میں ڈھال کر، خالص دینی فکر و احساس سے آراستہ طلباء و طالبات تیار کرنے کا اچھوتا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ انگلش میڈیم ذریعہ تعلیم کے ساتھ انہوں نے ایک عمدہ نصاب کا انتخاب کیا ہے اور اسلامی تعلیمات و اقدار کو بڑی عمدگی سے تربیت کی مرکزی روح بنا دیا ہے۔ مفتی صاحب نے ”نظام تعلیم پر مغربی تہذیب کے اثرات“ کے عنوان سے ایک سیمینار کا اہتمام کر رکھا تھا جس میں مجھے بھی دعوت خطاب دی گئی تھی۔ مدرسے کے وسیع و عریض لان میں چچہ وطنی کے نمائندہ شہریوں کے بڑے اجتماع نے مجھے جو محبت دی، جس تعلق خاطر اور جس قلبی وابستگی کا مظاہرہ کیا، میں اس کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔

تقریب کے بعد ان کی محبتیں بے کراں ہو گئیں۔ ان کی باتوں، ان کے تبصروں، ان کی دعاؤں، ان کے مصافحوں اور ان کے معانقوں میں میری ذات کا کوئی حوالہ نہ تھا صرف اس رشتے کا عکس تھا جو میرے قلم اور دشتِ بے اماں کو لہو دینے والے طالبان کے درمیان استوار ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے افغانستان کی شام غربیاں چچہ وطنی کی اس رنگارنگ تقریب پر غالب آ گئی ہے۔ میں سفید ریش بزرگوں اور جواں سال کسانوں کی آنکھوں سے برستے آنسوؤں کو سمیٹتا بھیڑ سے راستہ بنانے کی کوشش کرتا رہا۔

رات کی اولیس ساعتوں میں چچہ وطنی سے لاہور آتے ہوئے میں سوچتا رہا۔ کیا میں انہیں بھولتا جا رہا ہوں جنہیں چچہ وطنی جیسے چھوٹے سے قصبے کے عوام نے سینے سے لگا رکھا ہے؟ اب ایک اور خبر تیز نو لاد دی برے کی طرح میرے دل میں مسلسل چھید کئے دے رہی ہے۔ وہ سخت کوش جو امریکی انصاف کی بھٹی کا ایندھن ہو گئے، اب ان کی قبریں بھی ادھیڑی جا رہی ہیں۔ ان کی ہڈیوں کو نکال نکال کر باہر ڈھیر کیا جا رہا ہے۔ کیمیائی تجربے کے لئے ان کے نمونے حاصل کئے جا رہے ہیں تاکہ پتہ چلایا جاسکے کہ اس میں کوئی اسامہ کوئی ملا عمر تو نہ تھا؟

کینیڈا کے چار سو فوجیوں اور امریکی ماہرین نے شمالی افغانستان میں تو رابورا کے پہاڑوں کو بارود بھر کر اڑایا تو پتھروں اور مٹی کے ساتھ ساتھ سرنگوں اور غاروں میں پڑی انسانی لاشوں کے

اعضاء بھی فضاؤں میں دور دور تک بکھر گئے۔ نواح میں واقع ایک چھوٹے سے قبرستان کو ادھیڑ ڈالا گیا۔ امریکی اٹیلی جنس نے رپورٹ دی تھی کہ پاکستان سے ایک بوڑھا شخص بڑی مصیبتیں اٹھا کر یہاں دعا مانگنے آیا تھا۔ یقیناً یہاں کوئی بڑی شخصیت دفن ہے۔ سب سے پہلے اس قبر کو ادھیڑا گیا جو زیادہ ”بنی سنوری“ تھی۔ پھر بائیس مزید مشکوک قبروں پر کدالیں چلائی گئیں۔ کوئی لاش 6 فٹ پانچ انچ کی نہ تھی اور کوئی ایسی کھوپڑی نہ ملی جس کے بارے میں ماہرین بتاتے کہ اس کی ایک آنکھ زندگی میں ہی ضائع ہو گئی تھی۔ گلے سزے گوشت، مڑی تڑی ہڈیوں اور چغنی ہوئی کھوپڑیوں کے نمونے سمیٹ کر بہادر افواج واپس چلی گئیں۔

رات ٹہلی ویرن پر میں نے کم نصیب فرانسیسوں کی میچوں کو وطن روانہ ہوتے دیکھا جو کراچی کے بم دھماکے میں ہلاک ہو گئے تھے۔ میرا مذہب ایک انسان کی ہلاکت کو پوری انسانیت کی ہلاکت کہتا ہے۔ قومی پرچموں میں لپٹے آہستہ آہستہ تابوتوں کو پورے احترام اور احتشام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ پاک نبوی کے چاق و چوبند دستوں نے سلامی دی۔ ان تابوتوں کو فرانس میں بھی اسی عزت و وقار کے ساتھ وصول کیا جائے گا۔ دیار غیر میں جانیں ہار دینے والوں کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بچے بین کریں گے۔ ان کے لئے خوبصورت قبریں اور یادگار کتبے تیار ہوں گے۔ لیکن تو راہورا کے غاروں میں بارود سے اڑائی جانے والی لاشوں کے والی وارث کہاں ہیں؟ دس ہزار فٹ بلند پہاڑوں پر پڑے گوشت کے ٹوٹھڑے کس مخلوق کے ہیں؟ کسی سیارے سے آنے والے ان اجنبی لوگوں سے کسی کی آشنائی نہیں۔ کوئی ایسا نہیں جو احتجاج نہیں تو کم از کم دہائی تو دے، فریاد تو کرے۔

میں دریائے ارغنداب کے کنارے، انگور کے باغات کے پہلو میں، ٹھنڈی گھاس پر بیٹھا، ملا محمد عمر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہا ہوں اور درد سے لبریز ایک بے آوازی دعا مسلسل میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

رحیم ہے تو کرے رحم ہم غریبوں پر
ہے ذوالجلال تو کھل کر جلال میں آئے

[13-05-2002]

اصل کام

جنوبی ایشیا کے امور کی نگرانی، امریکی نائب وزیر خارجہ مادام کرشینا روکا آج بھارت پہنچ رہی ہیں جہاں سے کل کسی وقت وہ پاکستان تشریف لائیں گی۔ ان کے دورے کا مقصد، بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ کے بڑھتے ہوئے خطرات کو کم کرنا بتایا جا رہا ہے۔ گزشتہ ہفتے امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے صدر پرویز مشرف اور جسٹس سنگھ سے ٹیلی فون پر بات کی اور اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔ سفارتی محاذ پر ان ”فاختائی اڑانوں“ کے ساتھ ساتھ امریکہ، آگرہ کے اس تاج محل کے عقب میں بھارت کے ساتھ مشترکہ جنگی مشقوں میں مصروف رہے جہاں جنرل مشرف نے اسن و خیر سگالی کی بے پناہ توقعات کے ساتھ محبت کی اس علامت کو خراج تحسین پیش کیا اور یادگار تصویر بنوائی تھیں۔ چالیس برس کے بعد امریکہ کے 200 کمانڈوز کو بھارت کی بری اور فضائی فوج کے ہمراہ مشترکہ تربیتی مشقوں کی ضرورت عین اس وقت محسوس ہوئی ہے جب بھارت اور پاکستان کی افواج حالت جنگ میں ”ہائی الرٹ“ کی پوزیشن میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی ہیں۔ دو ممالک برسر جنگ یا برب جنگ ہوں اور کوئی تیسرا ملک ان میں سے کسی ایک کے ساتھ مل کر جنگی مشقیں شروع کر دے تو اسے دوستوں میں شمار کرنے کے لئے کمال درجے کا اندھا پن چاہئے۔ دونوں ممالک اسی سال امریکی ریاست الاسکا کے برف پوش پہاڑوں پر بھی مشترکہ مشقوں کا پروگرام مرتب کر رہے ہیں۔ سفارتکاری کے ”فاختائی اسلوب“ کے ساتھ ساتھ بھارت کے ہمراہ مشترکہ جنگی مشقوں کا چار حانہ ”عقابانی انداز“ اہل پاکستان کے لئے ناقابل فہم ہے۔

بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے کہا ہے کہ ”ہمالیہ کے پہاڑوں سے برف پگھلتے ہی القاعدہ اور طالبان گوریلوں نے کشمیر کا رخ کر لیا ہے اور سرحد پار سے ذہشت گردی میں اضافہ ہو گیا ہے چنانچہ صدر مشرف پر دباؤ ڈالنا ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ اپنی 12 جنوری والی تقریر کو عملی جامہ

پہنائیں۔“ اسی دوران بھارت نے امریکہ اور مغربی ممالک کو پیغام دیا ہے کہ وہ پاکستان کے خلاف محدود آپریشن کا ارادہ رکھتا ہے۔ اگر کشمیر میں لائن آف کنٹرول کے اس پار سے مداخلت بند نہ ہوئی تو ایسا ایکشن بے حد ضروری ہو جائے گا۔ ”ہندوستان ٹائمز“ کی اطلاع کے مطابق بھارت نے عالمی برادری کو بتایا ہے کہ وہ لائن آف کنٹرول پار کر کے ان پہاڑی علاقوں پر حملہ کر سکتا ہے جہاں سے مداخلت ہو رہی ہے جبکہ پاکستانی کشمیر میں مجاہدین کے تربیتی کیمپوں پر فضائی حملے بھی کئے جاسکتے ہیں۔ لاہور پر قبضہ کرنے اور پاکستان کو دو حصوں میں بانٹ دینے کے مکروہ پلان کی خبریں پہلے ہی آچکی ہیں۔

ان کھلی دھمکیوں اور بے نقاب ہوتے عزائم کے پس منظر میں نئی دہلی میں امریکی سفیر رابرٹ بلیک ول نے وزیر خارجہ جسونت سنگھ، وزیر داخلہ کے ایل ایڈوانی اور قومی سلامتی کے مشیر برہیش مشرا سے ملاقاتیں کی ہیں۔ ایڈوانی کا بیان چھپا ہے کہ ”امریکہ ہمیں کچھ کہنے کے بجائے پاکستان پر دباؤ ڈالے کہ وہ سرحد پار سے بہشت گردی بند کرے۔“

ادھر امریکی اخبار ”واشنگٹن پوسٹ“ نے بھارتی موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ ”القاعدہ کے جنگجوؤں کی بڑی تعداد پاکستان آگئی ہے۔ وزیرستان کے ایک سرحدی گاؤں میں القاعدہ کے سینکڑوں گوریلے موجود ہیں جن کے خلاف ایف بی آئی اور امریکی فوج کو کھلی کارروائی کی اجازت نہیں دی جا رہی۔ لہذا اس امر کا امکان ہے کہ امریکہ از خود کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے“ لاس اینجلس کے معروف اخبار ”کریچین سائنس مانیٹر“ کی رپورٹ کے مطابق القاعدہ کے مسلح گوریلوں کی بڑی تعداد پاکستان سمگل کی جا رہی ہے۔“ رخصت ہونے کی تیاریوں میں مصروف اسلام آباد میں امریکی سفیر وینڈی چیمبرلین نے ”نیویارک ٹائمز“ سے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ ”ایف۔ بی۔ آئی کے ایجنٹ ہفتے دو ہفتے کے لئے آنے اور چلے جانے کے بجائے مستحکم پاکستان میں قیام کریں گے۔ اب پاکستان میں امریکی سفیر کا کام محض تقریبات میں جانا اور تجزیے کرنا نہیں بلکہ صورتحال کو ”مطلوبہ شکل“ دینا اور ”اصل کام“ پر توجہ مرکوز کرنا ہوگا۔“

”اصل کام“ کیا ہے؟ اس کا پتہ چلانے کے لئے کسی بڑی ذہنی مشق، تجزیاتی دانش اور حکیمانہ فراست کی ضرورت نہیں۔ 11 ستمبر کے بعد جب ہم نے عالمی کولیشن کا ہرا دل دستہ بننے کا دلیرانہ فیصلہ کیا تھا تو دیکھنے والی آنکھوں کو نوشتہ دیوار جلی حروف میں لکھا دکھائی دینے لگا تھا۔ نو ماہ سے

جاری اس عالمی مہم کے دوران پاکستانی مفادات کو گھاس کے تئکے برابر اہمیت بھی نہیں دی گئی۔ ہم نے خود فریبی کے لئے جو اہداف مقرر کئے تھے وہ پانی پر بنے نقش ثابت ہوئے۔ ہچکیاں لیتی معیشت کی بنیادیں متحرک رکھنے کے لئے گاہے گاہے فراہم کی جانے والی آکسیجن ہی کو اپنی خودی اور خود مختاری کا معقول معاوضہ سمجھ کر ہم نے نہ صرف وفا شعاری کا سفر جاری رکھا بلکہ اپنی بے ہنری سے ”دہشت گردی کے خلاف مہم“ افغانستان سے نکل کر اپنی سرحدوں کے اندر لے آئے۔

اب امریکہ اور بھارت مشترکہ مشقیں کر رہے ہیں۔ ان کی سوچ اور عزائم بھی ایک جیسے ہیں۔ دونوں نے القاعدہ اور طالبان کے جنگجوؤں کو مشترکہ شکار قرار دے ڈالا ہے۔ دونوں متفق ہیں کہ ”دہشت گردی پھیلانے والے یہ جنگجو“ پاکستان میں جمع ہو گئے ہیں۔ دونوں یک زبان ہیں کہ صرف مشرف کو 12 جنوری کی تقریر کے مطابق مزید اقدامات کرنے چاہئیں۔ بھارت، آزاد کشمیر اور امریکہ قبائلی علاقوں میں مطلوبہ کارروائیوں کے لئے زمین ہموار کر رہا ہے۔ کشمیر کے بارے میں امریکہ کا تازہ ترین سرکاری موقف یہ سامنے آیا ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں آزادانہ انتخابات کر دینے سے مسئلہ حل ہو جائے گا!!

ہم اپنی ہتھیالیوں پر وفاؤں کے چراغ اور آنکھوں میں آس کے دیئے جلائے، امریکہ کی طرف دیکھ رہے ہیں جہاں سے کرسٹینارو کا تشریف لایا جاہتی ہیں۔ 11 ستمبر کے بعد سے چونکہ اعلیٰ امریکی عہدیدار بھارت آچکے ہیں۔ عمر بھر سراہوں کا تعاقب کرنے اور خوابوں کی چھتیں بسانے والے ہم سادہ و معصوم لوگ ابھی تک نہیں جان سکے کہ وہ ”اصل کام“ کیا ہے جس کے لئے امریکہ اس صدی کا سب سے بڑا نالک رچا رہا ہے۔

ہمیں اپنے ”اصل کام“ سے فرصت ملے تو کسی اور طرف بھی دیکھیں۔

[14-05-2002]

امریکہ کی یاد دہانی

امریکہ نے کہہ دیا ہے کہ ”بھارت سے جنگ کی صورت میں پاکستان کو خود ہی اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہوگا۔“ امریکی وزارت خارجہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے پوچھا گیا کہ دہشت گردی کے خلاف حالیہ جنگ میں پاکستان نے کھل کر امریکہ کا ساتھ دیا ہے۔ اب اگر بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جاتی ہے تو کیا امریکہ اپنے اتحادی، پاکستان کا ساتھ دے گا؟ جواب آیا کہ: ”Pakistan needs to look its interests“ (پاکستان کو اپنے مفادات کا خود ہی تحفظ کرنا ہوگا۔) معلوم نہیں امریکی عہدیدار کو اس حقیقت کشائی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تاہم اس یاد دہانی کا شکریہ ادا نہ کرنا ناشکری ہوگی۔

وہ اندھا موذ قریب آ گیا ہے جس سے بچنے کے لئے ہم کئی ماہ سے خود اپنے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ صحرا کی سلگتی ریت سے شبنم کشید کرنے اور جبر ناروا کے بوجھ تلے سسکتے ہوئے، اپنے اہداف کے نعرے لگانے کا طلسم ٹوٹنے کو ہے۔ طلسم تو کئی بار ٹوٹ چکا ہے۔ ہماری خواب دیکھتی آنکھیں کئی بار نامطلوب تعبیروں کی کرچیوں سے زخمی ہو چکی ہیں۔ دل کئی بار ”دوستوں“ کی بے زخمی کے گھاؤ کھا چکے ہیں لیکن آنکھیں ہیں کہ خواب دیکھنے سے باز نہیں آتیں اور دل ہے کہ کوئے ملامت کے طواف کے بغیر چین ہی نہیں پاتا۔

ہم نے گیارہ ستمبر کی شب امریکی عتاب کے خوف سے نڈھال ہو کر ایک فیصلہ کیا۔ شاید یہ کہنا مناسب ہو کہ دوسرا کوئی فیصلہ کرنے کی جسارت یا سکت نہ رکھنے کے باعث ہمارے پاس کوئی چارہ کاری نہ تھا۔ سو عالم بے چارگی میں ہم نے نامہر باں حالات کے جبر تلے سر جھکا یا۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو ہم نے جبر کے چوکھٹے میں اپنے حسن تدبیر، معاملہ فہمی اور حکمت و دانائی کا مرقع سجایا۔ پھر اس مرقعے میں سٹریٹجک اثاثوں کے تحفظ، معیشت کی بہتری اور کشمیر کا زکی مینا کاری کی پھر اس میں اس حکمت و تدبیر کے رنگ بھرے۔ پھر اس تصویر پر ”سب سے پہلے پاکستان“ کا خوبصورت

طغری سجایا اور اسے قومی گیلری میں آویزاں کر دیا۔

گزشتہ کئی ماہ سے ’فن کار اپنے دست ہنرمندی داد پار ہے تھے۔ ان کے دلائل سے یوں لگتا تھا جیسے 11 ستمبر کے واقعات الہی نعمت کے طور پر آسمانوں کی بلندیوں سے نازل ہوئے جن کا مقصد پاکستان کے ایٹمی اثاثوں کو قیامت تک کے لئے محفوظ بنانا، پاکستان کی معیشت کو مثالی رفعتوں سے ہمکنار کرنا اور کشمیر کا کو ایسی توانائی فراہم کرنا تھا کہ کشمیر کے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آگرے۔ پھر ہم نے نگر نگر سے آئے چھوٹے بڑے سرکاری اہلکاروں کی آمد آمد کو اپنی سفارت کاری کا اعجاز سمجھا۔ بیرونی دوروں کی دعوتوں کو اپنی قیادت اور سیادت کا بانگ مینا جانا۔ امریکی صدر کے بلاوے اور وائٹ ہاؤس میں خصوصی کھانے کو اپنے مجرہ فن کی معراج خیال کیا۔ دنیا بھر سے توصلی بیانات کا ایک طوفان اٹھ آیا۔ ہم نے اسے اپنی خدا داد صلاحیتوں کے اعتراف پر محمول کیا۔ ”سب سے پہلے پاکستان“ نامی شہکار کے نقش و نگار سنوارنے اور داد پانے کا سلسلہ جاری رہا۔ سرکاری ذرائع ابلاغ نے تاثر دیا کہ جس پاکستان کو متعدی بیماری کے مریض کی طرح الگ تھلگ پھینک دیا گیا تھا، وہ پوری طرح صحت یاب ہو گیا ہے اور عالمی برادری اس کی بلائیں لینے لگی ہے۔ محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ اب کوئی ملک ہماری جدائی کی چند گھنٹیاں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

سز پھرے لوگ دہائی دیتے رہے کہ چشم باری کی فریب کاری پر نظر رکھو لیکن عشق کی وارفتگی بے قابو رہی۔ تمہی نے ٹھنڈے دل سے یہ سوچنے کی کوشش ہی نہ کی کہ کیا بھارت کی پھرتیاں اس کی اپنی جگہ و تاز کا نتیجہ ہیں؟ کیا اس کی فوجیں امریکی اشر باد کے بغیر سرحدوں پر بیٹھی ہیں؟ کیا وہ اپنے طور پر ایک مہلک جنگ کو آواز دے رہا ہے؟ اور کیا عین حالت جنگ میں امریکہ اور بھارت کی معنی خیز مشترکہ مشقیں محض موج میلہ ہیں؟ کیا امریکہ نے بھارت کا یہ موقف تسلیم نہیں کر لیا کہ ”مقبوضہ کشمیر میں کوئی تحریک آزادی پانہیں، یہ سب پاکستان کی دہشت گردی ہے۔“ کیا بھارت نے امریکہ سے اسلحہ کی خریداری کی سب سے بڑی ڈیل نہیں کی؟ کیا اب بھی اس میں کوئی شک ہے کہ امریکہ اور بھارت اس خطے میں طویل المیعاد پارٹنر بن چکے ہیں؟ کیا یہ رست نہیں کہ آئیے دوسرے کے دباؤ کو استعمال کر کے دونوں ممالک پاکستان کو گھٹنے میکنے پر مجبور کر رہے ہیں؟

دل ہے کہ ڈوبتا جا رہا ہے۔ ماضی کے ایک ایک ورق پر امریکہ کی فریب کاری کے دھبے

پڑے ہیں اور ہم ہیں کہ آج بھی اسی کی مسیحائی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ اب کی بار ہم نے بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اتنی بھاری کہ اس کا بوجھ آنے والی کئی نسلیں محسوس کرتی رہیں گی۔ گزشتہ روز لاہور سے اسلام آباد آتے ہوئے میری ساتھ والی نشست پر بانکے جیلے کپڑوں میں ملبوس ایک طرحدار نوجوان بیٹھا تھا۔ ششہ انگریزی میں گفتگو کرنے والا یہ نوجوان خدوخال کے کسی زاویے سے ”بنیاد پرست“ نہیں لگتا تھا۔ بات چلی تو ریفرنڈم کی طرف آنکلی۔ وہ کہنے لگا۔ ”میں نے تو ووٹ ہی نہیں ڈالا۔“ میں نے بینک کے کسی اچھے عہدے پر فائز شگفتہ مزاج نوجوان سے پوچھا۔ ”کیوں؟“ وہ بولا۔ ”صرف اس لئے کہ اللہ میاں قیامت کے دن یہ نہ پوچھ لیں کہ تم نے بے گناہ طالبان کی ہلاکت میں آلہ کار بننے والوں کا ساتھ کیوں دیا تھا؟“

ہم نے واقعی بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ ایک نہ ایک دن قندھار سے قلعہ جنگلی اور قندوز سے تور ابورا تک پھیلے لہو کا ہر قطرہ ہم سے بھی ”خون بہا“ مانگے گا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس ساتی کی خدمت میں ہم نے خود اپنے لہو کے جام پیش کئے، وہ کیا کہہ رہا ہے؟

گھنا تلی کھڑی ہے۔ بجلی کڑک رہی ہے۔ ہوا میں بلا کی تندی و تیزی ہے۔ ہم صحرا کے بچوں

سچ گڑے خیمے کی دیوار سے لگے، اس کی راہ دیکھ رہے ہیں جو کہتا ہے:

”پاکستان کو اپنے مفادات کا تحفظ خود ہی کرنا ہوگا۔“

اللہ کے فضل و کرم سے چودہ کروڑ پاکستانی اس چیلنج پر پورا اٹریں گے اور پاکستان کے بدخواہوں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس مہلکت خداداد کے بیٹے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا جانتے ہیں۔ لیکن نگار خانوں میں تصویریں ٹانگنے اور اپنے دست ہنرمند کی داد پانے والے بھی تو کچھ بولیں۔

[20-05-2002]

حافظ میوہ جان وزیر شہید

جامعہ نعیمیہ لاہور میں عزت مآب امریکی سفیر مادام وینڈی جیمبرلین کی آمد اور ان کا دلپذیر خطبہ آج کی اہم خبر ہے۔ محترمہ نے فتویٰ جاری کیا ہے کہ ”اسلام تو امن کا مذہب ہے جس کا دہشت گردی سے کوئی تعلق ہوا سطر نہیں“ لیکن کسی نے ان سے نہیں پوچھا کہ اگر یہ سچ ہے اور امریکہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ دہشت گردی کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تو پھر شمال و جنوب اور شرق و غرب کے ہر گوشے کی دہشت گردی اسلام اور مسلمانوں کے کھاتے میں کیوں ڈالی جا رہی ہے؟ ہر جگہ ظلم کی چکی میں پستے ہوئے مسلمان جب ظالم کے خلاف غلیلوں اور پتھروں سے ”معرکہ آراء“ ہوتے ہیں تو انہیں ”دہشت گرد“ کہہ کر توپوں اور ٹینکوں کے دہانے پر کیوں رکھ لیا جاتا ہے؟ مہاجر کیپوں کو آتش و بارود کا نشانہ بنانے والے درندوں کو ”امن کے سفیر“ کا خطاب کیوں ملتا ہے؟ اقوام متحدہ کی قراردادوں کا مضحکہ اڑانے اور ہزاروں معصوم انسانوں کا لہو پینے والے سارے عفریت امریکہ کے یاران خاص کیوں ہیں؟ کشمیر، فلسطین، چیچنیا، بوسنیا اور افغانستان کے عوام کا خون پانی سے زیادہ ارزاں کیوں ہے؟ اگر اسلام اور دہشت گردی کا کوئی رشتہ نہیں تو امریکہ نے جن سینکڑوں تنظیموں، اداروں اور شخصیات کو دہشت گرد اور مردود قرار دے رکھا ہے، وہ سارے مسلمان کیوں ہیں؟ دنیا کی سات ایٹمی قوتوں میں سے صرف پاکستان کا ایٹم بم امریکہ کے دل میں کانٹے کی طرح کیوں کھٹکتا ہے؟

جامعہ نعیمیہ کے منتظمین یقیناً یہ سب کچھ نہیں پوچھ سکتے تھے۔ گھر آئے مہمان عزیز سے اس طرح کی باتیں پوچھی بھی نہیں جاتیں لیکن ہمارا تو سارا گھر ہی مہمان خانہ بن چکا ہے۔ ایف بی آئی، سی آئی اے، میرین، کمانڈوز، مواصلاتی انجینئرز، پائلٹ، جاسوس، سراسر اسان اور جانے کون کون؟ میں مادام کے خطبے اور مہمان عزیز کا تذکرہ تفصیل سے کرنا چاہتا تھا جو ”میزبان“ کی رگ جان پر خنجر رکھ کر مہمانی کی لذتیں سمیٹ رہے ہیں لیکن اچانک میرا کمرہ ایک پراسراری آتشیں محکمہ دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

روشنی سے بھر گیا ہے۔ فرشتوں کے پروں کی معصوم سرسراہٹ میرے چاروں طرف بکھر گئی ہے۔ ایک دس سالہ معصوم شہید کی لطیف روح مسلسل میرے دل کے درپچوں پر دستک دے رہی ہے لہذا میں ڈاکٹر سرفراز نعیمی اور مادام وینڈی جیمبر لین سے معذرت کے ساتھ افغانستان کے صوبہ پکتیا کے ایک بے آب و رنگ گاؤں میں کچے گارے سے بنے چھوٹے سے دینی مدرسے کی طرف جانا چاہتا ہوں جہاں ننھے سنے میوہ جان وزیر نے قرآن کریم حفظ کیا تھا۔

پکتیا کے گاؤں رُوح کے رہنے والے دس سالہ بچے نے گزشتہ ہفتے تین امریکی کمانڈوز ہلاک کر ڈالے۔ برٹل کے علاقے کا یہ چھوٹا سا گاؤں ملا محمد عمر اور اسامہ بن لادن سے بہت دور تھا اور کبھی طالبان یا القاعدہ کا مرکز نہیں رہا۔ گاؤں کے لوگ ”امریکی انصاف“ کی کہانیاں کئی دنوں سے سن رہے تھے اور اب وہ اپنی آنکھوں سے اس انصاف کے کل پرزوں کو علاقے میں دندنا تا دیکھنے لگے تھے۔ کچھ دن قبل امریکی کمانڈوز نے ایک مقامی دینی مدرسے پر چھاپہ مارا۔ کارروائی کے دوران قرآن کریم کا درس دینے والے ایک محترم استاد، قاری دریا خان دزیر امریکی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ اس سانحہ پر سارا علاقہ دکھ کی گہری دھند میں پلٹا رہا۔ ایک نیک انسان کی ظالمانہ ہلاکت کا غم لوگوں کو رلاتا رہا۔ قاری دریا خان کے دس سالہ ہونہار شاگرد حافظ میوہ جان نے کئی دنوں تک کھانا کھایا نہ چین کی نیند سویا۔ دو چار دن پہلے وہ اس راستے کی طرف نکل گیا جدھر سے امریکیوں کی گاڑیاں گزرا کرتی تھیں۔ اس نے ایک ہینڈ گرنیڈ اور ایک کلاشکوف اٹھائی اور راستے سے متصل ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ دور سے گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی آواز لمحہ بہ لمحہ قریب آرہی تھی۔ تب اس نے ٹیلے کی اوٹ سے دیکھا، دو موٹر سائیکلوں پر چار آدمی سوار تھے۔ تین امریکی کمانڈوز اور ایک مقامی گائیڈ۔ ان کے پیچھے ایک وگن اور ایک فوجی جیب چلی آرہی تھی۔ میوہ جان کے بدن کا سارا لہو اس کے چہرے اور بازوؤں میں سمٹ آیا۔ زد میں آتے ہی اس نے ہینڈ گرنیڈ پھینکا، کھلبلی مچ گئی۔ پھر اس نے کلاشکوف سے تابز توڑ فائرنگ کی، موٹر سائیکلوں پر سوار تین امریکی اور ایک مقامی باشندہ ڈھیر ہو گئے۔ وگن اور جیب پر سوار فوجیوں میں سے متعدد زخمی ہوئے۔ وائرلیس سپٹ چیخ اٹھے، لحوں بعد نیلی کا پٹر فضا میں بلند ہوئے۔ میوہ جان نے نکل جانا چاہا لیکن چاروں طرف سے لاقعدا گولیاں اس کے پھول جیسے جسم میں پوست ہو گئیں۔ سلگتی ہوئی ریت اس کے معصوم لہو سے لالہ رنگ ہو گئی۔ قرآن کے

نور سے معمور دل کی دھڑکنیں بیٹھ گئیں اور اس کی فرشتوں جیسی پاکیزہ روح نیلگوں فضاؤں کی طرف پرواز کر گئی جہاں اس کے استاد دریا خان وزیر کی روح اس کے استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ آسمانوں میں پرواز کرتے ہوئے ننھے شہید کی روح نے امریکی طیاروں کی ڈاریں دیکھیں جو پرے باندھے، بموں کی بوریاں بھرے اس کے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔

سر بلند ہو کر زندہ رہنے والوں کے دلوں میں کون سا آتش فشاں ہوتا ہے کہ ہر آن لاوا اٹھتا رہتا ہے۔ امریکہ نے ظلم و بربریت کا کون سا حربہ نہیں آزمایا۔ اپنے اسلحہ خانے کے کون سے ہتھیار کا تجربہ نہیں کیا لیکن عالم یہ ہے کہ دس سالہ معصوم بچہ جدید ترین ہتھیاروں سے لدے امریکی کمانڈوز کو اس طرح ڈھیر کر دیتا ہے جیسے وہ کانچ کی گولیوں سے کھیل رہا ہو۔

شکاریوں نے کوئی پرندہ، کوئی جگنو کوئی تلی تک زندہ نہیں چھوڑی لیکن مرد جبری کا افغانستان ہار ماننا دکھائی نہیں دیتا۔ جانے کہاں سے کوئی چھوٹی سی ابا تیل، ننھے سنے پر پھڑ پھڑاتی نکل آتی ہے اور یہ پیغام دے جاتی ہے کہ افغانستان کی روح حیات میں ابھی تک عزت کی موت مرنے کا جنوں باقی ہے۔ دس سالہ حافظ میوہ جان وزیر کا لہو ملا محمد عمر کے اس عزم کوئی تابانی دے گیا ہے کہ

www.KitaboSunnat.com

یہ جبین جھکتی ہے بس ایک خدا کے آگے
دوسرا کوئی خدا ہو مجھے منظور نہیں

[23-05-2002]

قندھار کے قیدی کے نام

اخبارات نے خبر دی ہے کہ اسلام آباد میں اچانک گم ہو جانے اور پھر امریکیوں کے ہتھے چڑھ جانے والے سابق افغان سفیر ملا عبدالسلام ضعیف کا سراغ مل گیا ہے۔ وہ آج کل قندھار کے ایئرپورٹ پر بنے امریکی کیمپ جیل میں ہیں۔ بتایا گیا ہے کہ ملا ضعیف کو گرفتاری کے بعد کیوبا کے سمندر میں بنے گوانٹانامو ایکسٹریٹ کیمپ میں لے جایا گیا جہاں کئی دن ان سے پوچھ گچھ کی جاتی رہی۔ طالبان قیدیوں کی پہلی بڑی کھیپ کو گوانٹانامو منتقل کرتے وقت جہازوں کی نشستوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں پر سیاہ پٹیوں سے انہیں روئی ٹھونس دی گئی تھی۔ ان کی داڑھیاں اور سر کے بال صاف کر دیئے گئے تھے۔ ان کے ہاتھ اور پاؤں آہنی زنجیروں سے باندھ دیئے گئے تھے۔ معلوم نہیں ملا عبدالسلام ضعیف کو گوانٹانامو منتقل کرتے وقت ان مہذب قریبوں کا خیال رکھا گیا یا نہیں۔ اتنی خبر تو آئی تھی کہ اسلام آباد کے گھر سے گرفتار کرتے وقت ان کی جامہ تلاشی لی گئی تھی اور ان کی عینک اتار لی گئی تھی۔ جاتے جاتے انہوں نے اپنے بچوں سے صرف اس قدر کہا تھا:

”ثابت قدم رہنا، ممکن ہے ہم دوبارہ منہ مل پائیں۔“

ایک خبر رساں انجینیئر نے بتایا ہے کہ پاکستان میں مقیم ملا ضعیف کے بچا کو اپنے بھتیجے کا ایک خط موصول ہوا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں ”میں قندھار میں امریکی فوج کے زیر حراست قید و بند کے دن گزار رہا ہوں۔ میں بالکل خیریت سے ہوں اور دعا گو رہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھی صحت سے نوازے۔ مجھے آپ کی دعاؤں کی بھی سخت ضرورت ہے۔ میرے لئے دعا کرنا کہ اللہ مجھے ایمان پر ثابت قدم رکھے۔ میرے لئے آسانیاں پیدا کرے اور مجھے مشکلات برداشت کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے۔“

ملا عبد السلام ضعیف کے چچا یقیناً اس خط کا جواب لکھ رہے ہوں گے لیکن میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں گھنجر جانے والے یار عزیز سے کچھ باتیں کروں۔ اسے تازہ ترین حالات کی خبر دوں۔ ممکن ہے میرا خط قدھار کے قیدی کے لئے وجہ تسلی بن جائے۔

”میرے اسلامی بھائی!

السلام علیکم!

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ابھی تک زندہ سلامت ہیں۔ آپ کی گرفتاری کے بعد کئی طرح کے برے برے خیالات ستارہ تھے۔ ممکن ہے آپ مجھ سے ناراض ہوں۔ شاید آپ نے سوچا ہو کہ آپ ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ملک کے سفیر کی حیثیت سے اسلام آباد میں رہے اور سفارت کے ساقط ہو جانے کے بعد بھی کچھ نہ کچھ رشتہ و تعلق باقی تھا جس کا لحاظ کیا جانا چاہئے تھا۔ آپ کا گلہ بجا سہی لیکن آپ کو پاکستان کے نقطہ نظر سے بھی ہمدردی ہونی چاہئے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی زمانے میں ہم ”جہاد اصغر“ کے علمبردار تھے اور آپ کے ساتھ مل کر روسی جارحیت کے خلاف ایک پر عزم معرکہ لڑا تھا۔ تب معاملہ ایک ”کافر سپر پاور“ کا تھا۔ اب کی بار جس سپر پاور نے آپ پر یلغار کی اسے ہم ”اہل کتاب“ میں سے خیال کرتے ہیں لہذا ہم نے اجتہاد سے کام لیتے ہوئے ”جہاد اصغر“ سے دستبرداری اور ”جہاد اکبر“ کی علمبرداری کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کے تحت ہم امریکہ کی قیادت میں لڑی جانے والی جنگ کا ہراول دستہ بن گئے۔ ہمیں معلوم ہے کہ روس سے دس سالہ جنگ میں اتنے میزائل اور بم نہیں گرے جتنے امریکہ نے گزشتہ چھ سات ماہ میں گرائے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قیامت نے کئی افغان بستیاں تاراج کر دیں اور پچیس کے لگ بھگ انسانوں کا لہو پی گئی لیکن جنگوں میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔

پیارے بھائی!

حال ہی میں ہم نے ایک سنہری اصول وضع کیا ہے جس کا عنوان ہے ”سب سے پہلے پاکستان“ اس اصول کے تحت ہم نے امریکہ کو وہ سب کچھ دے دیا جو ہماری جھولی میں تھا۔ ایسا کرتے وقت ہمارے سامنے تین بنیادی نکات تھے۔ (1) ایٹمی اثاثوں کا تحفظ (2) کشمیر کا زکی سر بلندی اور (3) معیشت کی بحالی۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے یہ تینوں مقاصد حاصل کر لئے ہیں۔ ایٹمی اثاثوں کے بارے میں ہمارے بدخواہ جو بدگمانیاں پھیلا

رہے تھے، ان کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ دنیا نے ہمیں ایک مہذب، باوقار، سنجیدہ اور باغبان ایٹمی قوت کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ جارج بش نے کہہ دیا ہے کہ ”اگر بھارت کو ایٹم بم رکھنے کا اختیار حاصل ہے تو پھر پاکستان کو بھی اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا“ ہم عالمی تنہائی کے آشوب سے نکل آئے ہیں اور دنیا کے 190 ممالک ہماری بلائیں لے رہے ہیں۔ کشمیر کا زوہاری تو قلع سے بھی کہیں پہلے منزل مراد تک پہنچ گیا ہے۔ ہم ایک عرصے سے ذہائی دے رہے تھے کہ کشمیر میں جاری تحریک، خود کشمیریوں کی منصفانہ اور مبنی برحق جدوجہد آزادی ہے جسے بھارت، مکاری سے کام لے کر پاکستان کے حمایت یافتہ شدت پسندوں کی دہشت گردی کہہ رہا ہے لیکن کوئی ہماری بات مان ہی نہیں رہا تھا۔ آپ کے خلاف عالمی مہم میں مرکزی کردار ادا کرنے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ سمیت ساری دنیا ہماری ہمنوائی کر رہی ہے اور علی الاعلان ہمارے موقف کی تائید کرتے ہوئے کہنے لگی ہے کہ کشمیر میں جاری تحریک حریت کا دہشت گردی سے کوئی واسطہ نہیں۔ پاکستان سے کوئی مداخلت کار کشمیر نہیں جا رہا۔ بھارت بلا تاخیر اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرے اور کشمیریوں کو مظالم کا نشانہ بنانے سے باز آ جائے۔ اگرچہ بھارت نے اپنی فوج ہماری سرحدوں پر لگا رکھی ہے اور ہمیں دھمکیاں دے رہا ہے لیکن عالمی برادری ہمارے ساتھ ہے۔ سارے عالمی لیڈر ہماری بانہوں میں بانہیں ڈالے بھارت کو وارننگ دے رہے ہیں کہ ”خبردار! پاکستان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھا تو تمہیں پتھر کے زمانے میں دھکیل دیں گے“ سب سے بڑی کامیابی ہمیں معیشت کے میدان میں ہوئی ہے۔ ہمارے سارے قرضے معاف ہو گئے ہیں، مہنگائی قصہ پارینہ ہو چکی ہے، نوکریاں بیروزگاروں کی تلاش میں بھٹک رہی ہیں، لوگوں کے چہرے آسودگی سے دکھنے لگے ہیں اور گھروں کے آنگن خوشیوں سے بھر گئے ہیں۔

میں نے چھ سال پہلے اسی قندھار میں آپ کے بڑوں سے سنا تھا کہ ”ہم پاکستان کے لئے اپنی جانیں بھی لڑا دیں گے“ اگر کچھ شہروں کی غارت گری، چند ہزار انسانوں کی ہلاکت، قلعہ جنگلی اور تورابورا کے چھوٹے موٹے واقعات، ملا عمر کی در بدری اور آپ جیسے حضرات کی چند روزہ قید سے پاکستان کا مقدر بدل گیا ہے تو آپ کو یقیناً خوش ہونا چاہئے۔

یہ جان کر ولی اطمینان ہوا کہ آپ خیریت سے ہیں۔ ہم سب بھی خیریت سے ہیں۔

محکم دلائل و براہین سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

نہیں آئی۔ البتہ دعا ہے کہ اللہ آپ کا ایمان سلامت رکھے۔ آپ کے لئے آسانیاں پیدا کرے اور آپ کو ہر مشکل خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! کیمپ کے سارے بھائیوں کو سلام

والسلام

آپ کا اسلامی بھائی“

[01-06-2002]

ادھر بھی کوئی ابر رحمت کا چھینٹا

کیا انقلاب آفرین دن ہے کہ جس نے زمانوں کے انداز بدل ڈالے۔ تہذیب انسانی کے قرینے تبدیل کر دیئے۔ انسانیت کی روشن قدروں کو یوں متعارف کرایا کہ اندھیروں کے بطن سے سورج، چاند، ستارے جنم لینے لگے۔ ازل سے ابد تک لامتناہی وسعتوں پر محیط ابر کرم، ہر زمانے کی تاریکیوں میں نیزے کی انی بن کر اترتی روشنی کی جادواں کرن، زمین پر ہاتھار گزرتی زبوں حال قوموں کے لئے عظمت و وقار کا سردی پیغام، انسانی فکر و عمل کی لازوال رفتوں کا امین، غنڈہ حال، شکستہ حال اور لاچار لوگوں کا ٹھکانا، خطا کاروں سے درگزر اور بداندیشوں کے دل میں گھر کرنے والا۔ وہ کہ جس کے نام کی برکتیں لازوال اور جس کے ذکر کی رفتیں بے کنار ہیں۔ لاکھوں درود اور کروڑوں سلام اس صاحب جلال و جمال پر کہ جس کا امتی ہونا، میرے آباؤ اجداد کا سرمایہ افتخار تھا، جو میرا توشہ آخرت ہے اور جو قیامت تک میری آنے والی نسلوں کا امامت سعادت رہے گا۔

12 ربیع الاول کا مبارک دن ڈھل رہا ہے۔ اہل پاکستان کے دل عشق رسول کی دائمی خوشبو سے مہک رہے ہیں اور عقیدت کی شفق سے ان کے چہرے گلزار ہوئے جا رہے ہیں۔ فضاؤں میں بکھری، نعتوں کی مشکبوگونج کیف و سرور کی لذتیں نکمیر رہی ہے..... لیکن میری آنکھیں شدت غم سے سلگ رہی ہیں۔ اگر میں شہر جاناں تک پہنچ پاتا تو روضہ اقدس کی دیواروں سے لپٹ کر اتنا روتا، اتنا روتا کہ میرا سارا بدن تحلیل ہو جاتا۔ میری خاک کوئے دلدار کی گلیوں میں بکھر جاتی۔ میں رحمت دو عالم ﷺ سے وہ سب کہتا جو صحرا کے بگولے کی طرح میرے سینے میں گھس گھیریاں ڈال رہا ہے اور جو کہتا چاہوں تو کہہ نہیں سکتا، لکھنا چاہوں تو لکھ نہیں سکتا۔ آگہی کا آشوب میرے اعصاب پر تھوڑے برسار رہا ہے۔ میری نسن نسن میں چنگاریاں سن بھر گئی ہیں۔ میری ہر سانس فخر کی طرح دل کو چھید رہی ہے..... اور مدینہ دور ہے!

میں ابھی تک افغانستان کے سادہ و معصوم شہیدوں کے دکھ سے سنبھل نہیں پایا۔ پھول جیسے

بچے خاک و خون میں نہا گئے۔ کتنی ہی عفت مآب بیٹیاں پت جھڑ کی رت کا خس و خاشاک ہو گئیں۔ گلابی گالوں اور شہابی آنکھوں والی کوہ قاف کی پریاں، امریکہ کے بازاروں میں نیلام ہو گئیں۔ لمبی عباؤں، بھاری پگڑیوں اور کھنی داڑھیوں والے اہل جنوں قلعہ جنگلی کے زندانوں اور تورابورا کے عاروں کا رزق بن گئے۔ ملا محمد عمر جیسا صاحب ایمان و یقین، نامعلوم پہاڑوں اور بے نام گھاٹیوں کی طرف دھکیل دیا گیا۔ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ یہ سب کچھ بھول جاؤں۔ کبھی شمالی اتحاد کی فرمانروائی کے بارے میں سوچتا ہوں، کبھی حامد کرزی کے دلکش تصور سے دل بہلاتا ہوں۔ کبھی کابل میں کھل جانے والے میکدوں کا خیال کرتا ہوں۔ کبھی موسیقی کی تانوں کا تصور کرتا ہوں۔ لیکن دل ہے کہ بہلتا نہیں۔ کبھی لاٹھی ٹیکتا ملا حسن رحمانی سامنے آکھڑا ہوتا ہے، کبھی قندھار کا وجہہ تکفیل مرد درجی، کندھے پر کالی چادر ڈالے پاس سے گزر جاتا ہے۔ کبھی ایک غریب و سادہ سی قبر سے نعتی کے زمزمے پھونکنے لگتے ہیں۔ کبھی احمد شاہ بابا کے مزار کے پہلو میں بنی پر شکوہ عمارت میں رکھے تین جستی صندوقوں کا خیال بے کل کر دیتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں طالبان کی رگ گلو پر خنجر چلا رہا ہوں، میرے ہاتھ کہنیوں تک لہو سے لتھڑ گئے ہیں اور میں چیخ روکنے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیتا ہوں لیکن سسکیاں رکنے میں نہیں آتیں۔

پھر مجھے بوسنیا کا خیال آتا ہے جہاں چشم فلک نے بربریت کو عریاں حالت میں دیکھا۔ مجھے مانسہرہ کی ہری بھری شاداب ڈھلوانوں کے آس پاس پھیلے، گورے چنے، گلابوں کی طرح دہکتے چہرے یاد آجاتے ہیں جنہیں میں نے کئی سال پہلے دیکھا تھا۔ مجھے فلسطین کے آتش بجانوں کا خیال آتا ہے جو اسرائیل کی ریاستی دہشت گردی کا بیدہن بن گئے۔ مجھے جنین کے مہاجریمپ کا خیال آتا ہے جہاں ”اسن کے سفیر“ نے ایک بار پھر صابروہ اور شتیلہ کی انسانیت سوز تاریخ دہرائی ہے۔ مجھے امام شاملؒ کی سرزمین شیشان (چوچینا) کی یاد آتی ہے جو روس کے پینچا استبداد میں جکڑی سک رہی ہے۔ میں یہ سب کچھ بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن دل کی دھڑکنیں قابو میں نہیں آتیں۔ میں ڈھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا ہوں لیکن تماشا بن جانے کے خوف سے ڈر جاتا ہوں۔ بے چارگی اور بے بسی زہریلے ناگ کی طرح ڈسنے لگی ہے اور..... مدینہ بہت دور ہے!

اب مجھے بتایا جا رہا ہے کہ پاکستان نے اپنی سرزمین ہر قسم کی دہشت گردی کے لئے بند کر دی ہے۔ کشمیر کمیٹی کے چیئرمین، مجاہد اول سردار محمد عبدالقوم خان ”جہاد اصغر“ کے دنوں میں آزاد کشمیر کو

تحریک حریت کا میں کیپ کہا کرتے تھے۔ اب خبر آئی ہے کہ یہ بیس کیپ ”جہاد اکبر“ کی نذر ہو گیا ہے اور طے پایا ہے کہ وہاں سے بھی حریت کی کوئی لٹاکر نہیں اٹھے گی۔ کولن پاؤل کے فون تھمنے میں نہیں آرہے۔ برطانوی وزیر خارجہ جیک سٹرا کہتا ہے کہ ”پاکستان کو دہشت گردی بند کرنا ہو گی۔“ جاپان کا وزیر اعظم ہیکو سندیہ دیتا ہے۔ یورپی یونین کا کمشنر برائے امور خارجہ ”کرس ٹین“ کہتا ہے کہ ”پاکستان کچھ کرے ورنہ بھارت کا پیمانہ صبر لبریز ہونے کو ہے۔“ کوئی عنان کہتا ہے ”تمہارا حطل گیا لیکن پہلے دہشت گردی بند کرو اور 12 جنوری کی تقریر کو عملی جامہ پہناؤ۔“ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا نائب ترجمان ”فلپ ریکر“ کہتا ہے ”بھارت کا غم و غصہ بجا ہے۔ پاکستان ضروری اقدامات کرے۔“ امریکہ اور روس کے صدور مل کر آواز لگاتے ہیں ”ریاستی حمایت یافتہ دہشت گردی بند کی جائے۔“ واچپائی بتاتا ہے کہ ”جنگ کے بادل چھٹ گئے ہیں“ اور مجھے کچھ معلوم نہیں کہ موسم نے اچانک یہ کروٹ کیسے لی ہے۔

نہ جانے کیوں میرا دل اچھیل ڈل کے نیلگوں پانیوں میں غوطے کھا رہا ہے۔ 80 ہزار نورانی قبریں اور ان کے اوپر ہلے پھلکے لطیف بادلوں کی طرح اڑتی معصوم روہیں مجھے کچھ یاد دلا رہی ہیں۔ میں ندامت کے بوجھ سے ٹڈ حال آنکھیں چرا رہا ہوں لیکن ایک سیل ہے کہ کسی آن موج خون کی طرح میری آنکھوں سے رواں ہونے کو ہے۔

12 ربیع الاول کی دوپہر ڈھل رہی ہے۔ غلام و درود کی مخلصیں رات گئے تک جاری رہیں گی۔ میں گھر کے ایک کونے میں جھولی پھیلائے کھڑا ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسو روک رکھے ہیں کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ لیکن لاوا کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔
میں ڈھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا ہوں لیکن مدینہ دور ہے..... بہت دور ہے۔

www.KitaboSunnat.com

ادھر بھی کوئی ابر رحمت کا چھینٹا، ادھر بھی نظر بے سہاروں کے والی
دیکتے رہیں تیرے گنبد کے جلوے، سلامت رہے تیرے روضے کی جالی

پاکستان، کشمیر اور داخلی مسائل پر

عرفان صدیقی

کے کاموں کا نیا مجموعہ

دائرہ میں سفر

چھپ کر منظر عام پر آ گیا ہے

